TIGHT BINDING BOOK

نوجوان ورتھر کی داستان غم

جس میں مشہور جرمن فلسفی شاعر اور حکیم حیات

جان وولف گانگ گوئٹے

نے

شباب کی رومانی کیفیات کی نفسی تصویر پیش کی ہے

مترجمہ ریاض الحسن ایم - اے

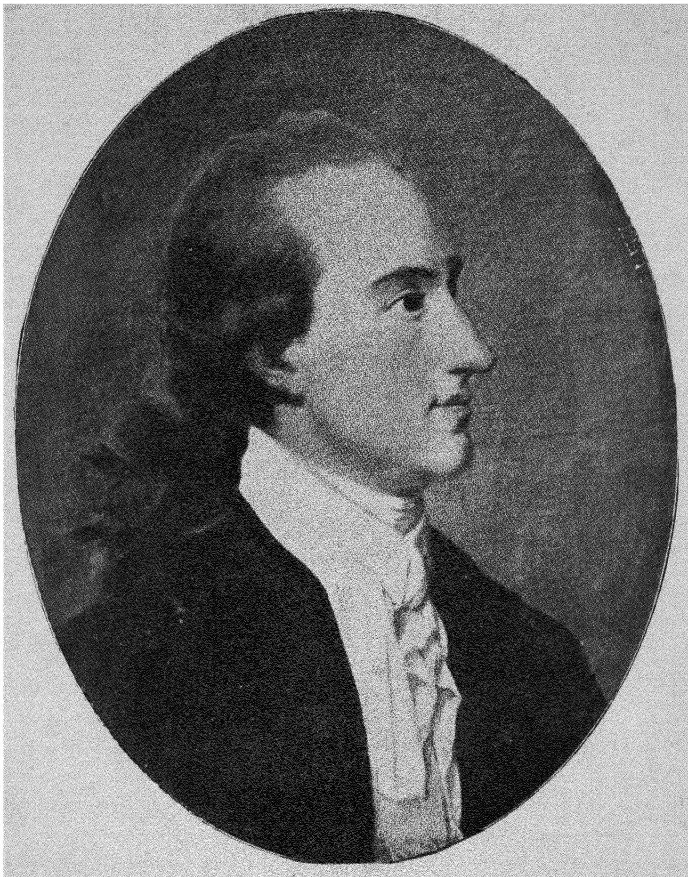
لٹریری سنڈیکیٹ (نمبر ا بیلی روڈ) الہ آباد

۱۹۳۳ء

قیمت عہ

جامعہ الٰہ آباد میں اپنی اول دو سال (سنہ ۱۹۲۸-۳۰ء) کی طالبعلمانہ زندگی کی یاد میں، یہ ترجمہ میں اپنے مہربان و محترم اُستاذ پنڈت امرناتھ جھا ایم۔اے صدر شعبہ انگریزی، یونیورسٹی الہ آباد کے نام سے منسوب کرتا ہوں جنکے عالمانہ اور تخیل کو چھیڑنے والے لکچروں نے میرے شوق ادب کی کافی نشوونما کی۔

ریاض الحسن



گوئٹے

اپنی عمر کی انتیسویں منزل میں

ابتدائیہ

جرمنی کا مشہور فلسفی شاعر گوئٹے دنیائے ادب کی ان چند ممتاز ہستیوں میں سے گذرا ہے جنہوں نے قلم سے تلوار کا کام لیا اور زمانہ کے بہتے ہوئے تیز دھارے سے تمدن انسانی کے باغ کو سینچکر سر سبز و شاداب کیا۔ ہر زمانہ میں یہ کام جتنا عظیم الشان رہا ہے اتنا ہی مشکل، اس لئے ضرورت ہے کہ کوئی شخص اپنی زندگی کو محض اسی کام کی خاطر نمونہ بنائے۔ گوئٹے نے یہ نمونہ اپنی زندگی کی شکل میں پیش کیا اور یہی اسکا سب سے بڑا کارنامہ ہے اس میں عقل و دل کی تمام خصوصیتیں مناسب انداز میں جمع ہو کر ایک ایسا معجون مرکب تیار کرتی ہیں جو "مکمل" انسانیت کا طرۂ امتیاز ہے۔

تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم کو دنیا کی بڑی بڑی ہستیاں کئی گروہوں میں منقسم نظر آتی ہیں۔ ایک تو وہ گروہ ہے جس نے گیان کی خاطر تن من دھن سب تیاگ دیا اور ویرانوں میں بیٹھکر صرف گیان کی تلاش میں مصروف رہا۔ دوسرا گروہ اُن لوگوں کا ہے جو دنیا کی سماجی زندگی میں شریک تو ہوئے مگر اُنھوں نے دنیا کو محض قاعدہ قانون کا ایک خشک نظام سمجھا اور ہر چیز کو عقل کے پیمانہ سے ناپنے کی کوشش کی گویا دنیا کی تمام چیزیں ایک ہی عالمگیر قانون کے ماتحت ہیں ان کے مذہب میں سونے چاندی اور عشق و محبت کے لئے بس ایک ہی ترازو ہے۔ پہلا گروہ اہل دل کا ہے اور دوسرا اہل عقل کا اور ان دونوں میں جو پیکار جاری ہے وہ دونوں کی کوتاہ بینی کا بین ثبوت ہے۔ عقل و دل حیات انسانی کے دو مختلف جوہر ہیں مگر متخالف و متبائن نہیں۔ ان میں ہم آہنگی پیدا کرکے انسانی مشکلات کو حل کرنا ان عظیم الشان ہستیوں کا کام رہا ہے جو پیغمبرانہ حیثیت سے حیات انسانی کے منتشر شیرازہ کو ایک نقطہ پر جمع کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً نمودار ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے گوئٹے اپنے عہد کا پیغمبر تھا اور اسکا شمار بھی اِسی موخرالذکر گروہ میں ہے کیونکہ انسانی زندگی میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی جو مثال اُس نے خود اپنی زندگی سے دی اُس سے قرون وسطیٰ سے لیکر موجودہ دور تک کی تاریخ بالکل خالی ہے۔ اُس میں تخیل کی رنگینی کے ساتھ عقل، جوش و خروش کے ساتھ سکون، اور عشق کی بیقراری اور وارفتگی کے ساتھ بے پروائی اور رمیدگی کا توازن اس مناسبت کے ساتھ تھا کہ اُس کی روحانی زندگی ہمیشہ خارجی دنیا سے ہم آہنگ رہی۔ اس کا دل عجائبات عالم کے ہر ذرہ کا رازدار بننے کا آرزومند تھا۔ وہ دنیائے اعتبار و حقیقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر دیکھنے کے ساتھ ساتھ فلک الافلاک کی سیر کا بھی متمنی تھا۔ فطرت نے اُس کی ہمہ گیر طبیعت میں وہ شوق پیدا کیا تھا کہ وہ ہر اُس چیز سے دلچسپی لیتا جس سے

انسان کا دل متاثر ہو سکتا ہے گویا وہ سارے نظام فطرت کو سمیٹ کر اپنے دل کی گہرائی میں چھپا لینے کا خواہشمند تھا اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ انسانیت کی تمام کمزوریوں کے باوجود انسان کے لئے ایک نمونہ تھا نپولین تو اُسے دیکھ کر پہلی ہی ملاقات میں پکار اُٹھا کہ "بیشک۔ یہ ایک انسان ہے" اس ہم آہنگی کی ایک وجہ بھی تھی یعنی اُس کے سینہ میں دو روحیں تھیں "ایک تو شاعر کی حسن پرست، عشق پرور، شورش انگیز ہنگامہ خیز روح اور دوسرے حکیم کی عرفان جو، حق پسند، سکوں طلب، نظم آفریں روح"۔ اسی کو وہ ایک جگہ فاؤسٹ کی زبان سے ادا کرتا ہے:۔

"میرے سینہ میں دو روحیں ہیں اور ان دونوں میں بڑی کشمکش ہے۔ دونوں ایک دوسرے پر غلبہ پانے اور ایک دوسرے کے پنجہ سے آزاد ہونے کی جنگ میں مصروف ہیں۔ ایک نے جسمانی لذتوں کے شوق میں دنیا دی کثافتوں پر اپنا بدصورت جال پھیلا رکھا ہے اور دوسری اپنی جبلی طاقت کے زور سے اُڑ کر آسمانوں کی طرف جانا چاہتی ہے جو اسکا پیدائشی اور آبائی مسکن ہے"۔

ان دو روحوں کی کشمکش سے جو توازن پیدا ہو گیا تھا وہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے اور یہی انسانیت کا وہ اعلیٰ جوہر ہے جو گوئٹے کو دوسری نامور ہستیوں کے مقابلہ میں زیادہ ممتاز کرتا ہے۔

جان وولف گانگ گوئٹے ۲۸ اگست ۱۷۴۹ء کو بوقت دوپہر دریائے ماین کے کنارے والے شہر فرینکفورٹ میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ جان کاسپر گوئٹے وکیل تھا۔ اطالیہ اور فرانس کے سفر نے اس میں ادب اور فنون لطیفہ کا اچھا خاصا مذاق پیدا کر دیا تھا۔ سفر کے دو تین سال بعد شاہ چارلس ہفتم نے اُس کو شاہی مشیر کے عہدہ پر مقرر کیا جس سے اس کی عزت لوگوں کی نظروں میں بہت بڑھ گئی اور اُسکا شمار شہر کے بڑے لوگوں میں ہونے لگا تھوڑے دنوں کے بعد اُس نے چیف مجسٹریٹ کی لڑکی سے شادی کی اور تقریباً ایک سال کے بعد جان وولف گانگ گوئٹے پیدا ہوا۔ اُس نے اپنے باپ سے غور و فکر، سکون و خاموشی، نظام و ترتیب، ٹھنڈے مزاجی، حقیقت کوشی کا مادہ ورثہ میں پایا لیکن ماں کی طرف سے اُس کو جو چیز ملی اُس نے اُس کی شاعرانہ زندگی میں چار چاند لگا دئے یعنی تخیل، جذبات کی فراوانی، رومانی جوش و خروش کے ساتھ زندگی کے عمدہ اور خوش آیند مناظر کو دیکھنے کی سرشت، ہم اُسکی زندگی کو تین دور میں تقسیم کریں گے اور علیحدہ علیحدہ سب کا حال بیان کریں گے ہم نے پہلا دور اُسکی پیدائش سے لے کر دائمر کی روانگی تک قائم کیا ہے کیونکہ دائمر کے قیام سے اس کے خیالات میں تبدیلی شروع ہو جاتی ہے۔

گوئٹے کی ابتدائی تربیت میں زیادہ حصہ اُس کی ماں کا رہا جو اطالوی زبان کے علاوہ موسیقی اور نغمہ

سے کافی طور پر واقف تھی۔ گوئٹے جب کچھ بڑا ہوا تو باپ نے پڑھنے لکھنے کے لئے بجائے کسی مدرسہ میں بھیجنے کے خود گھر پر مکتب کا انتظام کیا اور اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا کہ یورپ کی قدیم و جدید زبانوں کے ساتھ ساتھ بچہ کو سائنس و مذہب، تاریخ و جغرافیہ، فنون لطیفہ، شہسواری و سپہگری کی تعلیم دیجائے۔ چنانچہ گوئٹے نے لاطینی۔ یونانی۔ فرانسیسی، اطالوی اور انگریزی پڑھی بعد کو عبرانی کا بھی اضافہ ہوا۔ خود جرمن زبان کی مشق مضمون لکھتے لکھتے بڑھی۔ جرمن زبان کی تحصیل اس زمانہ میں باقاعدہ نہیں ہوتی تھی۔ عوام میں جو گیت رائج تھے ان کو اُس نے دلچسپی سے پڑھا۔ مذہبی تعلیم کا دارومدار زیادہ تر انجیل پڑھنے پڑھانے پر تھا۔ گوئٹے نے انجیل پڑھ کر اپنی روحانی زندگی کو اونچی سے اونچی بلندی پر لیجانے کی داغ بیل ڈالی، مگر اُس کی تعلیم کا جو اہم جزو تھا وہ خود اسکا گھر تھا۔ اس کے باپ نے اطالیہ کے سفر میں بہت سے پرانے پرانے مشہور مصوروں کی تصویریں دیکھی تھیں اور بہت سے عجائبات اور تصویروں کا ایک کثیر ذخیرہ اپنے ساتھ بھی لایا تھا۔ اس پر قدیم رومی تمدن کا اثر اتنا تھا کہ اُس نے اپنے مکان کے بڑے کمرہ میں دیواروں پر روما کے مختلف محلوں، مکانوں اور سڑکوں کا نقشہ بنوایا تھا اور بہت سی تصویریں بھی ٹانگ رکھی تھیں۔ بچپن میں گوئٹے ان تصویروں کو دیکھتا اور ان سے لطف اُٹھاتا تا۔ ساتھ ہی اُس کے باپ کا ایک چھوٹا سا کتب خانہ بھی تھا جس میں تاریخ و فلسفہ کے علاوہ لاطینی، اطالوی اور المانی شعراء کے کلام موجود تھے۔ گوئٹے کبھی کبھی ان الماریوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتا اور ان کتابوں کو پڑھتا جس سے اُس کے دماغ پر شروع ہی سے کلاسیکی اثر جڑ پکڑتا گیا انھیں اثرات میں گوئٹے کا بچپن نہایت پرلطف طریقہ سے گذرا۔ افلاس و غربت کے اس ناگوار اور خاردار راستہ سے جس سے بڑے بڑے لوگوں کو بیشتر گذرنا پڑا ہے گوئٹے کو مطلق سابقہ نہیں پڑا گویا زندگی کا یہ میدان کھیلتے کودتے عیش و آرام کی حالت میں کٹ گیا۔ لیکن اُس زمانہ میں اُس کو اکثر شکوک کا سامنا کرنا پڑا ۱۷۵۵ء میں پرتگال کے ہولناک زلزلہ سے اس کے ذوق جستجو نے اُس کے دل میں یہ شک پیدا کیا کہ اگر خدا باپ کی طرح شفیق ہے تو اپنے نیک بندوں کو کیوں اسطرح تباہ کرتا ہے؟ اس قسم کے شکوک اُسکو ہمیشہ پریشان کرتے رہے اور یہی وجہ ہے کہ اُس نے آگے چلکر خدا اور مذہب کے متعلق اپنی باطنی تسکین کے لئے ایک نئی راہ نکال لی۔

اسی کے تھوڑے دنوں بعد وہ واقعہ پیش آیا جس سے گوئٹے کے طالب علمانہ شوق پر کافی اثر پڑا یعنی ہفت سالہ جنگ چھڑنے کے بعد ۱۷۵۹ء میں فرانسیسیوں نے فرینکفورٹ پر قبضہ کرلیا اور کم و بیش تین سال تک اس پر قابض رہے۔ فرانسیسی فوج کا افسر کاؤنٹ تھورینگ گوئٹے کے گھر مہمان رہا

کاسپر گوئٹے نے مجبوراً اُس کے لئے اپنے مکان کا ایک حصہ خالی کر دیا اور ظاہراً بڑی تعظیم و تکریم کے ساتھ اپنے یہاں اُتارا۔ کاؤنٹ کو فنون لطیفہ سے دلچسپی تھی اور اُس نے جب سنا کہ اُس مکان میں ایک تصویر خانہ بھی ہے تو اُس کے دیکھنے کا شوق ظاہر کیا اور ساتھ ہی اُن اصحاب فن سے ملنے کی بھی خواہش کی جو مصوری میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اُن سے ملکر اُس نے تصویریں بنوانی شروع کیں۔ گوئٹے ان تصویروں کو دیکھتا اور کاؤنٹ سے اُن کے متعلق پوچھتا۔ کاؤنٹ بھی لڑکے کی ذہانت سے متاثر ہوکر اُس سے محبت کرنے لگا اور فنون لطیفہ کے نکات سمجھاتا جس سے گوئٹے کو اس فن کا ایسا شوق ہوا کہ تادم مرگ نہ گیا۔

فرانسیسی آئے تو اپنی تہذیب کا ایک بڑا بازو یعنی ایک تھیٹر بھی ساتھ لائے۔ گوئٹے نے اپنے نانا سے ایک مستقل پاس حاصل کر لیا اور اپنے باپ کی مرضی کے خلاف تھیٹر دیکھنے جاتا۔ یہاں وہ عمدہ سے عمدہ فرانسیسی ڈرامے دیکھتا اوّل اوّل تو اُس کے سمجھ میں بہت کم آتا مگر رفتہ رفتہ اُس نے تھیٹر کے ایکٹروں، پہرہ داروں اور سپاہیوں سے بات چیت کر کے اتنی استعداد بڑھالی کہ بعد کو وہ سب کچھ سمجھتا۔ اُس کو زبان سیکھنے کا خاص ملکہ قدرت نے عطا کیا تھا مگر کتاب و قواعد سے زیادہ وہ بولنے والوں سے زبان سیکھتا ڈرامہ دیکھنے کا شوق اس حد تک بڑھا کہ اُس نے بعد کو فرانس کے مشہور ڈرامانگاروں کی تصنیفات کا مطالعہ کیا۔ تھیٹر دیکھتے دیکھتے اُس کے دل میں ایک ڈرامہ لکھنے کا شوق ہوا اور لکھ بھی ڈالا اور اپنے ایک ہم عمر دوست کو دکھایا بھی مگر اُس نے ناپسند کیا۔ اس سے گوئٹے کے دل کو تسلی نہ ہوئی۔ اب اُس کو ڈراما کے اصول کی فکر ہوئی اور اس غرض سے اُسنے فرانس کے ڈرامہ نگاروں کا بحیثیت صاحبان فن کے مطالعہ کیا اور اُن کے نظریہ وحدت[1] کو خوب دیکھا بھالا۔

۱۷۶۴ء میں شاہ جوسف ولیم کی بحیثیت شہنشاہ جرمنی رسم تخت نشینی فرینکفورٹ میں منائی گئی جرمنی کے مختلف شہروں سے شاہزادے امیرزادے۔ تماشہ بین۔ مداری، دوکاندار غرض رنگ برنگ کے لوگ جلوس دیکھنے آئے۔ دو ہفتہ تک فرینکفورٹ جلوس کی خوشیاں مناتا رہا۔ چیف مجسٹریٹ کا نواسا ہونے کی وجہ سے گوئٹے کو ہر طرح کی رنگ رلیاں دیکھنے کا موقع ملا اور اس تماشہ میں جیسا کہ اکثر تماشوں کا قاعدہ ہے کہ بہت سے اجنبی دوست بنجاتے ہیں گوئٹے کی بہت سے اجنبیوں سے ملاقات ہوئی اور اُن سے دوستی ہوگئی۔ اس جلوس کا حال اور دوستوں کی لطف کی ملاقاتوں کا ذکر اُس نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں بہت مزے لے لیکر لکھا ہے۔ انہیں دوستوں میں اسکا ایک ہم سن مسمی پائیلیڈس تھا۔

---

[1] اس سے مراد یہ ہے کہ ایک ہی وقت ایک ہی جگہ کے واقعات اسطرح دکھائے جائیں کہ زمان و مکان و کردار کا تسلسل نہ ٹوٹنے پائے۔ یونانی عموماً اپنے ڈراموں میں ۲۴ گھنٹے کے واقعات دکھاتے تھے۔

ایک رات کو پانیلیڈس کے کسی دوست کے مکان پر احباب کا مجمع تھا جس میں گوئٹے بھی شریک تھا وہاں ایک حسین لڑکی گریٹشن کو دیکھ کر اول اول گوئٹے کے دل میں عشق کا ایسا شعلہ بھڑکا جس کی گرمی تازیست قائم رہی۔ گریٹشن گوئٹے سے عمر میں بڑی تھی مگر پہلی ہی ملاقات میں وہ گریٹشن کو دل دے بیٹھا اور اُس کے عشق نے یہاں تک طول پکڑا کہ گریٹشن کے بغیر اُس کا کہیں جی نہ لگتا۔ اُس کے ساتھ وہ شہر کے باہر باغوں کی سیر کرتا، چاندنی راتوں میں گلگشت کرتا گوئٹے کا دل محبت کی آگ سے جل رہا تھا اور جو کچھ پگھل کر نکلتا اُس کو وہ صفحہ کاغذ پر بچھا دیتا۔ گریٹشن اسکی عشقیہ نظمیں سنتی اور نوجوان شاعر کی تحسین و آفریں کرتی وہ گوئٹے سے ہر قسم کی آزادی کا برتاؤ کرتی مگر گوئٹے کو آزادی نہ دیتی۔ غرض تخت نشینی کے میلوں ٹھیلوں کے درمیان یہ راز و نیاز کی مجلسیں اسی طرح گرم رہیں کہ یکایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے گوئٹے کو سخت روحانی اذیت ہوئی اور جس کے بعد پھر گریٹشن سے ملاقات کی دوبارہ نوبت نہیں آئی۔

گریٹشن نے اپنے ایک دوست کے لئے گوئٹے سے کہا کہ وہ اپنے نانا سے کسی ملازمت کے لئے اسکی سفارش کردے۔ گوئٹے کی سفارش پر وہ شخص نوکر ہو گیا مگر یہ شخص بڑا عیار اور چالاک تھا۔ نوکر ہوتے ہی اُس نے جعلی دستاویزات اور سرکاری نوٹ بنانا شروع کئے اور بہت سے وصیت ناموں میں رد و بدل کیا جب حکام کو اس معاملہ کی خبر ہوئی تو اُس کی باقاعدہ تحقیقات شروع ہوئی۔ تخت نشینی کی رسم ختم ہونے کے دوسرے روز صبح کو گوئٹے کی ماں اُس کے کمرہ میں دوڑی آئی اور کہنے لگی "گوئٹے یہ تم نے کیا کیا۔ تم نے جس کی سفارش کی تھی اُس پر مقدمہ چل رہا ہے اور اس کارروائی میں تم بھی شامل ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس طرف تم خراب لوگوں کی صحبت میں پڑ گئے تھے۔ تمہارے ابا جان بہت برہم ہیں" یہ سن کر گوئٹے کے ہوش اُڑ گئے ادھر گریٹشن پر بھی شبہ جاتا تھا اس لئے کہ اُس کا اور گوئٹے کا اس معاملہ میں گہرا تعلق تھا۔ بہرحال تحقیقات ہوئی اور گریٹشن اور پائیلیڈس معمولی تنبیہ کے بعد بری کر دیئے گئے۔ اس سلسلہ میں گریٹشن نے جو بیان دیا اس سے گوئٹے کے حساس دل کو سخت صدمہ پہونچا۔ گریٹشن نے عدالت میں بیان دیتے ہوئے کہا کہ میں گوئٹے کو محض ایک بچہ سمجھتی تھی اور اُس کی ساری حرکتوں کو بچپن کی شرارتوں میں شمار کرتی تھی۔ گوئٹے نے جب اپنے متعلق یہ بیان گریٹشن کی زبانی سنا تو اُس کا سارا جوش سرد ہو گیا اور گریٹشن کے فراق میں اُسکی ساری آہ و زاری بند ہو گئی۔ ہاں گریٹشن کے عشق کا اتنا اثر تو ضرور ہوا کہ گوئٹے کو زیست کا مزہ ملنے لگا اس واقعہ سے گوئٹے کی طبیعت گو مائل بہ سکون ہو گئی تھی مگر رہ رہ کر کبھی نہ کبھی ایک درد ضرور اُٹھتا۔ اس کے دفعیہ کے لئے اُس نے ایک ترکیب سوچی یعنی ذہن کو عملی طور پر کسی دوسری طرف لگایا جائے۔ اسی

الف ۲۰

عرصہ میں اُس کے ایک پڑوسی نے جو جینا کی یونیورسٹی میں فلسفہ کی تعلیم حاصل کر چکا تھا فلسفہ کی طرف اُس کی توجہ دلانی شروع کی۔ گوئٹے کو فلسفہ سے دلچسپی ہو گئی اور اُس نے فلسفیوں کی چند تصنیفات کا مطالعہ بھی کیا۔ ارسطو اور افلاطون تو اُس کو بالکل پسند نہ آئے البتہ رواقیین سے دلچسپی ہو گئی مگر فلسفہ پڑھ کر اُس کو خشک فلسفیانہ نظریات سے تکلیف سی ہونے لگی اور اس باب میں وہ اپنے دوست سے بحثیں کرتا اور اختلاف کرتا مگر بحث مباحثہ سے اُس کی روحانی تسکین نہ ہوتی۔ وہ فلسفہ کو شاعری اور مذہب سے علیحدہ کوئی چیز نہیں سمجھتا بلکہ ان تینوں کو ایک ہی کل کا جزو سمجھتا اس لئے اُس کو وہی کتابیں اچھی معلوم ہوتیں جس میں یہ تینوں چیزیں شامل ہوتیں۔ فلسفہ کے الجھاؤ میں پڑ کر اس کی طبیعت غور و فکر کی عادی ضرور ہو گئی اور وہ کبھی تنہا اور کبھی اپنے دوست کے ہمراہ پاس کے جنگلوں میں چلا جاتا اور وہاں بیٹھ کر مناظر قدرت کی دلفریبیوں کو دیکھتا اور اُن پر غور کرتا اور اکثر اُن کی تصویر اُتارنے کی کوشش کرتا۔ گو تصویر عمدہ نہ ہوتی مگر اس سے اتنا تو ہوا کہ اُس کے مشاہدہ میں ترقی ہو گئی اور وہ ہر چیز کو اسکے اثر اور کل کی حیثیت سے دیکھتا۔ گریٹشن کی جدائی کا غم غلط کرنے کا یہی بہترین طریقہ تھا جس پر اُسنے عمل کیا۔

اس طرح سولہ سترہ برس کی عمر میں گوئٹے نے بہت وسیع پیمانہ کی تعلیم حاصل کر لی۔ وہ یورپ کی بہت سی قدیم و جدید زبانیں جاننے کے علاوہ اُن کے ملکوں کی تاریخ سے بھی واقف ہو گیا۔ اور جرمنی کی سیاسی اور قانونی تاریخ کے تو ذرا ذرا سے جزیہ پر اسکی نظر تھی۔ سائنس میں گو اُس کی تعلیم معمولی تھی اور باقاعدہ نہ تھی مگر خود اپنی دقت نظر کی وجہ سے اس شعبہ علم میں بھی اُس کو کافی دلچسپی ہو گئی اور اس سلسلہ میں وہ بہت سے تجربات کرتا رہا۔ ان علوم کے علاوہ موسیقی میں اُس نے وہ کمال حاصل کیا کہ اُس زمانہ کے ایک صاحب فن نے اُس کے باپ سے کہا کہ مجھے افسوس معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنے لڑکے کی اتنی خداداد اہلیت کے باوجود اس کو موسیقی کے پیشہ میں بھیجنے کا ارادہ نہیں رکھتے بہرحال گوئٹے کو ہر نئی چیز سیکھنے کا شوق تھا اور اس شوق کی کیفیت جب تک قائم رہتی وہ کام بھی جاری رہتا۔ اُسکے بعد پھر اُسکا خیال بھی نہ رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کی تصانیف میں بہت سی چیزیں ادھوری ہیں لیکن علوم کے ساتھ ساتھ وہ کتاب زندگی کے اوراق بھی الٹتا رہا جو اسے خشک اور نظری علوم کے مقابلہ میں زیادہ دل پسند اور حقیقت آشنا معلوم ہوتے تھے اتنی کم عمری میں وہ عشق کی ناہموار اور دشوار گذار گھاٹیوں سے بھی کسی حد تک واقف ہو گیا اور اسکی بدولت مختلف قسم کے آدمیوں سے ملنے ملانے اور انکی طبیعتوں کا اندازہ کرنے کا بھی گر ہاتھ آ گیا غرضکہ مختلف نقطۂ نظر سے زندگی کا مطالعہ اُسکی سیرت کی تشکیل میں بہت

معاون ہوا اور اُس کی سمجھ بوجھ میں اس کم عمری ہی میں خاصا اضافہ ہوا۔
باپ کا خیال تھا کہ قابل لڑکے کو وکیل بنائے اور وکالت کی تعلیم کے لئے لائپزگ، ویزلر، راٹس بون اور ویئنا بھیجے۔ گوئٹے باپ کے ارادوں اور اپنے تعلیمی سفر کے شہروں کا نام سنتا اور خاموش ہو رہتا کیونکہ اسکی طبیعت کچھ اور ہی کہہ رہی تھی۔ وہ شاعر کا گداز دل لے کر آیا تھا جس میں قضا و قدر کے رازدار بننے کی آرزو تھی۔ وہ اس جلوہ گاہ نظر فریب کو شاعری کی عینک سے دیکھتا اور اس میدان کا مرد بنکر اپنی ترکتازیوں سے سوتے ہوؤں کو جگانے کی خواہش رکھتا۔ بچپن ہی سے اُس کو شاعری کا چسکا پڑ چکا تھا۔ اول اول اُس نے آٹھ سال کی عمر میں شعر کہا تھا۔ پھر اُس کی طبیعت میں اس بلا کی روانی تھی کہ اُس کے احباب فرمائش کرتے اور وہ فوراً شعر لکھ دیتا۔ اپنی طبیعت کی افتاد کے متعلق ایک دوست کو خط میں لکھتا ہے:۔
"میری طبیعت کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ مجھ میں جوش و خروش بہت ہے۔ تم ایک تندمزاج آدمی کی کیفیت سے واقف ہی ہو گے مگر ایک بات اور بھی ہے یعنی میں اپنی بے عزتی کو جس طرح پی جاتا ہوں کم لوگ ایسا کرتے ہوں گے۔ مجھ میں قاعدہ قانون بنانے کی بھی عادت ہے لیکن جب میں کچھ نہیں کر سکتا تو میں خاموش رہتا ہوں۔۔ میرے خط کی ابتدا سے تم میری تیسری کمزوری بھی سمجھ گئے ہو گے یعنی میں تم کو اس بے تکلفی سے خط لکھ رہا ہوں جیسے تم میرے پرانے لنگوٹیا یار ہو۔ پھر تم مجھ میں سیماب وشی کی کیفیت دیکھتے ہو گے اور یہ بھی دیکھتے ہو گے کہ میں شک سے کتنا بھاگتا ہوں" اس کم عمری میں اُس نے اپنی جو نفسی تصویر کھینچی ہے اُس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ پودا کسی دن بڑھکر پورا تناور درخت ہو گا۔ ۱۷۶۳ء میں جب اُس کی عمر چودہ برس کی تھی اُس نے اپنے باپ کے سامنے اپنا کلام بشکل تقطیع کے ۵۰۰ صفحات پر لکھ کر پیش کیا۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اسطرح کا غیر معمولی دل و دماغ لے کر آیا ہو اُسکا قانون میں کیا جی لگے گا لیکن شاعر بنکر روٹی کمانا ذرا مشکل تھا اسلئے اُس نے کسی یونیورسٹی میں پروفیسری حاصل کرنے کا خیال دل میں باندھا کیونکہ اُس ملازمت سے انسان اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ دوسروں کی تعلیم میں بھی مدد دے سکتا ہے۔ اس خیال کو لیکر وہ تاریخ، انطیقات اور قدیم زبانوں کے مطالعہ میں مصروف ہو گیا اور گوٹنگن کی یونیورسٹی میں جہاں ہینے اور مائیکلس ایسے نامور پروفیسران تھے داخلہ کی اُمیدیں کرنے لگا مگر باپ کے سامنے ایک بھی پیش نہ گئی جو برابر لائپزگ بھیجنے پر اڑا رہا۔ بالآخر بادست دیگرے دست بدست دیگرے اسکو لائپزگ کا عزم کرنا پڑا اور ستمبر ۱۷۶۵ء میں وہ لائپزگ روانہ ہو گیا۔
گوئٹے لائپزگ میں داخل ہوا تو وہی اپنے شہر کا لباس پہنے ہوئے تھا اور وہیں کی زبان بولتا تھا۔ لائپزگ

کے مقابلہ میں فرینکفورٹ زبان اور وضع قطع کے لحاظ سے دیہات سمجھا جاتا تھا حالانکہ آبادی اور تجارت کے لحاظ سے فرینکفورٹ کہیں بڑا تھا۔ لائپزگ کے بانکے ترچھے نوجوانوں نے گوئٹے پر آوازے کسنے شروع کئے۔ کوئی اُس کے لباس کا مذاق اُڑاتا کوئی اُس کی بولی پر بولیاں بولتا۔ مگر اُس نے ان چیزوں کی مطلق پروا نہیں کی۔ بہرحال جب اُس کی طبیعت نے خود کہا تو اپنے چند خواتین دوستوں کے اشارہ سے اُس نے یکبارگی اپنی ساری پوشاک بدل ڈالی اور لائپزگ کا فیشن پرست نوجوان بن گیا اس سرعت انگیز تغیر پر اس کے بعض دوستوں کو بڑی حیرت بھی ہوئی۔

یونیورسٹی میں داخل ہو کر وہ پہلے پروفیسر ہو فراٹ بوہیمے سے ملا جو تاریخ اور قانون کے پروفیسر تھے۔ اُن سے ایک روز باتوں باتوں میں کہہ دیا کہ میرا ارادہ قانون کے بجائے ادب پڑھنے کا ہے۔ پروفیسر موصوف نے اس خیال کی سخت مخالفت کی لیکن آخر کار اُن کی بیوی کے سمجھانے سے وہ قانون کے لکچروں میں شامل ہونے لگا۔ لیکن اس کے علاوہ وہ فلسفہ و ادب کے بھی لکچروں میں بھی شرکت کرتا۔ گو وہ یونیورسٹی کا باقاعدہ طالبعلم ہو گیا تھا مگر اُس کی دل کی لگی کچھ اور ہی کہہ رہی تھی۔ اوّل اوّل تو اُسکو اپنے قانون و فلسفہ کے لکچروں میں بڑی دلچسپی رہی مگر بعد کو اُس کی طبیعت اُکتا گئی اور منطقیانہ بحثوں سے اسکو تکلیف ہونے لگی۔ منطق کا اصول یہ ہے کہ ہر کل کو جزو میں تقسیم کر کے تب اُس پر بحث کیجاتی ہے اور گوئٹے کی طبیعت ہر جزو کو کل کی مناسبت سے دیکھنے کی خوگر ہو چکی تھی اس لئے کائنات و خالق کائنات کے متعلق جو عقیدہ لے کر آیا تھا اُس میں کچھ ترمیم نہ ہو سکی بلکہ اُس کے دل میں یہی خیال آتا کہ میں یہاں کے معلموں کی بہ نسبت زیادہ معلومات رکھتا ہوں۔

لائپزگ میں کچھ دنوں رہنے کے بعد بہت سے خاندانوں میں اس کی رسائی ہو گئی تھی۔ گوئٹے وہاں جاتا اور اسکا وقت کافی لطف کے ساتھ کٹتا۔ خرچ کے لئے گھر سے کافی روپیہ آتا اور وہ اللے تللے خرچ کرتا۔ ایک خط میں لکھتا ہے کہ "سوسائٹی میں، رقصوں میں، تھیٹروں میں، دعوتوں اور تفریح گاہوں میں وقت ہوا کی طرح اُڑا چلا جاتا ہے۔ بڑے ٹھاٹھ سے وقت گذرتا ہے گو خرچ بھی کافی ہوتا ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ میری جیب کیسے برداشت کرتی ہے۔ ابھی ایک لوئس خرچ ہوا پھر دوسرا اور تیسرا۔ آنے کا حساب بالکل پائیوں کا ہے"۔ بہرحال دوستوں کی بے فکری کی صحبت دل میں اُمنگ کا زور اور لطف اُٹھانے کی خواہش نے اُس کو گلشن حسن میں گلچیں بنا کر پہنچا دیا۔ شباب کی سرمستیوں نے ہاتھ پکڑا اور ذوق نظر نے راستہ دکھایا۔ غرض لائپزگ کی ابتدائی زندگی بڑے ہی لطف سے گذری مگر ابھی زیادہ

زمانہ نہ گذرنے پایا تھا کہ اس کی حساس طبیعت مغموم رہنے لگی۔ " یاروں " کے طعنے برداشت کرتے کرتے وہ کچھ بد دل سا ہو گیا تھا اور تنہائی کی تلاش کرنے لگا تھا اور اکثر اکیلا بیٹھ کر غمگین خیالات میں غرق ہو جاتا۔ اپنے ایک دوست کو لکھتا ہے کہ مدتوں سے میں نے کچھ نہیں لکھا ہے۔ "میں یہاں بالکل تنہائی کی زندگی بسر کر رہا ہوں اور اس تنہائی نے میرے دل میں چند غمگین خیالات پیدا کر دیئے ہیں " پھر اپنی ایک نظم میں لکھتا ہے۔

" میری تفریح بس یہی ہے۔
کہ میں دنیا سے دور رہوں
اور چشمہ کے کنارے لیٹ کر
اپنے دوستوں اور محبوں کا خیال کروں "

اس طرح لائپزگ میں اُس کے دن گذرتے رہے۔ جب دوسرا ٹرم شروع ہوا تو واقعات نے اوراق اُلٹے اور گوئٹے کی طبیعت کا رخ بھی بدلنے لگا۔ جارج شلوسر اُس کا ایک ہموطن وکیل تھا مگر وہ وکالت ترک کر کے ایک شاہزادہ کا پرائیویٹ سکریٹری ہو گیا تھا اور اسی دوران میں لائپزگ آ کر ایک ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ گوئٹے برابر اُس سے ملنے جاتا۔ ہوٹل کے مالک شونٹن کوپ کے ایک لڑکی مسمی اینا کیتھینا عرف کیتھشن تھی جس کو گوئٹے اینیٹے کے نام سے پکارتا ہے۔ گوئٹے شلوسر سے ملنے جاتا تو وہیں کھانا بھی کھاتا اور شونٹن کوپ اور اُس کی بیوی سے باتیں بھی کرتا۔ شونٹن کوپ کی بیوی اُس کی ہموطن تھی۔ اسی سلسلہ سے اینیٹے سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ دل جو فرینکفورٹ میں ایک بانی جور و جفا کے تیر نظر کا شکار ہو چکا تھا پھر لائپزگ کی آزاد آب و ہوا میں دعوت مژگاں کے لئے جگر پاروں کو جمع کرنے میں مصروف ہوا۔ یعنی اینیٹے سے راہ و رسم یہاں تک بڑھی کہ گوئٹے کو اُس سے محبت ہو گئی اور شلوسر کی روانگی کے بعد بھی شونٹن کوپ کا ہوٹل بدستور گوئٹے کا جولانگاہ بنا رہا۔ وہاں اینیٹے کی دلنواز صحبت سے اُس کی آتش شوق اور تیز ہوئی جن لوگوں نے اینیٹے کو دیکھا تھا وہ سب اُس کی تعریف میں رطب اللسان تھے اسکے حسن کی رعنائی اُس کے قدوقامت کی دلربائی اور پھر اس پر اُس کی دانائی تو اس قابل تھی کہ اُس کو بت بنا کر دل کے مندر میں پرستش کے لئے رکھ لیا جائے۔ اس کا حسن و جمال اور گوئٹے کا والہانہ انداز دیکھ کر تو گوئٹے کے دوست یاروں کا یہ خیال تھا کہ اینیٹے بس گوئٹے کے لئے پیدا ہوئی ہے مگر باوجود اینیٹے کے عشق کا دم بھرنے کے گوئٹے اول ہی روز سے جان گیا کہ اینیٹے میری بیوی نہیں بن سکتی۔ گوئٹے کی پلے رنگی کی وجہ سے آخر اینیٹے کی

نسبت ڈاکٹر کانے سے ہوگئی اور کچھ دنوں بعد شادی بھی ہوگئی۔ گوئٹے کی بے پروائی کی وجہ شاید یہ ہوسکتی ہے کہ وہ جیسا کہ اُسکا برابر دستور رہا اپنی معشوقہ کو تصور کی آنکھ سے دیکھتا اس کے عشق کی بیتابی میں زیادہ تر تخیل کی رنگ آمیزی ہوتی جو اس کو اپنی معشوقہ کے ساتھ دیرپا وابستگی سے روکتی پھر اُس کے ساتھ اسکی تلون مزاجی اُس کو ایک مرکز پر قرار نہ لینے دیتی۔ ایسا واقعہ اُس کی زندگی میں کئی بار پیش آیا کہ وہ اپنی معشوقہ سے محبت اور شیفتگی کے زمانہ میں یکایک بے پروا ہو جاتا اور بے اعتنائی برتتا۔

دلے دیوانہ دارم کہ با دلبر نمی سازد

اُس نے اس زمانہ میں اپنے دوست بہرش کے نام جو خطوط لکھے ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ اسکی روح کسی عذاب میں مبتلا ہے۔ ساتھ ہی اُس نے اس تلون مزاجی کی تصویر اپنے ایک ڈرامہ موسوم بہ "عاشق کی تلون مزاجی" میں کھینچی ہے اور اُس میں اینیٹے سے اپنے عشق کی داستان بیان کی ہے۔ یہ زمانہ اُس کے لئے سخت روحانی کشمکش کا زمانہ ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی روح کسی چیز کی تلاش میں مصروف ہے مگر نہ ملنے کی وجہ سے سخت بیقرار ہے۔

لائپزگ کے زمانہ طالبعلمی کے آخری دور میں اُس کی ملاقات ایک شخص مسمی فریڈرش اوئزر سے ہوئی جو لائپزگ کے تصویر خانہ کا افسر اعلیٰ تھا وہ فن مصوری میں درس دیتا تھا گو خود کوئی بڑا مصور نہ تھا مگر اپنے زمانہ میں وہ شاید تصویروں کا سب سے بڑا پرکھنے والا تھا۔ یونانی حسن کی سادگی کی طرف پہلے پہل اُسی نے وینکلمن کو توجہ دلائی تھی فنون لطیفہ میں سادگی کا قائل تھا اور چونکہ خود سادہ زندگی بسر کرتا تھا اس لئے اُس کی تعلیم کا بڑا اثر پڑتا تھا۔ اس میں ایک بات اور بڑے کمال کی تھی یعنی وہ اپنے طلبا میں فنون لطیفہ کا سچا شوق پیدا کر دیتا اور اگر کوئی جوہر قابل مل جاتا تو اُس کی تربیت بڑی محنت سے کرتا۔ اپنے طلبا میں سے اس نے ہونہار گوئٹے کو فوراً تاڑ لیا کہ یہ جوہر قابل ہے اور اوئزر نے اس کو ہر طرح کی آسانیاں بہم پہنچائیں اور لائپزگ کے بڑے بڑے ماہرین سے اس کی ملاقات کرا دی جن سے گوئٹے فنون لطیفہ پر بحثیں کرتا۔ اوئزر کی تعلیم کا اس پر بہت اثر پڑا چنانچہ اوئزر کو ایک خط میں لکھتا ہے "میں نے حقیقت اور حسن تک پہنچنے کا جو راستہ دیکھ پایا ہے وہ آپ ہی کی تعلیم کا طفیل ہے۔۔۔ یہ کتنی کھلی مگر ناقابل فہم حقیقت ہے کہ ایک مصور کا تصویر خانہ ایک نوخیز شاعر اور ایک نوخیز فلسفی کی اہلیت بڑھانے کے لئے بہ نسبت کسی فلسفی یا ناقد کے حلقہ درس سے کہیں بہتر ہے"

اس سے کچھ پہلے جرمنی کے مشہور مصنف لیسنگ کی "لاکون" شایع ہو چکی تھی لیسنگ نے اس میں

شاعری اور مصوری کا فرق نہایت واضح طور پر بیان کیا تھا اور ساتھ ہی فنون لطیفہ کے اصول بتائے تھے۔ اس کتاب سے گوئٹے کے خیالات منجلہ بہت صاف ہوئے یعنی غور و فکر کے ساتھ اس میں باریک بینی کی بھی صلاحیت پیدا ہو گئی ہم دیکھ چکے ہیں کہ لائپزگ کے دوران قیام میں اوّل اوّل گوئٹے قانون و ادب کے لکچروں میں شامل ہوتا رہا مگر بعد کو اس نے قانون چھوڑ دیا البتہ ادب سے اس کی دلچسپی بڑھ گئی۔ پھر اوئزر کی مدد سے فنون لطیفہ کی تعلیم حاصل کرتا رہا لیکن ان چیزوں سے اُس کے خیال میں صفائی نہیں آئی تھی۔ اسکے سامنے کھرا کھوٹا رطبؔ و یابس سبھی کچھ تھا مگر ان کو علیحدہ علیحدہ کر کے پرکھنا ذرا مشکل کام تھا لیکن لیسنگ نے جب یونانی اثرات سے موثر ہونے کے بعد فرانسیسیوں کی تقلید کے بندوں کو کاٹ کر فنون لطیفہ کی تعریف کی اور بت تراشی، مصوری اور شاعری کی حدیں مقرر کر دیں اور بت تراشی و مصوری کو زمان و مکان سے محدود اور شاعری کو لا محدود قرار دیا تو گوئٹے کی آنکھیں کھل گئیں اور اسکو معلوم ہوا کہ اصل علم کا آفتاب اب طلوع ہوا ہے اور اب تک ہم سب فرانسیسیوں کے موضوعات میں جسکا فطرت انسانی سے کوئی تعلق نہیں گرفتار تھے۔ گوئٹے اب تک فرانسیسیوں کے رنگ میں رنگا ہوا تھا مگر اب اسکی فطری بیچینی اس تاریکی سے نکلنے کی آرزومند معلوم ہوتی ہے اور وہ کوئی ایسا ٹھکانا تلاش کرتا ہے جو اسکے روحانی سرمایہ میں مدد دے سکے۔ یہیں سے اُس کی روحانی کشمکش کا تھوڑا بہت رخ بدلتا ہے اور یہی کشمکش آگے چل کر اس کو فنون لطیفہ کی صحیح شاہراہ پر پہنچا دیتی ہے۔

لائپزگ آکر اس کو کتب بینی کا شوق اور بھی بڑھ گیا تھا۔ جرمن زبان میں ادب پر جتنی کتابیں نکلتیں وہ اس کو ضرور پڑھتا ان کے علاوہ دوسرے ملکوں کے شعرا کا کلام بھی پیش نظر رہتا۔ اسی سلسلہ میں اُس نے ڈاڈ کی کتاب "شیکسپیر کے کلام کا حسن" کا مطالعہ کیا۔ اس سے شیکسپیر کا اور شوق بڑھا اور پھر وائیلنڈ کے ترجموں کو پڑھا۔ اتنا پڑھنے پر بھی اُس کے ہمہ گیر دماغ کو سیری نہیں ہوتی اور اُس کی طبیعت دوسرے علوم کی بھی طالب ہوئی۔ قانون وہ چھوڑ چکا تھا مگر اب قانون کی طرف پھر راغب ہوا اور قانون کے علاوہ دینیات، فلسفہ اور طب پڑھتا۔ لیکن اتنا پڑھنے کے بعد اگر لکھنا نہ ہو تو پڑھنا بیکار ہے۔ لائپزگ کے قیام میں اُس نے کئی قصے، ڈرامے اور نظمیں لکھیں۔ اس دور کے افسانے زیادہ تر عشقیہ ہیں جس میں ایک عاشق اپنے ہجر کی داستان خطوں کے ذریعہ کسی دوست کو سناتا ہے جن میں اندرونی کشمکش کا حال زیادہ نمایاں ہے۔ وہ اپنے کلام کی بنیاد اپنے اندرونی جذبات پر رکھتا ہے مگر خارجی حالات سے بھی آزاد نہیں۔ اندرونی احساسات اور خارجی حالات دونوں پر نظر رکھنے سے جیسا

کہ وہ اپنی سوانح عمری میں لکھتا ہے اُس کی عادت ایسے سانچہ میں ڈھل گئی جو تادم مرگ قائم رہی یعنی جس چیز سے اُسے لطف حاصل ہوتا یا تکلیف ہوتی اسکی وہ شعر میں تصویر کھینچ دیتا کیونکہ اس طریقہ سے وہ اپنے دل کے جذبات کی خواہش اظہار کو پورا کر دیتا اور یہ بھی دیکھ لیتا کہ خارجی حالات کی صحت کا اُس نے کہاں تک خیال رکھا ہے۔ آگے چلکر وہ کہتا ہے کہ اس وجہ سے میں نے جو کچھ لکھا ہے اسکو میری داستانِ زندگی کا ایک ٹکڑا سمجھنا چاہیئے۔

ان علمی مشاغل کے درمیان ۱۷۶۸ء میں اُس کی صحت خراب ہونے لگی۔ مزید براں اُس کی طبیعت کی افسردگی نے جو لائپزگ کے قیام کے کچھ ہی دنوں بعد شروع ہوگئی تھی اور خراب اثر ڈالا۔ اس زمانہ میں اسکو درد سینہ کا شدید دورہ اُٹھا جو ایک دفعہ گھوڑے سے گر جانے سے پیدا ہوا تھا۔ ان چیزوں کے علاوہ اُس کی صحت کو خراب کرنے والی اور بہت سی چیزیں تھیں مثلاً کھانے کی خرابی سے تو اُس کا معدہ خراب ہو چکا تھا۔ اس پہ شراب اور قہوہ کی زیادتیوں نے رہی سہی قوت ہاضمہ برباد کر دی۔ اس حالت میں کبھی وہ اپنی صحت کی طرف سے نا اُمید ہو جاتا اور کبھی اُس کو صحت کی پوری اُمید ہوتی۔ اتفاق سے اُسی زمانہ میں اُس نے روسو[1] کے نظریہ فطرت کا مطالعہ کیا۔ اُس کے مطالعہ سے اتنا متاثر ہوا کہ اُس کی طبیعت میں ایک طرح کی آشفتگی پیدا ہوگئی۔ وہ فطرت سے ہم آغوشی کی خواہش میں سختیاں برداشت کرتا۔ ٹھنڈے پانی سے نہاتا۔ تخت ایسی چارپائی پر سوتا اور بدن کو زبردستی تکلیف سہنے کا عادی بناتا۔ اُس کا خیال تھا کہ ان سب باتوں سے انسان بزم فطرت کا ایک رکن بن کر مسرت سے زندگی گذار سکتا ہے۔ کچھ دنوں تک تو اُس کی جوانی کی قوت نے اُس کے خبط کا ساتھ دیا۔ لیکن جب بدن پر شدید ضربیں پڑنے لگیں تو بدن نے بھی جواب دے دیا۔ یعنی ایک روز رات کو اُس کے سینہ کی ایک رگ پھٹ گئی اور منہ سے خون آیا۔ ہفتوں وہ ڈاکٹروں کی نگرانی میں صاحب فراش رہا اور اُس کے دوستوں اور شناساؤں نے اُس کی تیمار داری سے کسی قسم کا دریغ نہیں کیا۔ ہم اس خراب نتیجہ کے لحاظ سے اسکی اس حرکت کو خبط کہہ سکتے ہیں لیکن یہی چیز اسکے ارادہ کی مضبوطی اور عزم کی پائداری کی دلیل بھی ہے اسی اثنا میں اسکی ملاقات ایک جامع علم و فضل شخصیت لانگر سے ہوئی۔ لانگر مذہبیات کے علاوہ

---

[1] جین جیک روسو (۱۷۱۲-۱۷۷۸) فرانس کا مشہور اہل قلم۔ انقلاب فرانس کا بانی۔ اپنی تصنیف "معاہدہ اجتماعیہ" جس میں انسان کی تمام تکالیف کا ذمہ دار خود انسان کی خود ساختہ تہذیب کو قرار دیتا ہے اس لئے تہذیب سے گریزاں ہونے کا مشورہ دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ جنگل کی سادہ زندگی سے انسان کے اخلاق فطرت سے قریب تر ہو کر بہترین سانچہ میں ڈھل جائیں گے۔

یونانی تمدن پر گہری نظر رکھتا تھا۔ اُس نے گوئٹے میں اوّل اول یونانیات کا شوق بڑھایا اور یونانی مصنفین کی مشہور تصنیفات کی طرف توجہ دلائی رفتہ رفتہ دونوں میں بحثیں ہونے لگیں مگر سب سے زیادہ زیر بحث مضمون مذہب رہتا تھا اُس زمانہ میں عیسائیت کے فرسودہ خیالات میں زبردست تبدیلی ہو رہی تھی۔ مسیح سے علیحدہ خدا کی وحدانیت کا مسئلہ لوگوں میں جڑ پکڑ رہا تھا۔ قدیم الخیال عیسائیت کو اس سے سخت معرکہ آرائی کرنی پڑی جب یہ مسئلہ اُبھرا تو اُس کے ساتھ ہزاروں باتیں اور پیدا ہو گئیں مثلاً عقائد میں عقل و جذبات کی کیا حد ہونی چاہیئے مسیح کا کیا درجہ ہے اور خدا کا اُن کے ساتھ کیا تعلق ہے غرض عقائد کی اس جنگ سے لوگ کئی فرقوں میں بٹ گئے جو زیادہ ذی فہم اور بیدار مغز تھے وہ عیسائیت کے فرسودہ عقیدہ سے بیزار ہو کر اس سے تائب ہو گئے۔ لیکن جو ذرا کچھ نرم تھے اُنھوں نے اپنی راہ الگ نکال لی یعنی وہ عیسائیت سے الگ ہونے کے بجائے اُس کے اندر رہ کر ترمیم کے خواہاں ہوئے۔ لاگنر کا شمار موخرالذکر گروہ میں تھا۔ اُس کا عقیدہ تھا کہ خدا کے یہاں بندوں کی رسائی براہ راست نہیں ہو سکتی۔ کسی نہ کسی ذریعہ کی ضرورت ہے اور یہ زمین و آسمان، یہ چاند اور تارے اُس کے ذرائع ہیں۔ انسان مناظر قدرت کے اس بڑے پردہ کی جلوہ گری پر اگر غور کرے تو اُس کے پیچھے وہ ہستی مقصود اُس کو نظر آئیگی۔ لاگنر کے اس عقیدہ کا بیمار گوئٹے پر بڑا اثر پڑا۔ انجیل کو وہ اب تک پیغمبروں کے قصوں اور قدرتی زندگی کے ماحول کی خاطر پڑھا کرتا تھا مگر اب اُسکو الہامی کتاب سمجھنے لگا اور خالق کائنات کے متعلق اُسکا یقین پختہ ہونے لگا۔ الف ۳

ستمبر ۱۷۶۸ء میں جب اُس کی طبیعت کچھ سنبھلی تو وہ مکان واپس آیا راستہ بھر برابر اُس کو خیال لگا رہا کہ میں لائپزگ سے بغیر کوئی سند لئے جا رہا ہوں اور اکثر اپنی گذشتہ تین سال کی زندگی پر افسوس بھی کرتا گھر پہونچا تو باپ اپنے بیمار لڑکے کی صورت دیکھ کر جو وقت کے ساتھ صحت بھی کھو چکا تھا بہت رنجیدہ ہوا۔ باپ نے فوراً علاج کا معقول انتظام کیا اور اپنی ماں اور بہن کی سخت تیمارداری سے اوائل ۱۷۶۹ء میں گوئٹے کو کُلی صحت ہو گئی۔

صحت کے بعد اُس نے جب کیٹشن کی ڈاکٹر کانے کے ساتھ شادی کا حال سنا تو سنتے ہی اُسے اپنے عشق کا بھولا ہوا افسانہ پھر یاد آ گیا۔ کیٹشن کے ساتھ اُس کی بہت سی رنگین صحبتیں گذری تھیں اور اُس کے اثر سے اُس نے اُس کی شان میں بہت سے اشعار بھی کہے تھے۔ اب جو خیال آیا کہ کیٹشن بالکل دوسری دنیا میں جا رہی ہے تو اُس نے کیٹشن کو ایک نہایت درد بھرا خط لکھا جس کے جستہ جستہ اقتباسات مندرجہ ذیل ہیں اور جس سے گوئٹے کی سیرت پر بھی روشنی پڑتی ہے :-

"رات میں نے تمہیں خواب میں دیکھا تمہاری صورت میری آنکھوں کے سامنے ہزاروں بار پھرتی رہی لیکن میں دیکھتا اور محسوس کرتا رہا کہ یہ چہرہ شاید کسی اجنبی کا ہے۔ اب میں تمہارا خط پڑھکر جس کو آئے ہوئے کئی مہینے ہوئے تمہاری ایک ایسے شخص سے محبت ورافت کو محسوس کرتا ہوں جو اُس کا کسی طرح سزاوار نہ تھا تو مجھے خود اپنے سے شرم آتی ہے۔ اور مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میرے دل میں کتنا انقلاب پیدا ہو گیا ہے یعنی میں اب اُس چیز کے ہوتے ہوئے بھی خوش نہیں رہ سکتا جو کسی زمانہ میں میری خوشیوں کو زمین سے آسمان تک پہنچا دیتی تھی۔ مجھے معاف کرو۔۔۔ میری بدقسمتی نے میری نیکیوں کو بھی خراب کر دیا ہے۔ میرا جسم تو ضرور تندرست ہو گیا مگر میری روح ابتک بیمار ہے۔ میں بالکل بیکار اور کاہل ہو گیا ہوں۔۔۔ اور اس بیکاری کی حالت میں میرا تخیل بھی اتنا ساکن ہو گیا ہے کہ آج میں اس صورت کی یاد بھی نہیں کر سکتا جو مجھے کبھی بہت عزیز تھی۔ یہ خواب ہی کا طفیل ہے کہ میرا دل اپنی اصلی حالت پر آجاتا ہے اور اُن خوبصورت چیزوں کی یاد دلا کر جذبات میں اگلا سا شوق پیدا کر دیتا ہے۔ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ تمہاری صورت کی یاد مجھے خواب میں آئی میں تم سے اُسی خواب میں ملا، تمہارے ساتھ رہا۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہوا میں اسے نہیں بتا سکتا۔ مختصر یہ کہ تمہاری شادی ہو گئی ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟ اگر یہ صحیح ہے تو خدا کرے کہ یہ تمہاری آئندہ خوشیوں کا پیش خیمہ ثابت ہو۔۔۔ میں اس خواب کا شکر گذار ہوں کہ اس نے مجھے تمہاری اور تمہارے شوہر کی خوشیوں کو دیکھنے کا موقع دیا۔۔۔ اگر میرا خواب صحیح ہے تو ہم لوگ پھر ملیں گے لیکن جلدی نہیں۔ اگر انسان قسمت کے مقابلہ میں قدم اُٹھا سکتا ہے تو میں کوشش کرونگا کہ ہماری تمہاری ملاقات کسی آئندہ موقع کے لئے ٹل جائے۔۔۔ اب میں اس جگہ کو چھوڑ کر جانے والا ہوں تاکہ تم سے دور ہو جاؤں اور لائپزگ کی زندگی کی یاد دلانے والی سوائے بیقرار کرنے والے خوابوں کے اور کوئی چیز نہ ہو۔ نہ تو کوئی دوست ہو جو آکر تمہارا حال بتائے اور نہ کوئی خط ہو جو زبان حال سے تمہاری کیفیت بیان کرے۔[1] لیکن اس کے باوجود مجھے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیزیں کچھ کام نہ آئیں گی۔ یہ کام صبر، وقت اور فاصلہ ہی سے پورا ہو سکتا ہے۔۔۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ خدارا مجھکو کوئی خط نہ لکھو۔ ہاں اگر تمہیں کچھ کہنا ہے تو کسی دوست کے ذریعہ سے کہلا دو۔ بس اسے یہ سمجھکر پورا کر دو کہ یہ ایک بدبخت کی آرزو ہے۔۔۔ میں تمہاری تحریر اب نہیں دیکھنا چاہتا اور نہ تمہاری آواز سننا چاہتا ہوں کیونکہ میرے لئے یہی کیا کم ہے کہ میں اپنے خواب کی کیفیت میں مشغول ہوں۔ ایک خط میں اور بھیجونگا اور ضرور بھیجوں گا اور اسطرح گویا اپنے ایک بار سے سبکدوش ہونگا۔ اور بقیہ کے لئے تم سے معافی کا خواستگار ہونگا۔

---

[1] غالب کے مشہور قطعہ سے موازنہ کیجئے۔

رہیئے اب ایسی جگہ چلکر جہاں کوئی نہ ہو + ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیئے + کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار + اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

اپنے دوسرے خط میں جس کا اوپر ذکر کر چکا ہے لکھتا ہے "سب سے زیادہ لائق محبت وہ دل ہے جو بہت جلد محبت کرنے لگتا ہے لیکن جو آسانی سے محبت کرتا ہے وہ آسانی سے بھول بھی جاتا ہے"

جس زمانہ میں اُس کی صحت خراب تھی اُس کی ماں کی ایک دائم المریض دوست فراؤلائن فان کلیٹنبرگ آیا کرتی تھی اسکا تعلق پائٹسٹ (صوفیوں کا ایک گروہ) فرقہ سے تھا۔ اپنی خرابی صحت کو اس عالم فانی کا ایک ناگزیر جزو سمجھتی تھی اور اپنے آلام کو بڑے صبر کے ساتھ برداشت کرتی وہ اپنے عقیدہ میں بہت استوار تھی اور گوئٹے پر بھی اثر ڈالنے کی کوشش کرتی۔ لانگر کی صحبت نے گوئٹے میں جس عقیدہ کا بیج بویا تھا وہ فراؤلائن کلیٹنبرگ کے اثر سے پروان چڑھا یعنی گوئٹے کی طبیعت بھی کچھ نہ کچھ تصوف کیطرف مائل ہوگئی۔

فراؤلائن کلیٹنبرگ اور گوئٹے کے معالج ایک ڈاکٹر میٹنر تھے جو علم طب وکیمیا کے ماہر تھے اور مذہب سے بھی خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ گوئٹے کی ذہنیت تمام جزو کو کل کی نسبت سے دیکھنے کی متقاضی تھی اس وجہ سے اُس نے ڈاکٹر میٹنر سے طب وکیمیا بھی سیکھنا شروع کر دیا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ روح و مادہ کے تعلق کا راز دریافت کرنے کے بعد انسان حقیقت کی آخری کڑی تک پہنچ جائیگا۔ اس میدان میں اُس کا خبط اتنا بڑھا کہ اُس نے اپنے گھر میں دوائیوں، شیشیوں، نلکیوں اور اسی قسم کی بہت سی ضروری و غیر ضروری آلات کا ذخیرہ جمع کرکے اپنے گھر کو اچھا خاصہ کباڑ خانہ بنا لیا۔ دن رات وہ اس کباڑ خانہ میں کچھ نہ کچھ کرتا رہتا۔ رات کی رات گذر جاتی اور وہ ایک نلکی کے کیمیاوی اجزا کو دوسری نلکی اور دوسری سے تیسری میں ڈالتا اور دیکھتا۔ اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھتا ہے کہ اگر میں کسی چیز سے دلچسپی لیتا تو اُس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے اس سے کچھ فائدہ ہوتا اور آئندہ کے لئے کچھ نہ کچھ اچھے نتائج کی بنا پڑتی۔ ایک شاعر کو اس کاٹھ کباڑ کے اندر دیکھ کر کچھ لوگوں کو ہنسی آتی ہوگی اور کچھ لوگوں کو رحم مگر یہ اُسی کی ہمہ گیر طبیعت کا ایک رنگ تھا کہ وہ تقریباً دنیا کی ہر چیز سے دلچسپی لیتا لیکن دوربین نگاہوں سے یہ مخفی نہ رہا ہوگا کہ اس کا یہ جوش عمل اور شوق تعلیم کسی بڑے کام کا پیش خیمہ تھا جو بعد کو فاؤسٹ ایسی عظیم الشان شخصیت کی تخلیق میں ظاہر ہوا۔

گوئٹے کے صحتیاب ہوجانے پر اُس کے باپ کو پھر خیال آیا کہ ہونہار فرزند کو تعلیم کے لئے پھر کہیں بھیجے۔ گوئٹے بھی فرینکفورٹ کی زندگی سے کچھ دل برداشتہ ہو چلا تھا۔ باپ سے آئے دن بات بات میں بحث ہوتی۔ آخر جب تمام انتظامات مکمل ہوگئے تو گوئٹے ابکی بار اسٹراس برگ روانہ ہوا اور اپریل ۱۷۷۰ء میں وہاں پہونچکر اس نے یونیورسٹی میں داخلہ کرا لیا۔

شروع شروع میں تو شہر اُس کو پسند نہ آیا لیکن بعد کو جب اُس کی دلچسپیاں بڑھ گئیں تو اُسکا دل لگ گیا۔ اسٹراس برگ میں وہ ایک ایسے بورڈنگ ہاؤس میں رہتا تھا جہاں علم طب کے طلبا رہتے تھے۔ اُن کی صحبت سے ڈاکٹر ہیٹنر کی یاد تازہ ہو گئی اور طب کی بھولی ہوئی دلچسپیاں پھر از سر نو زندہ ہو گئیں پھر شوق اتنا بڑھا کہ علم تشریح البدن، علم الکیمیا اور علم البرق کے لکچروں میں شامل ہونے لگا۔ جب کبھی چھٹی ملتی تو نواح ملک کی سیر کو جاتا اور وہاں کوئلے کی کانوں، شیشہ اور لوہے کے کارخانوں کو دیکھتا اس اثنا میں اُس کے ایک دوست سالسمن نے اُسکا تعارف چند معزز گھرانوں میں کرادیا جہاں اُس نے تاش کھیلنا، رقص کرنا اور تفریح کے اور بہت سے طریقے سیکھے جن سے وہ اب تک بالکل بیگانہ تھا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اُس نے قانون کی نسبت کیا کیا جس کی تعلیم کے لئے وہ خاص طور پر اسٹراس برگ آیا تھا۔ اسٹراس برگ فرانس کے نزدیک تھا اس لئے وہاں کی ہر چیز فرانسیسی تمدن کے رنگ میں رنگی ہوئی تھیں۔ کردار و گفتار، وضع قطع، علم و فن غرض ہر شے میں فرانس کا طرز نصب العین سمجھا جاتا تھا وہاں کی یونیورسٹی بھی اس اثر سے باہر نہیں تھی چنانچہ قانون کی تاریخی اور ارتقائی تعلیم کے بجائے صرف مروجہ قانون کی تعلیم دیجاتی تھی یعنی چند ابتدائی باتوں کے ساتھ تھوڑا بہت اصول مختصر الفاظ میں بتا دیا جاتا تھا اور یہی قانونی تعلیم کی کل کائنات تھی۔ گوئٹے لائپزگ کے شروع زمانہ میں اس سے کہیں زیادہ پڑھ چکا تھا اس لئے اسکو نصاب اتنا آسان معلوم ہوا کہ اُس نے پہلا امتحان بغیر کسی محنت کے پاس کرلیا۔ اب سند حاصل کرنے کے لئے بس کوئی ایک مضمون قانون پر لکھ کر پیش کرنا رہ گیا۔ اس مضمون کی تیاری کے لئے اُس نے ایک سال مقرر کیا مگر جب دوسرا ٹرم شروع ہوا تو اُس نے طب کا مطالعہ اس محنت سے شروع کیا گویا وہ قانون کے بجائے طب کا طالب علم ہے۔ مریضوں کے کمروں میں جاتا گھنٹوں اُن کے دکھ درد کی داستانیں سنتا اور اُن کو تسلی دیتا۔ اس طرح انسانی زندگی کی معلومات بڑھانے کے ساتھ ساتھ وہ ایک ایسے علم کی واقفیت بھی پیدا کر رہا تھا جو بعد کو اُس کے کام آئی۔ طب کا یہ اثر ہوا کہ وہ اپنی بہت سی طبعی کمزوریوں پر غالب آیا یعنی وہ پہلے کسی بیمار کو یا لاش کو نہیں دیکھ سکتا تھا اب یہ ہوا کہ ان چیزوں کے دیکھنے سے کوئی خاص اثر نہ ہوتا۔ اسی طرح وہ اگر اونچائی سے نیچے دیکھتا تو اُسکا سر چکرا تا یا زور کی آواز سننے سے اُس کے کان میں ایک تکلیف دہ سنسناہٹ پیدا ہوتی۔ ان چیزوں کو دور کرنے کے لئے وہ ڈھول کی گونج سنتا اور کسی اونچے گرجا کے مینار کے بالائی حصے پر چڑھ کر زمین کی طرف دیکھتا۔ اکثر اندھیری راتوں میں قبرستانوں، سنسان جگہوں اور گرجا گھروں

کی سیر کو نکل جاتا تا کہ اسکا خوف دور ہو جائے۔ ان واقعات کے بیان کرنے سے مقصود صرف اتنا ہے کہ گوئٹے نے اپنے باطن کو سنوارنے اور اپنی کمزوریوں پر غالب آنے کی جو کوششیں کی ہیں اُس کی مثال گو تاریخ میں کم ہی مگر انسان کے لئے دلیل راہ کا کام دے سکتی ہیں۔ ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انسان اگر اپنی قوت ارادی سے کام لے یا یوں کہئے کہ اپنی خودی کو بروئے کار لائے تو اپنی ہستی کو بلند مرتبہ اور اعلیٰ درجہ پر پہونچا سکتا ہے۔

اُس زمانہ میں جب وہ گرجا گھروں کے میناروں پر چڑھتا اسکو اسٹراس برگ کے ایک گاتھی وضع کے ایک گرجا گھر میں خاص دلچسپی پیدا ہو گئی۔ گاتھی وضع کلاسیکی (قدیم یونانی اور رومی) وضع سے بالکل مختلف ہے۔ اس وضع کی عمارتیں زیادہ تر عظیم الشان اور رفعت نشان ہوتی ہیں۔ یورپ میں ان کی تعمیر تیرہویں چودھویں صدی سے شروع ہوتی ہے۔ اُن کی اونچائی اور چوڑائی میں خاص تناسب ہوتا ہے۔ ان میں سنگ تراشی اور پچیکاری کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ لیکن باوجود اُن کی عظمت کے ان میں سادگی کا بھی عنصر موجود ہے۔ ان عمارتوں کا حسن گو کلاسیکی طرز کا نہ سہی مگر ایک صاحب ذوق کے تخیل کو چھیڑ کر اس میں لطف پیدا کر سکتا ہے۔ گوئٹے اس گرجا گھر کو بڑے شوق سے دیکھا کرتا اور اُس کے حسن ترتیب، ہم آہنگی و سادگی سے کافی لطف اُٹھاتا۔ اس وضع کی عمارتوں میں ایک ایسی چیز بھی ہے جو خالص مشرقی ہے اور وہ انکا محراب ہے۔ یورپ میں پہلے پہل محراب دار عمارتوں کا کہیں وجود نہ تھا۔ اوّل اوّل گھوڑ نال کے شکل کی محراب دار عمارتیں عراق میں تیار ہوئیں۔ پھر نویں صدی کے آخر میں محراب نے نکیلی شکل اختیار کر لی اور یہ جدید طرز قاہرہ کی ایک عمارت میں پہلے پہل نظر آتا ہے اور پھر اُسی رنگ میں کئی صدی بعد یورپ کی عمارتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ گاتھی طرز کی عمارتوں میں گوئٹے کی دلچسپی شاید یورپ کی نقلی کلاسیکی وضع کے تنفر سے پیدا ہوئی تھی۔ اُسوقت یورپ میں گاتھی طرز اتنا نامقبول تھا کہ فن تعمیر میں ہر بھنگم، بدصورت اور بدوضع طرز کا نام ہی گاتھی پڑ گیا۔ مگر گوئٹے نے اس طرز کی خوبیوں سے متاثر ہو کر اپنے ملک کے فن تعمیر کو پرکھا اور اُن کو از سر نو زندہ کیا۔ اُس نے گاتھی طرز کی موافقت میں ایک مضمون لکھا جس میں مصری، مشرقی اور دیگر طرزوں کا موازنہ کیا اور دکھایا کہ گاتھی طرز میں خوشنمائی، ہم آہنگی، سادگی اور خوبصورتی سبھی کچھ موجود ہے۔ یہ گویا اسکی پہلی آواز تھی جو اُس نے فرانس کی نقلی کلاسیکیت کے خلاف بلند کی۔ اس طرح وہ اس نقل سے ہٹ کر اپنے ملکی علم و فن کے سرمایہ کی طرف رجوع ہوا اور ساتھ ہی ساتھ نامعلوم طریقہ سے وہ ایک حد تک

مشرق کی طرف بھی مائل ہوا جس کا اثر بعد کو اس کے کلام پر بہت پڑا۔ ہم آگے چل کر ان اثرات کا ذکر کریں گے۔

دوسری چیز جس نے گوئٹے کے زمانہ قیام اسٹراس برگ میں اُس پر نہایت گہرا اور دیرپا اثر ڈالا وہ ہرڈر کی ملاقات تھی۔ ہرڈر کے فیض صحبت سے گوئٹے گوئٹے ہو گیا۔ گوئٹے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں اس شخص کے کمالات کا بڑی دریا دلی سے اعتراف کرتا ہے اور اُس کے بیان کو اُس نے سب سے زیادہ پھیلا کر لکھا ہے۔ گوئٹے اور ہرڈر کی ملاقات جرمن ادب میں ایک نئی روح پھونکنے کا باعث ہوئی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ نئی روح کیا تھی اور اس سے قبل جرمن ادب کی کیا حالت تھی؟

سترھویں صدی کے وسط میں سی سالہ جنگ نے جرمنی کے تمام علوم و فنون کا خاتمہ کر دیا اور تمدن کی بہر کو جو قرون وسطیٰ سے چلی آ رہی تھی یکایک روک دیا "تمدن زیر خاک، ملکی خوشحالی کا چراغ گل" انھیں دو فقروں میں اس تباہی کی داستان دہرائی جا سکتی ہے۔ جرمنی کی یہ حالت کم و بیش سو برس تک قائم رہی۔ اغیار جرمنی کے بعض حصوں پر قابض تھے۔ خود ملک میں کئی حکومتیں تھیں اس وجہ سے نہ تو سیاسی ہم آہنگی تھی اور نہ آزادی لیکن اس زمانہ میں بھی جرمنی کی حقیقی روح مردہ نہیں تھی۔ وہ تڑپنا چاہتی تھی مگر تڑپ نہ سکتی تھی۔ وہ ظاہر ہونا چاہتی تھی مگر اظہار کا موقع نہیں ملتا تھا۔ پھر آخر وہ کیا چیز تھی جس نے یہ کشمکش حیات یہ کشاکش اظہار پیدا کر دی تھی؟ یہ جرمن "قوم" کا دردِ نی سوز و گداز تھا جس کا اظہار فرد کی زبان سے برابر تغزل میں ہوتا رہا اور جو حالات کے موافق ہونے پر

ا‌ے جان فریڈرش ہرڈر (۱۸۰۳-۱۷۴۴) کونگسبرگ میں مذہبیات کا مطالعہ کرنے کے بعد شہر ریگا میں بحیثیت پادری اور معلم سکونت پذیر ہو گیا۔ یہیں اس نے ہیوم اور روسو کی تصنیفات کا مطالعہ کیا اور مشہور فلسفی کانٹ کی علمی صحبت سے بھی مستفید ہوا۔ اسی زمانہ میں اسکی ملاقات ایک شخص مسمی ہامن سے ہو گئی جو انگریزی، فرانسیسی اور لاطینی جاننے کے علاوہ عبرانی اور عربی بھی جانتا تھا۔ اس پر مشرقی خیالات کا فی اثر تھا۔ ادب سے بھی دلچسپی رکھتا اور شاعری کے متعلق تو اس کا قول تھا کہ شاعری انسان کی مادری زبان ہے۔ ہامن کی صحبت میں ہرڈر کی ذہنی تربیت ہوئی۔ ہامن نے اسکو انگریزی ادب اور خاص کر شیکسپیئر کی حقیقی روح کا شناس کرا دیا۔ ریگا سے نکلکر وہ فرانس گیا اور وہاں ادب و فنون لطیفہ کا مطالعہ کرتا رہا مگر اس کو فرانس کی علمی آب و ہوا مطلق پسند نہ آئی۔ وہ حقیقت در روح کا متلاشی تھا اور انکا لیکہ فرانس سر تا پا نقل تھا۔ رفتہ رفتہ اُس کو فرانسیسیوں کے ادب اور تمدن سے نفرت ہو گئی کیونکہ فرانسیسی اس کے خیال میں عقلیت کی وبا میں گرفتار ہو کر ہلاکت سے قریب تر ہوتے جاتے تھے جب وہ اپنے وطن آیا تو اُس کی شخصیت تئیس چوبیس برس کی عمر میں علم و فضل کے ساتھ ساتھ ایک وسیع تجربہ کی بھی مالک تھی۔

ہرڈر نے شاعری کے متعلق ہامن کے قول کو خضر راہ بنایا اور ہومر کے مطالعہ سے اُس نے اخذ کیا کہ شاعری اگر عمل کی تعلیم اور اثر اندازی یا دہ سے خالی ہے تو وہ شاعری نہیں ہے یعنی شاعری کیفیات کی ایک ایسی شراب گل رنگ ہے جو لوگوں کو بدمست کرنے کے بجائے اُبھارتی ہے اور ان میں عمل کا جوش پیدا کرتی ہے۔ شاعری کا یہ جوش و خروش غیر مہذب لوگوں میں زیادہ نظر آتا ہے کیونکہ ان میں شاعرانہ ذوق کی تربیت خود فطرت کرتی ہے اسلئے فطرت کے مقابلہ میں فن نہ صرف بیکار بلکہ ننگ راہ ہے اگر کسی قوم کی شاعری کا مطالعہ مقصود ہے تو اُسکے سارے ماحول کا مطالعہ کرنا پڑیگا کیونکہ شاعری ایک بڑی حد تک تجربے علمی اور ذہنی ماحول کا ہی گویا اسکے تاریخی ارتقا کا نظریہ ہے جسکو منضبط کرنے کا سہرا اول اول اسی کے سر ہے۔

"طوفان و ہیجان" کی تحریک میں ظاہر ہوا۔

فرانس کے اثر سے جرمنی میں نقلی کلاسیکی طرز کی پابندی کی جاتی تھی یعنی فرانسیسی یونانی فن کو جس عقلی نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے جرمن بھی اُسی نظر سے دیکھنے لگ گئے۔ اس طرح اصل پر نقل در نقل کا پردہ پڑ گیا۔ ونکلمن، ہینے اور لیسنگ نے یونانیات کا اصل سرچشمہ دریافت کیا۔ اور یونانی حسن کی لطافت، علم کی روشنی اور تمدن کی شیرینی پر نقل سے جو پردہ پڑ گیا تھا اسکو اٹھا دیا۔ ان لوگوں نے اپنی کوششوں سے "جلوۂ طور" کا سامان تو کر دیا مگر احساس و دیدۂ "چشم موسیٰ" کہاں سے لاتے گویا ایک میدان تو تیار ہو گیا مگر گوئے و چوگان والوں کا ہنوز انتظار تھا۔ یعنی خالص تخلیقی ادب ابھی کسی ایسے شخص کا منتظر تھا جو ان لوگوں کے شروع کئے ہوئے کام کو انجام تک پہنچا دے۔

ہم بتا چکے ہیں کہ سی سالہ جنگ کے بعد سے تغزل کا چراغ کسی نہ کسی طرح ٹمٹماتا چلا آ رہا تھا کلوپ شٹاک نے اس میں تیل ڈالکر اسکی روشنی کچھ تیز ضرور کر دی مگر ہرڈر نے ادبی ترقی اور خاصکر شاعری کی ترقی کا راز اسی میں سمجھا کہ اس چراغ کو بھڑکایا جائے۔ اُس نے اپنے نظریہ کے مطابق غیر شعوری روحانی قوتوں کے انضباط پر زور دیا اور احساس کو اپنا راہ نما قرار دیا کیونکہ حرکت کا جوش اور عمل کی سرگرمی انھیں قوتوں کی تابع ہیں۔ اس غیر شعوری قوت اور احساس کو وسعت دینے کے لئے تصوف کی چاشنی کے ساتھ آفتاب و ماہتاب کی دلفریبیوں، بہار و خزاں کی نیرنگیوں غرض مناظر قدرت کی تمام دلچسپیوں سے کام لیا گیا۔ اُسی زمانہ میں اوسیان[1] شائع ہوئی جس سے دلوں کا احساس اور بھی تیز ہو گیا۔ ہومر اور شیکسپیر کی پرستش کا زمانہ آیا۔ عوام

[1] کوئی دو ہزار سال ہوئے کہ شمالی یورپ، شمالی اسکاٹ لینڈ اور شمالی آئرلینڈ کے پہاڑی علاقوں اور وادیوں میں ایک قوم کیلٹ آباد تھی۔ اُس کا مسکن دشوار گذار ہونے کی وجہ سے رومی اثر وہاں تک نہیں پہنچا تھا۔ یہ قوم چھوٹے چھوٹے قبیلوں میں منقسم تھی ہر قبیلہ کا ایک سردار ہوتا جو اپنی رعایا کی باہمی نزاعات کا تصفیہ کرتا اور جنگ کے وقت سپہ سالاری بھی کرتا ہر شخص کی زندگی بہت سادہ تھی۔ بیشتر وقت سیر و شکار میں اور پھر لڑائیوں میں گذرتا تھا۔ چونکہ دور و دراز ملکوں سے وسائل آمد و رفت اچھے نہ تھے اسلئے ان کے رسم و رواج اور اُن کی زبان میں صدیوں تک کوئی فرق نہیں آیا۔ پہاڑوں اور وادیوں میں قدرتی زندگی بسر کرنے کی وجہ سے یہ لوگ فطرتاً بہادر اور شجاع تھے اس لئے ناموری اور شہرت کی بڑی خواہش تھی اور اس مقصد کے لئے ہر دربار میں ایک شاعر ہوتا تھا جو اُن کے آباو اجداد کے رزمیہ کارناموں کو آب و تاب کے ساتھ آئندہ نسلوں تک پہنچاتا ان کے کلام میں گذشتہ دور کی عظمت کے ساتھ ساتھ موجودہ دور کی ناقدری اور بے حسی کا ذکر کچھ اس سوز و گداز سے ہوتا کہ لوگوں کے جذبات میں اشتعال پیدا ہوتا۔ انہی قبیلوں میں سے اسکاٹ لینڈ کے ایک قبیلہ کا سردار فنگل تھا جو شاید تیسری صدی عیسوی میں حکومت کرتا تھا۔ نہایت جری اور شریف النفس تھا۔ اُس کی بہادری کا سکہ تمام ملک پر بیٹھا ہوا تھا غریبوں پر رحم کرتا اور دوستوں پر شفقت کی نظر رکھتا۔ اس کے تین لڑکے اوسیان، فیلان اور راسنو تھے اور تینوں نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی جس سے فنگل کے خاندان کا چراغ بظاہر ہمیشہ کیلئے گل ہو گیا۔ مگر فنگل کو زندہ رکھنے والا اسکا نامور فرزند اوسیان تھا جو بہادر ہونے کے علاوہ اعلیٰ درجہ کا شاعر بھی تھا وہ فنگل کے ساتھ برابر لڑائیوں میں شریک رہا۔

کے گیتوں اور کہانیوں سے لوگوں کی دلچسپی بڑھ گئی افعال واقوال میں جوش و خروش عقائد وخیالات میں تموج کی بنا پڑی۔ قدیم روایات کا سلسلہ جو معاشرت کو مدتوں سے جکڑے چلا آتا تھا ٹوٹ گیا یہ انقلابی دور جس ادب میں "طوفان اور ہیجان" کے نام سے مشہور ہے۔ اس تحریک کے اصول منضبط کرنے والا تو ہرڈر تھا مگر اس کو ادب میں کامیابی کے ساتھ برتنے والا گوئٹے تھا۔

ہرڈر جب اسٹراس برگ آیا تو اُس کے خیالات کی حدبندی اور اُس کے ادبی مقاصد کی نشو ونما ہو چکی تھی گوئٹے اُس کی شہرت سنکر اُس سے ملنے گیا مگر ان دونوں کی طبیعتوں میں بعد المشرقین تھا۔ ہرڈر تنک مزاج، سخت کلام، بدخو اور چڑچڑا تھا۔ اپنے ملنے والوں کو اپنے قائم کردہ معیار کمال سے دیکھتا اور جب ان میں وہ خوبیاں نہ پاتا تو بددل ہو کر برہم ہوتا یہی وجہ ہے کہ وہ تحریک "طوفان و ہیجان" کا بانی ہونے کے باوجود اُس کو انجام تک بخیر و خوبی نہیں پہنچا سکتا تھا۔ علاوہ بریں وہ شاعری میں دلچسپی لیتا تو ضرور تھا مگر خود شاعر نہ تھا اور یہ اُس کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ برخلاف اس کے گوئٹے کی حقیقت کوش طبیعت میں طلب علم کی تمنا خیالات کو سمجھنے اور پرکھنے کی خواہش دوستانہ انداز کے ساتھ رواداری اور درگذر کرنے والا اسلوب تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اُس میں دوسروں کا نقطۂ نظر سمجھنے کے لئے قدرت نے ہمدردی کا عنصر پیدا کیا تھا جو اُسے بہت سی غلط فہمیوں کی خلیج سے بے کھٹکے پار اُتار لیجاتا۔ گوئٹے کے اس انداز طبیعت نے وہ ماحول پیدا کر دیا جس سے ہرڈر سے نبھی اور خوب نبھی مگر کبھی کبھی دوستی اور محبت کے درمیان معاشرت کا علی ایک دور گذر جاتا۔

مدتوں بعد بڑھاپے کی حالت میں جب وہ آنکھوں سے معذور ہو گیا تھا اُس نے اپنے بزرگوں کے کارناموں کو ایک عورت مینا سے نہایت پُردرد طریقہ سے بیان کیا جس سے سینہ بہ سینہ منتقل ہو کر یہ داستان تمام ملک میں پھیل گئی اسکا خلاصہ یہ ہے کہ ایک قبیلہ کا سردار سُوارن آئرلینڈ پر حملہ کرتا ہے۔ کیتھولین جو آئرلینڈ کے نوجوان سردار کا اتالیق ہے، فنگل سے مدد طلب کرتا ہے مگر قبل فنگل کے پہنچنے کے سوارن کیتھولین کو شکست دیدیتا ہے۔ پھر فنگل اپنی کمک لے کر پہنچتا ہے اور پیہم تین سخت خونریز لڑائیوں کے بعد جن میں طرفین کے بہادر اپنی اپنی جوہر داری تیغ کا خوب خوب کمال دکھلاتے ہیں سُوارن کو شکست دیتا ہے۔ سوارن گرفتار ہو کر آتا ہے مگر فنگل سوارن کی بہن کے احسان سے متاثر ہو کر جس نے ایک دفعہ فنگل کی جان بچائی تھی سوارن کو چھوڑ دیتا ہے۔ یہ رزمیہ داستان منظومات ادسیان کے نام سے مشہور ہے اس سے ان قبائل کی تہذیب پر اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً فن جنگ، طریقہ سپاہ، طلبی عزت، دولت کے خیالات اور طرز بود و ماند کا پتہ چلتا ہے۔ پھر دونوں طرف کے بہادروں کی سیرت بھی معلوم ہوتی ہے۔ سوارن مغرور سرکش اور بپھرے ہوئے شیر کی طرح ہے۔ کیتھولین آبرو کا پاس رکھنے والا نڈر سپاہی ہے۔ ان نظموں کے انداز بیان میں نزاکت، رنگینی اور ایک طرح کی عظمت ہے۔ خیالات کو تشبیہ و استعارہ کی رنگ آمیزی کے بعد اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کے سامنے واقعہ کی پوری تصویر آجاے۔ مناظر میں سنسان جنگل، چاندنی رات، دریا کا کنارہ، سبزہ پوش مزارات، کہساروں کی چوٹیاں اور وادیاں اس طرح دکھائی گئی ہیں کہ اُن سے دل پر کافی اثر پڑتا ہے کہیں کہیں ماہتاب و کواکب، وحشت و جبل کو نہایت

اسٹراس برگ میں ہرڈر کوئی سات مہینے رہا اور اس عرصہ میں اُس نے اپنا سارا پیام گوئٹے کے اثر پذیر دل پر نقش کیا اور اُس کے سینہ کو اس امانت کا خزینہ بنایا جو نہ صرف ادب میں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں ایک نئی روح پھونکنے کا باعث ہوا گوئٹے نے بیشک شیکسپیر پڑھا تھا مگر اب تک اُس کے حقیقی مفہوم سے بے خبر تھا مناظر قدرت سے دلچسپی لیتا تھا مگر وہ احساس نہ تھا جس سے دل میں درد پیدا ہوتا ہے، شاعری کرتا مگر فرانسیسیوں کی فنی تقلید کے بندگراں سے اُس کے تخیل کی پرواز وسیع نہ تھی۔ ہرڈر کے فیض صحبت کا یہ اثر ہوا کہ وہ جس چیز کی طلب میں مدتوں سے پریشان اور آشفتہ مزاج رہا کرتا تھا وہ اُسے مل گئی یعنی اُس کو اپنی فطرت کے سربستہ راز کا حال معلوم ہو گیا۔ شیکسپیئر ہومر اور اوسیان کے نکات حل ہو گئے۔ آفتاب و ماہتاب سے سرگوشیاں ہونے لگیں نسیم صبح "دوست" کی پیغامبر بن گئی اور یہ بزم گہ عالم جواب تک بیگانہ تھی رازداری کا دم بھرنے لگی۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

الف۴ احساس کا دریا اس زور شور سے ابلا کہ بند باندھنا مشکل ہو گیا۔ آزادی اور فطرت پرستی اُس کی شاعرانہ زندگی کا اہم جزو بن گئیں۔ ہرڈر کے قول کے مطابق کہ ہر ملک اپنی ہی روایات پر قائم رہ کر شاعری کے میدان میں ترقی کر سکتا ہے، اُس کو اپنی ملکی شاعری اور زبان سے الفت اور فرانسیسیوں سے نفرت ہو گئی اور نفرت کی وجہ بھی تھی یعنی فرانسیسی باوجود جرمنوں کی نقالی کے ان کے ادبی مذاق کو کم درجہ کا سمجھتے تھے

اسٹراس برگ کے زمانہ قیام میں گوئٹے پر ایک تیسرا قابل ذکر اثر بھی پڑا۔ اسٹراس برگ سے ۱۶ میل کے فاصلہ پر بمقام سیسنہائم میں ایک پادری بریون رہتا تھا۔ گوئٹے اکثر اُس سے ملنے جاتا۔ پادری کے کئی لڑکیاں تھیں۔ ان میں فریڈریکے حسن و جمال میں سب پر فوقیت رکھتی تھی اور اس زمانہ میں اپنی پوری رعنائی کے ساتھ میدان شباب میں گامزن تھی گوئٹے نے اس سے

پر اثر طریقہ سے خطاب کیا گیا ہے یہ طرز ادا گو مشرقی اثر سے آزاد سہی مگر مشرقی انداز بیان سے ضرور ملتی جلتی ہے۔

ان افسانوں کا شمالی اسکاٹ لینڈ میں مدتوں سے چرچا چلا آتا تھا۔ ۱۷۶۰ء میں ایک شخص مسمی جیمز میکفرسن ۹۶-۱۷۳۶ نے ان نظموں کو بڑی محنت کے بعد جمع کر کے ان کا انگریزی ترجمہ شایع کیا یہ ترجمہ نہایت مقبول ہوا۔ ناقدین میں دو گروہ ہو گئے ایک تو ان کو مترجم کے دعوی کے مطابق ترجمہ اور دوسرا انکو میکفرسن کی من گھڑت بتاتا۔ قطع نظر اس بحث کے ان نظموں سے اُس زمانہ میں سخت ہیجان برپا ہوا۔ تخیل کو ایک زبردست ایڑ لگی اور اٹھارہویں صدی کی مُردہ زندگی میں کچھ کچھ جان آنے لگی۔ اُس عہد سے تخیل کے زور سے احساسات کو چھیڑ کر رنگ آمیزی کا جو سلسلہ ادب میں شروع ہوتا ہے اوسیان اُس کی ایک نہایت اہم کڑی ہے۔ اوسیان کا یورپ کی متعدد زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ بعضوں نے اوسیان کا موازنہ ہومر سے کیا ہے اور لارڈ بائرن نے تو فنگل کی سیرت کو ہومر کے ہکٹر اور راڈیسیوس سے زیادہ ممتاز بتایا ہے۔ جرمنی کی تحریک طوفان و ہیجان کے چہرہ کی زیبائش میں اوسیان کا کافی جزو ہے۔ گوئٹے خود اسکا بڑا مداح تھا اور ورتھر کے باب دوم میں سیلما کے گیت داخل کر کے اُس نے اوسیان سے اپنی عقیدتمندی کا اظہار کیا ہے

ملتے ہی اپنے دل میں دردِ عشق کی کسک محسوس کی۔ اُدھر فریڈریکے کی چشمِ مست نے اس طائرِ دام پرست کو اسیر کرنے کی کوشش کی جو اینٹے کی قیدِ محبت سے رہائی کے بعد ذرا آزادی کی سانس لے رہا تھا۔ گوئٹے کئی روز پادری کا مہمان رہا چاندنی راتوں میں فریڈریکے کے ساتھ ٹہلنے جاتا اور راستہ میں اُسکی باتیں سنتا جو اتنی پرکیف ہوتیں کہ "رات کی تاریکی کافور ہو جاتی" دن اور رات میں جب کبھی موقع ملتا دونوں تنہائی میں بیٹھ کر نہ ختم ہونے والی گفتگو کا سلسلہ شروع کرتے۔ گوئٹے اس فرصت کی داستان کو برابر طول دینا چاہتا مگر ضروری کاموں کی وجہ سے اُسکو جلدی اسٹراس برگ آنا پڑا۔ لوٹتے وقت اُس کی طبیعت بے حد پریشان تھی۔ اِدھر آب دیدہ اور ادھر حیا نے غمازی کی اور راز آشکار ہو گیا۔ اسٹراس برگ پہونچکر فریڈریکے کو لکھتا ہے کہ "میری نئی دوست! تمہیں اس لقب سے یاد کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔ اگر مجھے آنکھوں کی کیفیت سے بہت کم واقفیت ہوتی تب بھی میں تمہاری پہلی نظر میں محبت کی لگاوٹ کا حال جان جاتا اور دلکا حال تو یقین کے ساتھ کہہ سکتا کیا تمہارے نازک اور اچھے دل کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ مجھ سے بالکل التفات نہ کرے درآنحالیکہ تم مجھ کو جان سے بھی سوا عزیز ہو۔" اسٹراس برگ کے کاموں سے جب کبھی فرصت ملتی گوئٹے فریڈریکے سے آکر ملتا۔ فریڈریکے بھی اس سے محبت کرتی اور اُس کی محبت کا یہ اثر ہوا کہ گوئٹے نے اس زمانہ میں جو غزلیں لکھی ہیں اُن سے تحریک طوفان و ہیجان کا صاف پتہ چلتا ہے یعنی صرف جذبات ہی جذبات ہیں، اصول و قواعد کی پابندیوں سے بڑی حد تک آزادی برتی ہے۔ مزید برآں فریڈریکے کے فیض عشق سے گوئٹے کی دماغی اور ذہنی قوتیں جو پردۂ خفا میں تھیں بروئے کار آنے لگیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر ہرڈر کے اثر کے ساتھ فریڈریکے کی محبت شامل حال نہ ہوتی تو شاید دریا میں وہ جوش اور روانی نہ ہوتی جو بیدا ہوئی۔

جلانا دل کا ہے گویا سراپا نور ہو جانا — یہ پروانہ جو سوزاں ہو تو شمع انجمن بھی ہے

ان دونوں کی الفت کا تقاضا تھا کہ دونوں رشتہ مناکحت میں منسلک ہو کر زندگی کے دشوار گذار مرحلہ کو آسانی طے کرتے مگر عین شباب محبت میں گوئٹے کی وہی پرانی سیرت کی جھلک یعنی بے پروائی و رمیدگی، وہی روح کی بیقراری اور دام سے رہائی کی تڑپ پھر نمودار ہوئی۔ اسی زمانہ میں اتفاق سے فریڈریکے بیمار ہوئی اور معالجوں نے کوئی مہلک عارضہ تجویز کیا۔ گوئٹے کئی بار فریڈریکے کو دیکھنے سیسنہائم گیا۔ مگر اس اُدھیڑبن میں کئی راتیں اُس نے گذاریں کہ چھٹکارے کی کیا صورت ہو۔ آخر اس نے دوٹوک فیصلہ کر لیا کہ فریڈریکے کے ساتھ رہنا محال ہے۔ فریڈریکے کو معلوم ہوا تو وہ دل تھام کر رہ گئی۔ اس نے اس بازیگاہ عشق میں اپنی ساری متاع الفت لگا دی تھی اور نتیجہ کی منتظر تھی کہ یہ زبردست دھکا لگا جس سے شاید وہ پھر اچھی طرح نہیں سنبھلی۔ اس واقعہ کے متعلق گوئٹے اپنی سوانح عمری میں لکھتا ہے کہ "میرے الوداعی خط کے جواب میں فریڈریکے کی تحریر نے میرے دل کو پارہ پارہ کر دیا۔۔۔ آج پہلی دفعہ مجھے اُس کی تکلیفوں کا احساس ہوا۔ مجھے ہمیشہ اُس کی جدائی شاق گذری اور پھر سب سے بڑھکر یہ کہ خود میں نے اپنے ہاتھ سے اپنے

پالوس میں کلہاڑی ماری.... گریٹشن مجھ سے چھین لی گئی، اینٹ بیوفائی اور اس معاملہ میں تو میں خود مورد الزام ہوں مگر کیا کیا جائے انسان کسی نہ کسی طرح صبر کر لیتا ہے" گوئٹے کی سیرت کے اس عجیب وغریب پہلو کا کیا حل ہو سکتا ہے؟ کیا وجہ ہے کہ عین بیقراری کی حالت میں اُس کے عشق کو یک بیک سکون ہوتا نظر آتا ہے؟ بہت سے لوگوں نے طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی ہیں مگر اصلیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ شادی سے اس لئے بھاگتا تھا کہیں اسکی زندگی کی حرکت سکون سے نہ بدل جائے اور اُس نے اپنی زندگی کے لئے جو مقصد قائم کر رکھا تھا اُس کے حصول میں فرق نہ آ جائے۔ اس کے خیال میں شادی سکون کے مترادف تھی اور اپنے مدعا کی تلاش میں اُس کی ہستی ایک تڑپ، ایک بیقراری اور ایک طوفانی کیفیت کی حامل تھی۔ بھلا یہ دونوں چیزیں کیسے ایک جگہ جمع ہو سکتیں۔ ٹھیک یہی بات برنارڈ شا اپنے ایک ڈرامہ میں یوں ادا کرتا ہے کہ "اگر میں شادی کر لوں تو میں بجائے زمانہ مستقبل کے زمانہ ماضی کا آدمی ہو جاؤنگا" بہر حال جب فریڈریکے سے جدائی ہو گئی تو اُسکا جوش سکون سے بدل گیا اور طبیعت میں کچھ اداسی چھا گئی اور اس اُداسی سے شاید اس کو اپنی قوت شعریہ کے بڑھانے میں کافی مدد ملی۔ آخر اُس نے اشٹراس برگ کی یونیورسٹی میں اپنا خاص مضمون پیش کیا اور وکالت کی سند لیکر اگست ۱۷۷۱ء میں مکان واپس گیا۔

گوئٹے گھر لوٹا تو وکیل بن کر آیا اور باپ کے نقش قدم پر چل کر اُس نے وکالت بھی شروع کر دی مگر وکالت میں اسکا بالکل جی نہیں لگتا تھا۔ وہ ادبی دلچسپیوں میں منہمک ہو گیا۔ اشٹراس برگ ہی میں اس کو فاؤسٹ اور گوتس کے پرانے قصوں کو از سر نو ڈرامہ کی شکل میں لکھنے کا خیال ہوا تھا۔ گو وطن واپس آ کر فاؤسٹ کا خیال اُس نے فی الحال ملتوی کر دیا مگر گوتس کا خاکہ ذہن میں سوچنے لگا۔ پھر تھوڑا سا لکھا بھی اور پھر چھ ہفتہ کی مسلسل محنت کے بعد ۱۷۷۱ء کے آواخر میں اُسکو ختم کر دیا۔ گوتس ۱۷۷۳ء میں شایع ہوا۔ گوتس کے قصہ کا سرا جرمنی کی سولہویں صدی کی تاریخ میں ملتا ہے۔ گوئٹے نے اس قصہ کو پر اثر اور ڈرامہ کے لائق بنانے کیلئے کہیں کہیں تصرف بھی کیا ہے اور دلچسپی کی خاطر عشق و محبت کی چاشنی بھی دیدی ہے۔ گوتس فان برلی شنگن سولہویں صدی کا ایک لڑاکا جنگجو تعلقہ دار ہے جو اپنے اوپر صرف شہنشاہ کی حکومت تو تسلیم کرتا ہے مگر دوسرے تعلقہ داروں سے برابر لڑتا بھڑتا رہتا ہے اُس کی نشو ونما گویا جنگ ہی کے لئے ہوئی ہے۔ اُس کے توانا بازوؤں میں وہ طاقت ہے کہ بڑے بڑے دشمن اُسکا لوہا مانتے ہیں۔ فن حرب کے تمام اُصول اُس نے فطرت سے سیکھے ہیں اس کی لڑائی کا مقصد صرف غریبوں اور مظلوموں کی مدد کرنا ہے۔ انکی خاطر وہ ہر طرح کی مصیبتیں جھیلنے اور ان کو دکھ درد سے چھڑانے کے لئے ہر قسم کی سختیاں برداشت کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ ایک دفعہ وہ قید بھی ہوتا ہے مگر چھوٹ کر پھر لڑتا ہے اور لڑتے لڑتے مارا جاتا ہے۔ گوتس کی بہادری اور نیکی دکھا کر گوئٹے فطرت کو اکتساب پر ترجیح دیتا ہے، خاندانی و نسلی روایات کے مقابلہ میں آزادی کو

سراہتا ہے اور جماعت کے سامنے فرد کی کوششوں کو لائق تحسین قرار دیتا ہے۔ اس ڈرامہ میں اُس نے نوجوانوں کو زندگی کے لئے ایک ایسے اعلیٰ اخلاقی نصب العین قائم کرنے اور اُس کی طلب میں فنا ہو جانے کی تلقین کی ہے جس کی بنیاد آزادی اور فطرت پرستی پر ہو یعنی وہ بہادری، سچائی، رحم اور نیکی کو جو انسان کی اندرونی زندگی کا مظہر ہوں، تمدن کی بناوٹی زندگی کے مقابلہ میں صد آفریں کہتا ہے۔ "طوفان و ہیجان" کے خط و خال اس ڈرامہ میں مکمل طور پر نمایاں ہیں یعنی آزادی، فطرت پرستی، جوش عمل، خلوص، راستبازی اور احساس۔ اب تک ڈرامہ میں فرانسیسیوں کی تقلید سے زمان و مکان و کردار کی ہم آہنگی چلی آتی تھی مگر گوئٹے نے اس رواج کو توڑ ڈالا کیونکہ کسی شخص کی مکمل فطری زندگی دکھانے کے لئے زمان و مکان و کردار کی ہم آہنگی بیان میں حارج ہوتی ہے جب یہ ڈرامہ شایع ہوا تو عام طور پر بہت مقبول ہوا۔ نوجوانوں نے بڑھکر بڑے جوش و خروش کے ساتھ اُس کا خیر مقدم کیا کیونکہ یہ ان کے لئے آزادی کا علمبردار اور عمل کا صور تھا۔ انگلستان میں اسکاٹ کے مشہور قصوں پر اس کا اثر صاف ظاہر ہوتا ہے۔

اس کے بعد گوئٹے جرمن طرز عمارت، شیکسپیئر، پنڈار اور دیگر شعراء کے کلام پر تنقید لکھنے اور شایع کرنے میں مصروف ہو گیا۔ ساتھ ساتھ رسالوں میں کتابوں اور رسالوں پر ریویو بھی کرتا۔ اُس کی زندگی مہینوں اسی طرح گذرتی رہی۔ قانون کی محنت اُس کے لئے ہرن پر گھاس لادنے والی مثل کی طرح تھی۔ وطن بھی اُسکو طبعاً ناپسند تھا۔ باپ نے دیکھا کہ بیٹے کا جی یہاں نہیں لگتا اور کچھ اس خیال سے کہ اگر کسی بڑی جگہ وکالت کرے تو شاید ترقی کے اچھے ذرائع نکلیں بیٹے سے ویزلر کی عدالت العالیہ میں جاکر وکالت کرنے کے لئے کہا۔ گوئٹے نے جو فرینکفورٹ سے باہر جانے کا نام سنا تو فوراً راضی ہو گیا اور مئی ۱۷۷۲ء میں ویزلر چلا گیا۔

گوئٹے جب ویزلر پہنچا تو اُس کی عمر ۲۳ برس کی تھی۔ ظاہرا تو وہ وکالت کرنے کے ارادہ سے آیا تھا مگر باپ کے سامنے سے ہٹا تو ہومر اور پنڈار پڑھنا شروع کر دیا۔ قانون کے بجائے ادب اسکا میدان عمل بنا۔ پھر عدالت العالیہ کی حالت خود ایسی ناگفتہ بہ تھی کہ گوئٹے اس طرف راغب بھی نہیں ہوا۔ تنہا طبیعت گھبراتی تھی کہ اتنے میں کچھ زندہ دلوں کی سوسائٹی میں اُسکا داخلہ ہو گیا۔ یہ سوسائٹی گویا ایک گول میز کلب تھی جس کے ہر ممبر کا ایک مخصوص نام ہوتا۔ گوئٹے کا نام گوئتس فان برلی شنگن پڑ گیا۔ اس کلب کے بہت سے ممبر تھے جن میں قابل ذکر نوجوان یروشلم ہے جو برنسوک کے سفارتخانہ کا منشی تھا اور جس سے گوئٹے سے بہت جلد دوستی ہو گئی۔

ویزلر ہی وہ مقام ہے جہاں "ورتھر" کے افسانہ کی بنا پڑی۔ یوں تو گوئٹے کی تمام تصنیفات میں اُسکی زندگی کے جستہ جستہ واقعات شامل ہیں مگر "ورتھر" میں جیسا کہ اُس کے سوانح نگاروں کا خیال ہے اُس کی

سوانح عمری کی جتنی صاف جھلک نظر آتی ہے اتنی اسکی اور کسی تصنیف میں موجود نہیں۔ ایک ایک واقعہ کی تفصیل کی جو "ورتھر" میں موجود ہے اُس کے حالات زندگی سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ویزلر کا شہر صاف ستھرا نہیں تھا اس لئے گوئٹے زیادہ وقت شہر کے باہر سیر و تفریح میں گذارتا جہاں کیفیت یہ ہوتی کہ "جس درخت کو دیکھو پھولوں سے لدا ہوا ہے اور اس بہشت زار میں بس یہی خواہش ہوتی کہ کسی طرح تتلی بنکر اس معطر فضا میں پرواز کیجائے۔" "ورتھر" کے ابتدائی حصہ میں جس مقام کی دلچسپیوں اور مناظر قدرت کی دلفریبیوں کا ذکر ہے وہ دراصل ویزلر ہی ہے پھر جس چشمہ کا ذکر ہے وہ بھی ویزلر کے باہر ہے اور وہ باغ و وادی بھی پاس ہی موجود ہے کبھی کبھی لمبی سیر کرتے کرتے وہ دور گاربنہائم کے موضع تک نکل جاتا جس کو "ورتھر" میں والہائم کے نام سے پکارتا ہے۔ وہاں وہ جاکر نیبو کے درختوں کے نیچے بیٹھکر چائے اور قہوہ پیتا۔ پہلی دفعہ جب وہ گاربنہائم گیا تھا تو راستہ میں اسکو تین بچے ملے تھے جن میں سب سے چھوٹا چھ مہینہ کا تھا اور ہر ایک کو اُس نے ایک کریوزر دیا۔ یہ واقعہ "ورتھر" میں خفیف سے تغیر کے ساتھ درج ہے۔

ویزلر آنے کے دو تین ہفتہ بعد اُس کی ملاقات کیسٹنر سے ہوئی جو ڈیوک آف بریمن کے سفیر کا سکریٹری تھا مگر کام کی زیادتی کی وجہ سے گول میز کلب کی رکنیت سے علیحدہ ہو گیا تھا۔ کیسٹنر گوئٹے سے آٹھ سال بڑا تھا۔ متین اور ذرا خشک مزاج تھا مگر طبیعت بہت سلجھی ہوئی تھی اور اپنے کام میں بڑا ہوشیار تھا۔ کیسٹنر گوئٹے سے ملکر بہت خوش ہوا اور جلدی دونوں دوست ہو گئے۔ کیسٹنر نے گوئٹے کے ابتدائی قیام کا حال ایک دوست کو لکھا جس سے گوئٹے کے اس زمانہ کی ذہنی حالت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "موسم بہار میں یہاں ایک صاحب گوئٹے آئے ہیں۔ عمر قریب ۲۳ سال کے ہوگی۔ کسی امیر آدمی کے لڑکے ہیں۔ یہاں وکالت میں تجربہ حاصل کرنے آئے ہیں۔۔۔۔ آدمی بہت قابل ہیں۔۔۔۔ ان کے تخیل میں کافی رنگینی ہے اور اس لئے وہ ہر چیز کا اظہار تشبیہ اور استعارہ میں کرتے ہیں۔۔۔۔ ان کے جذبات میں جوش بہت ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ اپنے اوپر قابو رکھنے کی بھی صلاحیت ہے۔ ان کو نہ تو آبرو، نہ رواج اور نہ فیشن کا خیال ہے۔ جو جی میں آتا ہے کرتے ہیں۔ پابندیوں سے ان کو سخت نفرت ہے۔۔۔۔ انکا ابھی کوئی اُصول نہیں مگر رفتہ رفتہ وہ کوئی نہ کوئی اُصول ضرور بنالیں گے روسو کے متعلق انکا خیال اچھا ہے مگر اس کی وہ اندھا دھند پرستش نہیں کرتے۔۔۔۔ وہ شک و شبہہ سے بھاگتے ہیں اور چند اصولی باتوں میں سچائی اور حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔۔۔۔ وہ نہ تو گرجا جاتے ہیں اور نہ کسی عبادت میں شریک ہوتے ہیں کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ میں عبادت کرکے ریاکار نہیں بننا چاہتا۔ عیسائی مذہب سے ان کو بے شک محبت ہے مگر اس رنگ کو پسند نہیں کرتے جس میں ہمارے پادری پیش کرتے ہیں۔

معاد اور حیات بعد الممات میں ایک بہتر روحانی نظام کے قائل ہیں۔ وہ سچائی اور حقیقت کے متلاشی ہیں لیکن اسکے اظہار سے زیادہ وہ اندرونی جذبہ کی قدر کرتے ہیں۔ اتنی کم عمر میں انھوں نے بہت کچھ پڑھا ہے۔ معلومات بھی بہت وسیع ہیں۔ لیکن ان سب سے زیادہ قابل ذکر یہ بات ہے کہ وہ غور و فکر کے عادی ہیں۔ روٹی کمانے والے علوم کے علاوہ انکو تمام علوم سے دلچسپی ہے"۔

اُس زمانہ میں ویزلر کے ایک مشہور شہری مسٹر بف کی لڑکی شارلٹ بف سے گوئٹے کی ملاقات ہوئی شارلٹ جوالٹے اور لاٹشن کے نام سے بھی پکاری جاتی تھی حسین، نازک اندام، خوش باش اور خوش مزاج لڑکی تھی۔ علم کا اُسے کوئی خاص شوق نہ تھا مگر کچھ نہ کچھ پڑھنے کی عادی تھی۔ اُسکا زیادہ تر وقت گھر کے دھندوں میں گذرتا تھا۔ دو سال اُس کی ماں کے انتقال کو ہوئے تھے اور اُسی وقت سے سولہ سال کے سن میں گھر کا سارا کام اُس کو سنبھالنا پڑا۔ اتنے بڑے کنبہ میں جس میں کئی بچے ہوں، بچوں کی دیکھ بھال ان کی پرورش، گھر کی صفائی اور چولھے برتن کا سارا کام اُسی کی نگرانی میں ہوتا تھا مگر گھر کے ان کاموں سے اور لڑکوں کے شور و شغب سے اسکے پرسکون ماتھے پر کبھی بل نہیں آیا۔

گوئٹے کی ملاقات شارلٹ سے ایک رقص کے موقع پر ہوئی جو مقام ولپر ٹھوزان میں منعقد ہوا تھا۔ ولپر ٹھوزان ویزلر سے ڈیڑھ گھنٹہ کا راستہ ہے۔ کیسٹنر بھی اس رقص میں مدعو تھا مگر اس کو وہاں پہنچنے میں کچھ دیر ہو گئی تھی البتہ شارلٹ اپنے چند دوستوں کے ساتھ پہلے پہنچ گئی تھی۔ شارلٹ جس طرح رقص میں پہنچی ہے اُس کا پورا حال "ورتھر" میں درج ہے۔ جب کیسٹنر آیا تو گوئٹے اس سے ملا۔ کیسٹنر ایک خط میں اس ملاقات کا حال یوں لکھتا ہے کہ "گوئٹے ایک گاؤں میں رقص کی شرکت کے لئے گیا تھا۔ میں اور میری منسوبہ بھی وہاں موجود تھے .... وہ بڑا قابل آدمی ہے طبعی اور اخلاقی لحاظ سے اُس نے فطرت کے مطالعہ کو اپنا خاص شعار بنالیا ہے اور ان دونوں صورتوں میں حسن کا جویا رہتا ہے۔ وہاں کسی عورت سے مل کر اُس کو خوشی نہیں ہوئی مگر شارلٹ نے پہلی ہی دفعہ اُس کی توجہ اپنی طرف جذب کرلی۔ شارلٹ میں جوانی کی اُمنگ ہے اور گو بہت حسین نہ سہی مگر کافی حسین ہے۔ اُس کی نظر میں موسم بہار کی سی شگفتگی ہے مگر اُس روز تو رقص کی وجہ سے خاص طور پر تھی کیونکہ وہ رقص کو پسند کرتی ہے۔ وہ سادہ لباس زیب تن کئے ہوئے تھی اور بہت خوش تھی.... گوئٹے کو اس بات کا مطلق علم نہ تھا کہ وہ کسی سے منسوب ہے۔ میں کئی گھنٹے بعد پہنچا۔ ہم لوگوں میں یہ رسم ہے کہ سب کے سامنے اپنی منسوبہ سے سوائے معمولی دوستی کے اور کسی چیز کا اظہار نہیں کرتے (جس سے شاید گوئٹے کو غلط فہمی ہوئی)، وہ بھی اسوقت بہت خوش تھا حالانکہ بعض وقت ملول رہتا ہے۔ شارلٹ رقص میں کچھ اس ادا سے معروف تھی اور اپنے کو بھول بیٹھی تھی کہ گوئٹے کی آنکھوں میں کھب گئی

دوسرے روز گوئٹے اُس سے ملنے آیا۔ رقص کے موقع پر تو اُس نے شارلٹ کو ایک خوش باش اور مشتاق رقص عورت کے طور پر دیکھا لیکن اب اُس نے اُس کو بالکل دوسرے اور بہتر رنگ میں دیکھا یعنی وہ گھر کے کاروبار میں مشغول تھی۔" شارلٹ کے اس رقص نے پھر اس چنگاری کو ہوا دیدی جو فریڈیکے کی جدائی کے بعد گوئٹے کے دل میں دبی ہوئی تھی یعنی وہ پھر پروانہ وار شارلٹ کے شمع حسن پر نثار ہونے کے لئے آگے بڑھا۔ اسی واردات قلب کی داستان اُس نے تھوڑے سے تغیر و تبدل کے بعد ورتھر کی زبان سے ادا کی ہے۔

اپنی سوانح عمری میں لکھتا ہے کہ لاٹشن کی طبیعت میں سادگی تھی۔ اول تو خود اُس کی طبیعت سادہ تھی دوسرے اُس نے ایسے شخص سے محبت کرنا شروع کی تھی جو ہر طرح اُس کے لائق تھا اور جو ہر سرد و گرم میں اُسکا رفیق بننے پر تیار تھا۔۔۔ اُس نے اپنے چاروں طرف مسرت و انبساط کی فضا پیدا کر لی تھی ۔۔۔ نئے ملاقاتی (اپنی طرف اشارہ ہے) نے اوّل اوّل اپنی پُرانی روش پر چلنا شروع کیا مگر جلد ہی اُس کی عشوہ و ناز کا اسیر ہو گیا اور پھر وہ دونوں (شارلٹ اور کیسٹنر) اس کے ساتھ محبت اور دوستی کا ایسا برتاؤ کرتے کہ وہ اپنے کو بھول گیا۔ تخیل پسند اور یک گونہ کاہل ہونے کی وجہ سے وہ حال سے دل برداشتہ تھا۔ اسکو لاٹشن میں ایک دوست کی ساری خصوصیات نظر آتی تھیں گو لاٹشن مستقبل سے بے پروانہ تھی مگر حال سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھی۔ اُس نے اِس ملاقاتی کی دوستی سے لطف اُٹھایا اور وہ ملاقاتی بھی اُس کی عدم موجودگی کو محسوس کرتا۔۔۔ کچھ دنوں بعد میدان و باغ کی سیر میں دونوں ساتھ رہنے لگے ۔۔۔۔ کبھی کبھی لاٹشن کا منگیتر بھی ساتھ ہو لیتا مگر ان تینوں کو مطلق خبر نہیں ہوئی کہ تینوں کس طرح ایک دوسرے کے دوست ہو گئے۔"

چونکہ گوئٹے کو ویزلر میں کوئی خاص کام نہ تھا اسلئے زیادہ تر وقت لاٹشن کے ساتھ ہی گذارتا۔ وہاں بچوں کے ساتھ خوب کھیلتا چنانچہ ورتھر کی زبان سے ایک جگہ کہتا ہے کہ " مجھے یہاں کے سب لوگ خاصکر بچے بخوبی جان گئے ہیں اور مجھ سے محبت کرتے ہیں"۔ ان حالات میں گوئٹے شارلٹ کے دل میں اپنی محبت استوار کرنا چاہتا تھا مگر شارلٹ کیسٹنر کی منسوبہ ہونے کی وجہ سے اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتی تھی اور وہ کوئی ایسا قدم نہیں اُٹھانا چاہتی تھی جس سے کسی قسم کی غلط فہمی کا اندیشہ ہو۔

کیسٹنر اپنے ایک خط میں لکھتا ہے کہ گوئٹے کو یہ معلوم کرنے میں زیادہ دن نہیں لگے کہ لاٹشن اُس کی محض دوست ہو سکتی ہے۔ لاٹشن کا برتاؤ گوئٹے کے ساتھ نہایت عمدہ تھا۔ ہم لوگوں میں مذاق کی یکجہتی اور ان دونوں کے آپس کے میل جول سے ہم لوگ دوست ہو گئے۔ گوئٹے حالانکہ لاٹشن کی طرف سے مایوس ہو کر دست بردار ہو چکا تھا مگر اپنے جذبات کو باوجود اپنی فلسفہ دانی اور اپنی طبیعت کے فطری وقار کے اچھی طرح نہ دبا سکا۔ اس میں چند ایسی

خصوصیات ہیں جو حساس اور با مذاق عورتوں کے لئے سخت خطرہ کا باعث ہیں۔ لاٹشن اُس سے اول ہی روز سے ایسا برتاؤ کرتی جس سے گوئٹے کے دل میں کسی قسم کی نازیبا اُمید پیدا ہونے کا نہ تو کوئی امکان ہو اور نہ دوستانہ رویہ میں کوئی فرق آئے مگر گوئٹے کا دماغی سکون اور دلی اطمینان اتنے ہی میں رخصت ہو گیا بعض وقت تو ایسے مواقع بھی پیش آئے جس نے مجھے لاٹشن کو بے اختیار سراہنے پر مجبور کر دیا، اور جس سے اُس کی محبت میرے دل میں اور بڑھ گئی۔۔۔۔

مجھ کو یہ دیکھکر تعجب ہوتا تھا کہ محبت بھی کیا بلا ہوتی ہے جو ایسے بھلے چنگے اور ضبط نفس والوں کو دیوانہ بنا دیتی ہے۔ کبھی مجھے یہ خیال ہوتا کہ میں لاٹشن کو اتنا خوش نہیں رکھ سکتا جتنا گوئٹے رکھ سکے گا لیکن پھر اُس کے چھوڑنے کے خیال تک کو گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ اس کشاکش میں یہی آخری خیال کامیاب رہتا مگر میں لاٹشن میں اس کشاکش کا ذرا سا شائبہ تک نہیں دیکھتا تھا۔" ایک دفعہ گوئٹے اور لاٹشن میں بوس وکنار کی بھی نوبت آگئی تھی جس کو لاٹشن نے فی الفور کیسٹنر سے کہدیا مگر کیسٹنر نے تھوڑے سے اظہار ناراضگی کے بعد اُسکو درگذر کیا۔ دوسرے روز لاٹشن نے گوئٹے کو نہایت نرمی سے اُسکی بے اعتدالیوں پر نصیحت کی۔ گوئٹے کی اس والہانہ محبت سے گوئٹے اور کیسٹنر کے درمیان کوئی رقابت کا جذبہ نہیں پیدا ہوا بلکہ شرافت کی وجہ سے دونوں کی دوستی بدستور جاری رہی۔ البتہ یہ معاملہ اس لحاظ سے ذرا نازک تھا کہ کیسٹنر ابھی باقاعدہ رشتۂ مناکحت میں منسلک نہیں ہوا تھا اور اس گو مگو کے عالم میں اس کو نتیجہ کی طرف سے ضرور اندیشہ ہونا چاہئے تھا۔ ۲۸ اگست کو اتفاق سے کیسٹنر اور گوئٹے دونوں کی سالگرہ تھی۔ اُس دن کیسٹنر نے گوئٹے کے پاس ہومر مؤلفۂ ویٹسٹائن کا ایک نسخہ تحفتاً بھیجا جس کا ذکر ورتھر میں موجود ہے۔

آخر کار جب عشق کی آگ بہت بھڑکی اور گوئٹے ڈرا کہ اسکے شعلے سے کہیں کیسٹنر اور لاٹشن کو نقصان نہ پہنچ جاے تو وہ یکایک ویزلر سے کسی سے ملے بغیر چلا آیا۔ آنے سے ایک روز قبل باتوں باتوں میں حیات بعد الممات کا ذکر لاٹشن سے چھڑ گیا۔ پھر لاٹشن نے اسی سلسلہ میں اپنی والدہ کی موت کا حال بیان کیا۔ یہ سارا ماجرا مع گوئٹے کے سوال و جواب کے ٹھیک اُسی روز کی تاریخ میں یعنی ۱۰ ستمبر کے خط میں "ورتھر" میں درج ہے۔ لاٹشن سے آخری بار ملکر گوئٹے گھر آیا اور اس نے ایک خط کیسٹنر کو اور ایک لاٹشن کو لکھا جو اُس کی روانگی کے بعد دیا جانے والا تھا۔ کیسٹنر کے خط میں لکھا ہے کہ "وہ چلا گیا اور جب یہ خط تم کو ملے گا تو وہ جا چکا ہوگا۔ لاٹشن کو ساتھ والا خط دیدینا۔ میری طبیعت میں سکون تھا لیکن تمہاری گفتگو سے تو میرا دل دو نیم ہو گیا۔ اس وقت میں تم سے سوائے الوداع کے اور کیا کہوں اگر تمہارے ساتھ ذرا دیر اور رہتا تو میں اپنے کو بالکل نہ سنبھال سکتا۔ اس وقت میں بالکل تنہا ہوں اور کل یہاں سے چلا جاؤنگا۔" لاٹشن والے خط میں تھا کہ "تمہاری گفتگو سن کر میرا دل بھر آیا خاص کر جب میں سوچتا تھا کہ تم سے آخری بار مل رہا ہوں۔۔۔۔ آخر کون سی بات تھی جس سے تم ایسے مسئلہ پر گفتگو کرنے لگیں تھیں؟ لیکن اس سے

مجھے اپنے دل کی بات کہنے کا موقع مل گیا ... اف وہ تمہارا کمرہ، اب میں وہاں نہیں جاؤنگا تمھارے اباجان مجھے دروازہ تک پہنچانے آئے تھے۔ میں اسوقت تنہا ہوں اور رونے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن تمہیں مسرور اور خوش باش چھوڑ کر جاتا ہوں ... میں تم سے پھر ملونگا ــ لیکن "کل نہیں" جس کا مطلب یہ ہے کہ کبھی نہیں۔ بچوں سے کہنا کہ وہ چلا گیا۔ اب اس سے زیادہ لکھنے کی تاب نہیں" دوسرے روز صبح کو چلتے وقت اُس نے لاٹشن کو ایک خط اور لکھا اور پھر ویزلر میں چار ماہ رہنے کے بعد کیسٹنر اور لاٹشن دونوں سے جدا ہو گیا۔ روانگی کے دن اور اُس سے ایک روز قبل کا حال کیسٹنر کے روزنامچہ سے معلوم ہوتا ہے :ــ

"۱۰ ستمبر ۱۷۷۲ء۔ آج ڈاکٹر گوئٹے نے میرے ساتھ باغ میں کھانا کھایا۔ شام کو وہ مجھ سے ملنے آئے۔ وہ، لاٹشن اور ہم تینوں حیات بعد الممات پر بڑی دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ گفتگو لاٹشن نے شروع کی تھی۔ بعد کو ہم لوگوں میں طے ہوا کہ جو ہم میں سے پہلے اس دنیا سے کوچ کرے وہ اپنے بقیہ دوستوں کے پاس اپنی نئی زندگی کی خبر بھیجے۔ گوئٹے بہت افسردہ دل تھا کیونکہ اس نے دوسرے روز جانے کا ارادہ کر لیا تھا"

۱۱ ستمبر ۱۷۷۲ء۔ آج صبح گوئٹے بغیر ہم لوگوں سے ملے چلا گیا۔ چلتے وقت اُس نے ایک خط مع چند کتابوں کے بھیجا۔ اس کے اس طرح چلے جانے سے مجھے کوئی تعجب نہیں ہوا کیونکہ اس نے کہہ رکھا تھا کہ وہ ایک دن اسی طرح چلا جائیگا لیکن اس کے باوجود مجھے یقین نہ آتا تھا ــ اُس کے اس فعل سے مجھے کافی روحانی تکلیف ہوئی ... ہر بچہ کی زبان پر یہی تھا کہ ڈاکٹر گوئٹے چلے گئے ... گوئٹے بہت افسردہ دلی کی حالت میں گیا ہے ... شام کو اُس کا خط میں نے لاٹشن کو دیا۔ وہ بھی گوئٹے کے چلے جانے سے رنجیدہ ہوئی اور خط پڑھتے پڑھتے تو آنسوؤں کے بے اختیار قطرے اُس کی آنکھوں سے ٹپک پڑے۔ مگر وہ ایک طرح سے مطمئن تھی کیونکہ وہ گوئٹے کی مرضی کے مطابق عمل نہیں کر سکتی تھی ...." الف ۵

گوئٹے لوٹ کر فرینکفورٹ آیا تو عشق کی ایک زندہ داستان بن کر آیا مگر دوست احباب کے بیکاری کے طعنے اور شارلٹ کی جدائی کے غم نے ایک سوہان روح پیدا کر دیا تھا۔ اسی عالم میں وہ نقاشی اور مصوری کی طرف پھر رجوع ہوا تاکہ طبیعت کسی طرح لگ جائے۔ کبھی کبھی سیر و تفریح بھی کرتا اور بعد کو تو ان مشغلوں میں اتنا منہمک ہوا کہ ادب کو بالکل بھلا بیٹھا۔ البتہ جون ۱۷۷۳ء میں اپنے دوست مرک کے مشورہ سے اُس نے گوتس شایع کیا۔ گوتس شایع ہونے کے بعد ویزلر کی زندگی کی یاد اُس کو رہ رہ کر ستاتی۔ اس تکلیف کو دور کرنے کے لئے اُس نے ارادہ کیا کہ ویزلر کے حالات ایک قصہ کے پیرایہ میں لکھ کر دنیا کے سامنے پیش کرے۔ تھوڑے دنوں بعد اُس نے اپنی مشہور تصنیف "نوجوان ورتھر کی داستان غم" شایع کی جس میں تھوڑے سے تغیر و تبدل کے بعد اُس نے اپنے ویزلر کے فرصت کے

دلوں کی تصویر کھینچی ہے۔ "ورتھر" ہی ہمارا موضوع بحث اس لئے اُس پر تفصیل کے ساتھ ہم آگے چلکر لکھیں گے۔

"ورتھر" شایع ہونے کے بعد گوئٹے دنیائے ادب کی ایک نہایت ممتاز و معروف شخصیت کا مالک ہوگیا۔ بڑے بڑے نامور اہل قلم دور دور سے "ورتھر" کے مصنف سے ملنے آتے اور اُس کی خداداد قابلیت کا برملا اعتراف کرتے۔ اس کا مکان پرستاران ادب کا مرجع بن گیا۔ "گوئٹس" نے جرمنی میں اور "ورتھر" نے یورپ میں ایک دھوم مچادی۔ یہ زمانہ گوئٹے کی انتہائی شہرت کا زمانہ تھا اور اُس زمانہ میں اُس کی طبیعت میں بلا کا جوش اور غضب کی روانی پیدا ہوگئی تھی۔ خیالات کا طوفان اتنا اُمڈا کہ قلم اس بارگراں کا متحمل نہ ہوسکا تاہم اُس نے نثر و نظم دونوں لکھی اور بہت لکھی۔

مئی ۱۷۷۴ء میں اُسکا ڈرامہ کلاویگو شایع ہوا جس کو اُس نے چند گھنٹوں میں بیٹھ کر لکھا تھا۔ کلاویگو ایک نوجوان ہے جو اپنے مقاصد کی خاطر اپنی محبوبہ میری سے جو کسی سینہ کے مرض میں مبتلا ہے علیحدگی اختیار کرلیتا ہے مگر میری اسکی علیحدگی پر اُس سے اور زیادہ محبت کرنے لگتی ہے۔ آخر میری انتقال کرتی ہے اور کلاویگو اُسکے جنازے پر جان دیتا ہے۔ کلاویگو گوئٹے اور فریڈریکے کی محبت کا ایک ادبی پردہ ہے جس کی آڑ میں گوئٹے خود اپنا درد دل سناتا ہے اور اپنی بے پروائی اور بے رخی پر افسوس کرکے کلاویگو کو موت کے منہ میں لے جاتا ہے۔ یہ ڈرامہ اس لحاظ سے اہم کہا جاسکتا ہے کہ اس میں "طوفان و ہیجان" کے دور کی خصوصیات کا اظہار بہت کم ہے۔

گوئٹے کو رسمی فلسفہ سے طبعی نفرت تھی مگر ۱۷۷۴ء اس لحاظ سے اُس کے روحانی ارتقار کی ایک اہم کڑی ہے کہ اس نے اُس سال مشہور یہودی فلسفی اسپنوزا کی "اخلاقیات" کا مطالعہ کیا اور اس سے اتنا متاثر ہوا کہ اپنی سوانح عمری میں لکھتا ہے "کہ اُس کے پڑھنے سے کائنات اور علم اخلاق کے متعلق میری معلومات میں صفائی اور وسعت آنے لگی لیکن اس کی جو چیز مجھے نہایت پسند آئی وہ اُس کی غیر جانبداری تھی۔ کیا خوب کہتا ہے کہ جو خدا سے سچی محبت کرتا ہے اسکو پھر اس بات کا خیال چھوڑ دینا چاہئے کہ خدا بھی اس سے محبت کرتا ہے یا نہیں"۔ اسپنوزا کے اس فقرہ نے گوئٹے پر گویا جادو کا اثر کیا اور وہ اس کا ہمیشہ کے لئے عقیدتمند ہوگیا۔ غرض یہ سال پڑھنے لکھنے، ملنے ملانے میں گذر رہا تھا کہ ۱۱ر دسمبر کو وائمر کے دو شاہزادے اُس کی ادبی شہرت سن کر ملنے آئے اور ان میں بڑا کارل آگسٹ تو گوئٹے کا اتنا گرویدہ ہوگیا کہ اُس نے اسکو وائمر آنے کی دعوت بھی دیدی۔ مگر گوئٹے کسی وجہ سے فوراً وائمر نہ جا سکا۔

فرینکفورٹ کے قیام کا آخری زمانہ ہے کہ نئے سال کے دن ایک دوست کی وساطت سے گوئٹے ایک مالدار ساہوکار کی بیوہ فراؤ شوئن من کے یہاں مدعو ہوا۔ اُس کے چار لڑکے اور ۱۷ سال کی ایک خوبصورت لڑکی الینر بیتھ تھی جو لیلی کے نام سے پکاری جاتی تھی۔ دعوت ایک رقص کے سلسلہ میں ہوئی تھی جس میں بہت سے لوگ مدعو تھے۔ گوئٹے جب پہنچا تو لیلی پیانو بجا رہی تھی۔ گوئٹے کو طبعاً موسیقی سے دلچسپی تھی اسلئے وہ پیانو کے پاس بیٹھکر نغمہ سے لطف اُٹھانے لگا

مگر تھوڑی دیر کے بعد اُس کو معلوم ہوا کہ لیلی کی ہر انگلی بجائے پیانو کے اُس کے ساز دل کو چھیڑ رہی ہے۔ پیانو بجا کر لیلی اُٹھی تو گوئٹے کا دل اپنی مٹھی میں لے کر اُٹھی۔ گوئٹے اُس پر ہزار جان سے عاشق اور اُس کی بیقراری اتنی بڑھی کہ ویزلر کے زمانہ کا جوش و خروش ماند پڑ گیا۔ لیلی کی چشم مست کے پیچھے گوئٹے اپنا سارا عیش و آرام بھول گیا۔ لیلی ایک مہذب اور تربیت یافتہ لڑکی تھی۔ گوئٹے کو اُس کی آشفتگی پر اکثر تسلی دیتی مگر جو دل تشنۂ آزار تھا بھلا کیا تسلی پاتا لیلی کا گھر بالکل امیرانہ ٹھاٹھ کا تھا جہاں گوئٹے کی قدر بحیثیت شاعر نہیں بلکہ مثل ایک مشہور آدمی کے ہوتی گوئٹے کو یہ فضا بالکل ناپسند آئی مگر کیا کرتا لیلی کی نیم نگاہی نے جبر کو اختیار میں بدل دیا آخر باوجود سخت خاندانی اختلاف کے گوئٹے کی لیلی سے نسبت بھی ہو گئی مگر نسبت کے بعد گوئٹے کی پھر وہی آزادی کی لہر اُٹھتی ہے اور وہ بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔ موقع کا انتظار ہے کہ اُس کے چند دوست اُس کو سوئٹزرلینڈ چلنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کی دعوت پر گوئٹے بغیر لیلی سے ملے چل نکلتا ہے اور راستہ اس برگ رسینہا ئم ہوتا ہوا سوئٹزرلینڈ جاتا ہے۔ جانے کو تو وہ چلا گیا مگر اس بیاباں نوردی میں زنداں کا خیال اس کو برابر پریشان کرتا رہا۔ جب وطن واپس آیا تو پھر وہی بے رخی کی کیفیت غالب آئی۔ فرینکفورٹ میں کچھ دن رہنا ہوا تو اُس نے اپنی اور لیلی کی محبت اور پھر اپنی "بیدلی" کی داستان دوسرے ڈرامہ اسٹیلا میں لکھ ڈالی۔ اُسی زمانہ میں "نغمہ محمدؐ" کے نام سے ایک اور ڈرامہ لکھنا شروع کیا۔ اس کا خاکہ کئی سال سے دماغ میں تھا مگر پورا نہ ہو سکا۔ اس ڈرامہ میں تبلیغ اسلام، رسول اللہ کے غزوات، اسلامی حکومت کا قیام اور پھر رسول اللہ کی رحلت وغیرہ دکھانے کا خیال تھا جس میں پیغمبر صاحب کی سیرت کا اولوالعزمانہ پہلو نظر آئے مگر کچھ دنوں لکھنے کے بعد اُس کی طبیعت کا رُخ دوسری طرف پھر گیا جس سے یہ ڈرامہ پورا نہ ہو سکا۔

اکتوبر میں کارل آگسٹ جو اب وائمر کا ڈیوک ہو گیا تھا، پھر فرینکفورٹ آیا اور اُس نے اس دفعہ بھی گوئٹے کو وائمر آنے کی دعوت دی۔ ابکی گوئٹے نے سامان سفر تیار کیا اور وطن کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ کر نومبر ۱۷۷۵ء میں وائمر پہنچ گیا۔ یہاں اُس کی زندگی کا پہلا دور ختم ہوتا ہے اور دوسرا شروع ہوتا ہے۔ اب تک وہ صرف ایک نوجوان و ناموار ادیب تھا۔ اُس کے خیالات جوش کی وجہ سے ٹھکتے نہیں تھے مگر وائمر کی ذمہ دارانہ زندگی نے اُسکے خیالات میں ہر طرح سے تبدیلی پیدا کر دی اور اُس کے جوش کو ایک راستہ پر لگا دیا۔

وائمر وسط جرمنی میں ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ آبادی زیادہ تر کسانوں پر مشتمل تھی۔ صنعت و حرفت اُس زمانہ میں اول تو تھی ہی نہیں اور اگر کچھ تھی بھی تو وائمر اُس کے لحاظ سے بھی معمولی ریاست تھی۔ البتہ نوجوان ڈیوک کو فنون لطیفہ کا بڑا شوق تھا۔ وہ شاعری اور مصوری کی دل سے قدر کرتا اور فنون لطیفہ کے ماہروں کی امداد کرتا چونکہ وہ طبعاً آزادی پسند تھا اس لئے پرانی اور پوسیدہ روایات اور وضع و قطع کی پابندیوں میں رہ کر

زندگی گذارنا اُس کے لئے سخت مشکل ہوگیا۔ وہ بہت سے پُرانے طریقوں کو بالائے طاق رکھ کر آزادی برتتا۔ وہ اپنی اونچی حیثیت سے قید خانہ میں بند ہونے کے بجائے چمن زندگی کی گل چینی کی خواہش کرتا۔ ساتھ ہی اُس کو آدمی پہچاننے کا بڑا ملکہ تھا۔ وہ حکومت کے اداروں میں بہترین آدمی چن کر رکھتا اور ہر شخص کے لائق کام عطا کرتا۔ اپنی ان چند خصوصیتوں سے اُس نے بہت جلد وائمر کو علم ادب وفنون لطیفہ کا مرکز بنا دیا جسکی شعاعیں تمام ملک پر پڑنے لگیں

ہم دیکھتے ہیں کہ جب گوئٹے نے وائمر میں قدم رکھا تو اُس کے خیالات میں تبدیلی شروع ہوگئی تھی۔ طوفان وہیجان کا وہ عملی جوش اب اُس کی تحریروں میں نہیں۔ ورتھر میں اس تحریک کا انفعالی اثر ہے اور کلاویگو میں تو بہت کم ہے۔ گو اس کی تحریروں میں اس تحریک کا جوش سرد پڑ رہا تھا مگر عملی زندگی میں گوئٹے اب بھی سراپا طوفان وہیجان تھا اس کی صحبت میں نوجوان ڈیوک کی آشفتگی اور آزادی جنون تک پہنچ گئی۔ شیشۂ عقل وخرد پر جتنی ضربیں پڑ سکتی تھیں پڑیں اور ہوسناکی کے جتنے جام بھرے جاسکتے تھے بے تکلف بھرے گئے۔ گوئٹے ڈیوک کی بزم عشرت میں برابر کا شریک رہا لیکن ڈیوک کی طرح وہ اس محفل میں خام کار نہ تھا اُسکی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ ریاست کا ہر نشیب وفراز دیکھ رہا تھا کبھی کبھی وہ ڈیوک سے ہوش کی باتیں کرتا اور افسانوں اور قصوں کی آڑ میں اسکی سرمستیوں کے نتائج کی طرف اشارہ کرتا۔ آخر اس قسم کے افسانوں کے ذریعہ اپنی شخصیت کا اثر ڈالکر وہ ڈیوک کو سیدھے راستہ پر لایا تھوڑے دنوں کے بعد ڈیوک نے گوئٹے کو منصب وزارت سے سرفراز کیا۔

ابھی گوئٹے کو وائمر آئے ہوئے زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ پھر اُسکا شوق "اسیری" تیز ہوا اور اتنا تیز ہوا کہ بہت جلد زندان محبت کا ایک بے دست وپا اسیر ہوگیا۔ فراؤفان اشٹائن ایک شادی شدہ معمر عورت تھی جو گوئٹے سے سات سال بڑی تھی اور سات بچوں کی ماں تھی۔ گوئٹے اول اول فراؤفان اشٹائن کی تصویر دیکھ کر اُس سے غائبانہ محبت کرنے لگا اور جب وائمر آیا تو اُس کو دیکھ کر اُس کے تخیل میں اور بھی جوش پیدا ہوا۔ فراؤفان اشٹائن کا شوہر دربار میں کسی عہدہ پر ملازم تھا، آزاد مزاج اور بے پروا تھا۔ ہفتہ میں شاید ایک یا دو بار گھر آتا ہو۔ اپنے شوہر کی اس لاابالی زندگی سے فراؤفان اشٹائن زیادہ تر تنہا رہتی۔ گوئٹے سے اُس کی ملاقات بہت جلد دوستی میں بدل گئی اس لئے کہ وہ اپنی موجودہ زندگی سے بددل ہوتی جاتی تھی۔ گوئٹے اس تنہائی اور کس مپرسی کے عالم میں اس کو کبھی کبھی اپنا افسانہ دل سناتا اور کہتا۔

بر آستان اُمیدت کشادہ ام در چشم　　که یک نظر فگنی چوں فگندی از نظرم

مگر برسوں گوئٹے اور فراؤفان اشٹائن کے تعلقات باوجود گوئٹے کی بیچینی کے دوستی سے زیادہ نہ بڑھے آخر گوئٹے کی آرزوئے وصال مدتوں صدا بہ صحرا ثابت ہونے کے بعد پوری ہوئی اور ایک دن آیا جب وہ کہہ سکتا تھا کہ

ہمہ شب برلب و رخسار و گیسو می زنم بوسہ　　گل و نسرین و سنبل را صبا در خرمن است امشب

فراؤفان اسٹائن کے دامنِ حسن سے گوئٹے باوجود اپنی فطری سیماب وشی کے ۱۲ برس تک وابستہ رہا اور سخت متقیانہ زندگی گذارتا رہا۔ یہ امر ضرور باعث تعجب ہے کہ آخر گوئٹے کو ایسی "پختہ" ہستی سے کیوں محبت ہو گئی؟ وہ ہاتھ جو کبھی چمن میں گلاب کی نازک پنکھڑیوں کی تلاش کرتا تھا اب کیوں ایک مرجھائے ہوئے پھول پر نہ صرف اکتفا کرتا ہے بلکہ اُس کو پاکر خوش ہوتا ہے۔ فراؤفان اسٹائن نہ تو جوان تھی اور نہ تندرست اور نہ آغازِ شباب میں اتنی حسین ہی تھی جو کہہ سکتی کہ

جس کی بہار وہ ہو پھر اُس کی خزاں نہ پوچھ

بات یہ ہے کہ گوئٹے کی طبیعت ایک معمہ زار تھی ہم بتا چکے ہیں کہ اُس میں اپنے جذبات پر قابو پانے کی کافی طاقت موجود تھی۔ وہ اپنے خیالات کو ہمیشہ گہر آبدار کی طرح دریا کی تہ میں رکھتا اور جذبات کے طوفان کو اس طرح چھپا جاتا کہ سطح پر ایک موج بھی نہ دکھائی دیتی یعنی دل اگر "محیطِ گریہ" ہوتا تو "لب آشنائے خندہ" ہوتے۔ وہ لوگوں سے بیگانہ وار اسطرح ملتا کہ اس کی اندرونی کیفیتوں کا راز کم لوگوں کو معلوم ہوتا لیکن فراؤفان اسٹائن کی پختہ و محرمانہ نظر نے تھوڑے ہی دنوں میں گوئٹے کی ساری قلبی بےچینیوں کا پتہ چلا لیا اور اس کی سیرت کے ہر پہلو سے واقف ہو گئی گویا اُس نے اس خزانے کا حال جس کو گوئٹے لوگوں کی نظروں سے بچا بچا کر رکھتا تھا معلوم کر لیا۔ گوئٹے اب فراؤ فان اسٹائن کا بندۂ بے زر تھا وہ بھی گوئٹے کی روحانی زندگی کا ایک زبردست بازو بن گئی اور گوئٹے کے تمام معاملات میں مشورہ دیتی۔ گوئٹے اس سے فلسفہ و ہیئت، سائنس و مذہب، تاریخ و جغرافیہ غرض ہر قسم کے مبحث پر گفتگو کرتا اس غیر معمولی روحانی اختلاط سے اُس کے دل کی پوشیدہ قوتیں بروئے کار آنے لگیں۔ اس زمانہ کی اپنی ایک نظم میں کہتا ہے کہ

"تو میری ہستی کی راز دار بن گئی　　اور تو نے میری پھڑکتی ہوئی رگ پہچان لی
تجھ میں وہ قوت تھی جس سے تو اس گہرائی تک　　پہنچ گئی جس سے انسان اب تک بے خبر تھا
تو نے میری زیادتیوں میں اعتدال پیدا کر دیا　　اور میری بیمانہ اور بے مہار خواہشوں کو روک دیا
تیری آغوش میں میرے دھڑکتے ہوئے سینہ کو سکون ملا"

فراؤفان اسٹائن کا یہ اثر ہوا کہ گوئٹے اُس کو فطرت کی شانِ جمالی کا مظہر اور اپنی اخلاقی ترقی کا بلند ترین نصب العین سمجھنے لگا یہیں سے اُس کی طبیعت میں ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے اور خارجی ماحول اور اندرونی کیفیات کی ہم آہنگی کی بنا پڑتی ہے۔ طوفان و ہیجان کے پچھلے دور میں جو سراسر احساسات کا حامل تھا۔ اب "خارجیت" بھی شامل ہو گئی گوئٹے نہ صرف شاعر تھا بلکہ ایک کامیاب وزیر اور ایک ماہر سائنس بھی تھا۔ تھوڑے دنوں میں اپنی محنت

اور تندہی سے وہ سلطنت کا دست راست اور ڈیوک کا مشیر خاص بن گیا۔ ڈیوک پر اُس کا اتنا اثر ہو گیا تھا کہ وہ ہر محکمہ کے نظم و نسق میں اس سے مشورہ کرتا۔ بہت سے محکموں میں تو خود گوئٹے نے کامیاب اصلاحیں جاری کیں مثلاً محکمہ مالیات و محکمہ جنگلات میں اُس کی اصلاحات سے سلطنت کو خاصا فائدہ ہوا۔ پھر تجارت اور زراعت کو فروغ دینے میں اُس کی کوششیں نہایت بارآور ہوئیں۔ وزارت کے زمانہ میں اُس کو کان کنی، علم نباتات اور سائنس سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی علم نباتات پر تو اُس نے اپنی تحقیقات کو جمع کر کے ایک رسالہ بھی لکھا جس میں ابتدائی نشو و نما کی حالت میں پودوں کے تغیرات کا نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ نباتات کے علاوہ طبیعات بھی اُس کی ممنون احسان ہے۔ سائنس کی تاریخ میں آج بھی اُس کا نام احترام سے لیا جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ریاست کے کاروبار میں الجھنے اور کچھ سائنس میں دلچسپی پیدا ہو جانے سے گوئٹے کی شاعرانہ قوت میں کمی آ گئی یعنی وہ شخص جو قلم پر اتنی قدرت رکھتا تھا کہ ایک نشست میں ایک تصنیف ختم کر دے آج تھوڑے سے اشعار سے زیادہ نہیں لکھ سکتا اور شاعری کی یہ بیکاری کوئی آٹھ دس دن نہیں بلکہ دس برس قائم رہی۔ البتہ اس خاموشی کے زمانہ میں اُس نے دو ڈرامے لکھے۔ ایک ڈرامہ تو ایگمانٹ ہے جس کا خاکہ فرینکفورٹ میں تیار ہو چکا تھا اور جس کے آخری صفحات اطالیہ میں ختم ہوئے۔ فرینکفورٹ کے اثر سے اُس میں وہی پرانے خیالات کا نقشہ ہے یعنی ایگمانٹ ایک نوجوان ہے جو ایک لڑکی کلارشن سے محبت کرتا ہے اور محبت میں اتنا اندھا ہو جاتا ہے کہ اس رستہ کے معمولی معمولی پیچ و خم سے بھی احتراز نہیں کرتا۔ آخر اسی سلسلہ میں کسی جرم میں گرفتار ہو کر آتا ہے اور پھانسی پر لٹکا دیا جاتا ہے حالانکہ اگر وہ چاہتا تو آسانی سے بھاگ سکتا تھا لیکن شاید وہ ایسا قیدی تھا کہ اگر رہائی بھی پاتا تو پھر جا کر دام میں پھنستا۔ اس کے کچھ دنوں بعد اُس کا دوسرا ڈرامہ "ٹرفی گینی" تیار ہوا جس میں وائمر کے اثرات ہیں۔ یہ ایک یونانی قصہ ہے جس کو اُس نے اپنے خیالات کا جامہ پہنایا ہے۔ اس میں وہ کہتا ہے کہ جوانی کے جوش میں بیشتر حماقت پوشیدہ ہوتی ہے اور زندگی کا بہترین لطف ہم کو بتدریج زمانہ کے ساتھ مل سکتا ہے۔ انتظار کرنا ہمارا کام ہے اور عطا کرنا عالم بالا کا۔

پھر وائمر کی اس خاموشی کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ پہلے وہ سر تا پا جوش تھا مگر اب وہ اس جوش و خروش کے نتیجہ کی تلافی کرتا ہے اور کوئی ایسا قدم اُٹھانے کے لئے تیار نہیں جو اُس کو جذبات کے سمندر میں تنکے کی طرح بے دست و پا چھوڑ دے۔ وہ احساس کو اب شبہ کی نظروں سے دیکھتا تو ضرور ہے مگر اسکو دبانے اور اُس سے کوئی کام لینے کے متعلق ابھی تک اُس کے دماغ میں کوئی خاص نقشہ نہیں آیا ہے۔ یہ زمانہ اُس کی روحانی کشاکش کا ہے۔ ایک طرف جذبات اپنا زور دکھاتے ہیں اور دوسری طرف عقل حکمت پسندان کو دبانے کا مشورہ دیتی ہے۔ اس کشاکش کی وجہ سے وہ میدان شاعری میں کوئی قدم نہ بڑھا سکا۔ یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اُس کے لئے یہ بہت آسان تھا کہ

اس کشاکش کا اپنی شاعری میں ذکر کرتا لیکن یہ سوال اُس کی فطرت سے لاعلمی پر دلالت کرتا ہے کیونکہ ہم بتا چکے ہیں کہ گوئٹے ہمیشہ شک سے گریزاں رہا وہ کسی ایسی چیز کے اظہار کے لئے کبھی تیار نہیں تھا جس میں مسئلہ کے دونوں پہلو الگ الگ پیش کئے گئے ہوں یہی وجہ ہے کہ وہ دس سال تک شاعری سے بالکل بیگانہ رہ کر سوچتا تھا کہ کسطرح دریائے زندگی کے بہاؤ کو کارآمد و مفید مطلب بنایا جاسکتا ہے لیکن کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ طوفان و ہیجان" کے دور میں اُسکے خیالات اور مشاغل زندگی میں کوئی فرق نہیں تھا یعنی شاعری اور زندگی دونوں ہم معنی الفاظ تھے مگر وائمر میں رہتے رہتے وہ "طوفان و ہیجان" سے بالکل علیحدہ ہو کر زندگی اور مقصد زندگی پر غور کرتا ہے۔ اس کی روح پھر کسی جستجو میں محو ہے۔ اس کے خیالات کسی مرکز پر جمتے نہیں۔ آگے جانے کی تلاش ہے مگر کوئی راہ نہیں ملتا آخر میں فراؤ فان اسٹائن سے بھی وہ کچھ الگ تھلگ رہنے لگا تھا۔ کیونکہ اُسکا شوہر اپنی بیوی اور گوئٹے کے تعلقات کو شبہ کی نظر سے دیکھنے لگا تھا۔
اس ذہنی کشاکش میں اُس کی صحت خراب ہو گئی اور وہ جسمانی اور روحانی دونوں طرح کی صحت کی خاطر کسی ملک کے سفر کا قصد کرنے لگا۔ اطالیہ سے اُس کو بچپن سے دلچسپی تھی۔ باپ کے اثر سے وہ ہمیشہ اس ملک کو دیکھنے کا شوق رکھتا تھا مگر دو دفعہ سوئٹزرلینڈ تک جاکر واپس آیا۔ ابکی اطالیہ کا شوق کچھ اس طرح پیدا ہوا کہ وہ بغیر کسی کو اطلاع دیئے ہوئے چل کھڑا ہوا اور اس خوف سے اتنی جلدی جلدی منزلیں طے کرتا گیا کہ کہیں ڈیوک آدمی بھیجکر واپس نہ بلالے۔
۱۷۸۶ء میں جب گوئٹے اطالیہ پہنچا تو اُس کو وہاں بالکل دوسری دنیا نظر آئی۔ وہاں کی آب وہوا وائمر کے مقابلہ میں زیادہ آزاد اور فرحت افزا معلوم ہوئی۔ اطالیہ میں گوئٹے کوئی دو برس رہا اور اس عرصہ میں وہ روما کے علاوہ تمام مشہور مقامات کی سیر کرتا رہا۔ اطالیہ کی آزادانہ زندگی میں اُس نے لطف و تفریح کے کچھ ایسے مناظر دیکھے کہ اُس کو بے اختیار اپنے عہد شباب کی ابتدائی منازل یاد آگئیں اور گو بیقرار ہو کر اُس نے بھی اس میخانہ بیخودی سے مسرت و انبساط کے جام پر جام بھرے لیکن آنکھیں اس حسن کی تلاش میں برابر مصروف رہیں جو انسانی زندگی کو حقیقت کا راستہ بتائے اور انسان کی اندرونی کاوشوں کو سکون سے بدل دے۔
اطالیہ میں اُس نے قدیم کلاسیکی تمدن کے آثار، مجسمے، تصویریں، عمارتیں وغیرہ دیکھیں اور اُن کو دیکھ کر اُس کو پہلی بار معلوم ہوا کہ انسان کی لاا بالانہ زندگی کی قوتوں کو اور غیر ذمہ دارانہ جوش و خروش کے طوفان کو کس طرح تمدن کے وسیع میدان میں لگا کر زندگی میں نظم و ترتیب، ہم آہنگی و حسن پیدا کیا جاسکتا ہے یعنی فرد کے عمل و احساس عمل کیساتھ کیونکر تمدن و معاشرت کے تقاضوں کا خیال رکھا جائے اُس کے لئے اب جماعت اور فرد کی کشاکش بے معنی چیز ہے کیونکہ ان میں باہمی ترکیب دے کر زندگی کو مسرت کا جولانگاہ بنانا ضروری ہے۔
اُس نے سارے اطالیہ کا سفر تو ضرور کیا مگر نشاۃ ثانیہ کے دور میں اطالیہ نے فنون لطیفہ میں جو حیرت انگیز

ترقی کی تھی گوئٹے اس سے بالکل بے خبری کے عالم میں گذرا البتہ مائیکل انجیلو کا نام وہ دیوار کی نقاشی کے سلسلہ میں لیتا ہے جس سے قدیم رومی واقف تھے۔ گویا وہ اپنی کلاسیکی تلاش وجستجو کی پیاس بجھانے آیا تھا اور ہر چیز کو اسی نظر سے دیکھتا تھا۔ اطالیہ کے سفر سے اس کی روحانی اور دماغی زندگی میں مطابقت شروع ہو جاتی ہے۔ اور احساس کے طوفان کو وہ عقل کے پشتوں سے قابو میں لانے کی بناڈالتا ہے یعنی وہ زندگی کے داخلی اور خارجی پہلو کو ہم آہنگ بنانے کا راز دریافت کرلیتا ہے جو اُس کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ وہ ایک جگہ کہتا ہے کہ "میں کہہ سکتا ہوں کہ یہاں سے میری بالکل نئی زندگی شروع ہوتی ہے۔ اب میں ہر چیز کو کل کی حیثیت سے دیکھتا ہوں۔ حالانکہ پہلے میری نظر میں صرف جزو تھا.... جس دن میں روما میں داخل ہوا اُس دن کو میں اپنی نشاۃ ثانیہ سے تعبیر کرتا ہوں کیونکہ مجھے جذبات کے موذی اور کمزور کر دینے والے مرض سے نجات ملی۔ اگر میں اپنے ارادہ میں ثابت قدم نہ ہوتا تو میں کب کا ختم ہو چکا ہوتا اور کسی چیز کے حاصل کرنے کے لائق نہ ہوتا۔" ہر ڈر کے گوئٹے کے خیالات میں جس انقلاب کی بناڈالی تھی اطالیہ کا سفر اس کا ایک کامیاب تتمہ ثابت ہوا اگر یہ نتیجہ نہ برآمد ہوتا تو شاید گوئٹے کی زندگی دوسرے رومانی شعراء کی طرح انمل بے جوڑ ہو کر رہ جاتی۔ اطالیہ جاتے وقت گوئٹے کی روح اور جسم دونوں بیمار تھے لیکن وہاں کے دو سال کے قیام نے دونوں کو تندرست بنا دیا۔ وہ وہاں اپنی گذشتہ زندگی پر بالکل خارجی حیثیت سے نظر ڈالتا ہے اور آئندہ کے لئے منصوبے سوچتا ہے۔ اطالیہ میں اُس نے ایک غنائی ڈرامہ ٹاسو لکھنا شروع کیا جس میں عہد جدید کے ایک حساس ونازک دل شاعر کی داستان ہے جو دنیا کے سرد وگرم میں گرفتار ہو کر زندگی سے تنگ آجاتا ہے۔ اس ڈرامہ میں گوئٹے نے کلاسیکی ہم آہنگی کا خیال رکھا ہے۔

اطالیہ سے گوئٹے لوٹا تو نئے خیالات اور بلند عزائم ساتھ لایا اور وائمر پہنچا تو ہر چیز بے کیف معلوم ہوتی۔ دوستوں میں اسکا جی گھبراتا سلطنت کے کاروبار سے اُس کو تکلیف سی ہونے لگی۔ اس حالت کو وہ اسطرح بیان کرتا ہے کہ "میں صورت دار اطالیہ سے بے صورت جرمنی میں لوٹ آیا.... میرے دوست بجائے مجھے تسلی دینے اور مجھے اپنی طرف راغب کرنے کے مجھ سے بددل ہو کر مایوس ہو گئے۔ قدیم زمانے کی چیزوں سے میری دلچسپی، میری علالت اور میری گم شدہ چیزوں پر میرے افسوس سے ان کو سخت تکلیف ہونے لگی۔ میرا کوئی ہمدرد نہیں۔ افسوس میری زبان کوئی نہیں سمجھتا۔" ان خیالات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کی دنیا سے وہ اتنا بلند ہو گیا ہے کہ اسکی بات کوئی نہیں سمجھتا۔ تھوڑے دنوں کے بعد وہ لوگوں سے بے رخی برتنے لگا اور اس پر لوگ اُسے مغرور کہتے۔ کوئی چھ برس تک وہ اسی طرح کی زندگی گذارتا رہا۔ ڈیوک نے اُس کی یہ حالت دیکھ کر اُس کو سلطنت کے بہت سے کاموں سے سبکدوش بھی کر دیا گو درپردہ وہ تمام مشوروں میں شریک رہتا۔ ۱۷۹۱ء میں جب ڈیوک نے ایک سرکاری

تھیٹر کھولا تو گوئٹے اسکا نگراں مقرر ہوا۔ مگر سچ پوچھئے تو اسکا کسی کام میں جی نہیں لگتا تھا۔ دنیا میں کوئی ایسا محرم نہ رہا جو اُسکا درد نہاں معلوم کرے۔ فراؤ فان اشائن سے روما کے سفر سے پہلے ہی کشیدگی شروع ہو گئی تھی جو بعد کو اتنی بڑھی کہ علیحدگی ہو گئی۔ اِس پر گوئٹے کے بعض دوستوں کو تعجب بھی ہوا اور غصہ بھی آیا مگر یہ اُسکی فطرت کا تقاضا تھا جو اُس کو ایک مرکز پر ٹھہرنے نہ دیتا تھا۔

اس زمانہ میں زیادہ تر وہ تنہا گھر میں پڑا رہتا۔ بہت کم لوگوں سے ملتا۔ ایک روز جب سیر کو باہر جا رہا تھا تو راستہ میں اُس کو ایک نوجوان خوش رو لڑکی ملی جو اپنے بدنصیب بھائی کی سفارش کرنا چاہتی تھی۔ اسکا نام کرسچین ولپیوس تھا۔ وہ ایک غریب گھر کی لڑکی تھی جس کی بسر اوقات کاغذ اور کپڑے کے پھولوں کو بنا کر بیچنے پر تھی۔ گوئٹے نے جب اُسے دیکھا تو نہ جانے اُس کے جی میں کیا آئی کہ اس کو گھر آنے کی دعوت دیدی۔ وہ گھر آئی تو اُس کو اپنی مدخولہ بنا کر رکھ لیا۔ تھوڑے دنوں بعد اُسی سے اسکا لڑکا آگسٹ گوئٹے پیدا ہوا جب گوئٹے نے شادی اور "خانہ داری" کے رواج کو جس پر وائمر میں برائے نام عمل ہوتا تھا، توڑ ڈالا تو تمام حلقوں میں سخت ہنگامہ برپا ہوا مگر گوئٹے نے اس کی کچھ پرواہ نہ کی کیونکہ وہ رسم سے زیادہ روح کا قائل تھا۔

کرسچین ولپیوس نہ تو زیادہ پڑھی لکھی تھی اور نہ زیادہ تیز فہم ہی تھی۔ خط بھی مشکل سے لکھ سکتی تھی۔ مگر گوئٹے اسکی طرف اتنا مائل ہوا کہ اس نے اس کے ساتھ کامل اٹھارہ سال متاہلانہ زندگی گذارنے کے بعد اس سے ۱۸۰۶ء میں باقاعدہ شادی کر لی اس شادی پر اس لحاظ سے تعجب ضرور ہوتا ہے کہ گوئٹے ایسی آزاد شخصیت رکھنے والا آدمی اتنی مدت تک اس "بلائے جان" میں کیسے گرفتار رہا۔ اس کی وجہ ممکن ہے یہ رہی ہو کہ وہ "طوفان و ہیجان" کے دور سے گذر چکا تھا۔ عمر بھر کی بیقراری اب شاید سکون کی متلاشی تھی۔ مزید براں اُس کے خیالات میں بھی تبدیلی ہو چکی تھی اور وہ فرد کو جماعت سے علیحدہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ وائمر کے لوگوں سے بددل تھا اور اس بددلی کا اظہار اُس نے اپنی اس "حرکت" سے کیا جو اُن لوگوں کی "نفاست طبع" پر سخت حملہ تھا۔ لیکن خواہ کچھ ہی ہو اُس کی بلند دماغی سطح کو دیکھ کر یہ حکم لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی شریک زندگی کو بھی عام لوگوں سے بلند ہونا چاہئے تھا۔ یورپ کے اس عالی دماغ شخص نے ایک معمولی عورت کے ساتھ رہکر زندگی بسر کرنیکا جو نفسی معمہ پیش کیا ہے وہ آج تک کسی کے سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ تاریخ اس قسم کی مثال سے خالی نہیں۔ یورپ کا دوسرا مشہور شخص روسو جو موجودہ سیاسی دور کا ابو الآبا اور انقلاب فرانس کا بانی کہا جاتا ہے اُس کا بھی یہی حال تھا۔ اُس کی شریک زندگی بھی ایک نہایت معمولی درجہ کی عورت تھی جو کسی طرح میدان زندگی میں مجموعی طور سے اُس کی معاونت کی سزاوار نہیں کہی جا سکتی۔ شاید یہ فطرت کے ان رازوں میں سے ایک راز ہے جس کا عقدہ کبھی حل نہ ہو سکے گا۔ بہرحال کرسچین ولپیوس نے گوئٹے کو گرہست بنا دیا اور اس میں "مکانیت" کی بو پیدا کر دی۔ یہ گوئٹے کے لئے بالکل نئی چیز تھی کیونکہ گوئٹے اب تک خانہ داری کی زندگی سے بالکل بیگانہ تھا۔ گوئٹے کرسچین ولپیوس کو اپنے باغ کا "لالہ صحرائی" کہتا ہے۔ الف ۶

اس کے تھوڑے دنوں بعد وہ پھر اطالیہ چلا گیا۔ مگر اب کی وہ جوش و خروش نظر نہیں آتا۔ واپس آیا تو بالکل خاموش۔ سائنس میں جو دلچسپی

پیدا ہوگئی تھی اس سے سائنس میں تحقیقاتیں کرتا، کتابیں پڑھتا اور گھر بیٹھا رہتا۔ اسی زمانہ میں فرانس کا مشہور انقلاب رونما ہوا۔ حالانکہ اس عظیم الشان انقلاب سے یورپ کے شجر و حجر اپنی اپنی جگہ سے ڈولنے لگے تھے مگر گوئٹے بالکل متاثر نہیں ہوا بلکہ اپنی طبیعات کی تحقیقات میں بدستور مصروف رہا۔ وہ انقلاب کو محض ایک اجنبی تماشائی کی نظر سے دیکھتا رہا مگر کسی طرح اُس میں شریک نہیں ہوا۔ اُسکی دوربین نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ انقلاب کے پہلے فرانس میں جو دور تھا وہ رعایا کے لئے سخت جانگداز تھا اور اُسکا نتیجہ کسی نہ کسی انقلاب کی صورت میں ضرور نمودار ہوگا۔ شاید وہ اس کے لئے پہلے ہی سے تیار تھا اور اسی لئے انقلاب سے متاثر نہیں ہوا۔

کچھ اپنی طبیعت کی افسردگی اور کچھ سائنس میں انہماک کی وجہ سے اُس کی شاعری پھر معرض التوا میں پڑ گئی اور شاید یہ دور مدتوں تک قائم رہتا اگر اُسی زمانہ میں ایک نوخیز فلسفی شاعر سے اُس کی ملاقات نہ ہو جاتی۔ شلر گوئٹے سے دس سال چھوٹا تھا۔ گوئٹے کی شلر سے ملاقات اول اول ۱۷۸۸ء میں ہوئی تھی اور رفتہ رفتہ یہ ملاقات پانچ چھ سال میں بڑھ کر دوستی میں بدل گئی۔ شلر کی طبیعت فلسفیانہ تھی وہ کانٹ کے ساتھ رہ چکا تھا اور اُس کے فلسفۂ جمال سے متاثر تھا اسی لئے وہ شاعری کی بنیاد فلسفہ پر رکھتا تھا۔ وہ پہلے حقیقت تک پہونچنے کے لئے ایک خیال قائم کر لیتا ہے پھر اُس خیال کا ثبوت کائنات کے ذروں میں تلاش کرتا ہے۔ اُس کی شاعری میں کافی جوش ہے مگر اس سکون سے خالی ہے جو زندگی کے نشیب و فراز دیکھنے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ برخلاف اِس کے گوئٹے فلسفی نہیں بلکہ شاعر ہے اور اُس کی شاعرانہ پرواز اتنی بلند ہے کہ فلسفہ وہاں تک پہنچنے سے قاصر ہے۔ اُس کی حقیقت آشنا طبیعت بغیر کسی خیال کے کائنات کو اپنے اصلی رنگ میں دیکھنے کی کوشش کرتی ہے اور اس کوشش میں وہ عقل و دل دونوں کی خدمات سے کام لیتا ہے۔ ۱۷۹۰ء میں شلر گوئٹے کے متعلق لکھتا ہے کہ اُس کا دماغ ہم آہنگی اور وحدت کی خاطر ہر طرف پہونچنے کی کوشش کرتا ہے اور اسی وجہ سے میرے خیال میں وہ بڑا آدمی ہے۔ شلر ایک ادبی رسالہ نکال رہا تھا۔ ۱۷۹۴ء میں اُس نے گوئٹے کو ادارت میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ گوئٹے نے اس دعوت کو منظور کر لیا اور اسکے بعد دونوں کی دوستی میں وہ استواری پیدا ہو گئی جو شلر کی موت تک (۱۸۰۵ء) قائم رہی۔ شلر کی دوستی سے گوئٹے کی شاعرانہ زندگی پر کافی اثر پڑا۔ شلر کی محبت نے اُس میں شاعری کا جوش پھر پیدا کر دیا اور اُس نے بہت سی نظمیں لکھنا شروع کیں۔ علاوہ بریں گوئٹے فاؤسٹ کے مسودہ کو بالکل بھلا بیٹھا تھا۔ شلر کے تقاضوں سے اُس پر نظر ثانی کرنی شروع کی تا آنکہ وہ اختتام تک پہونچ گیا۔

شلر نے کوشش کی تھی کہ گوئٹے کا ناول "ولہلم مائسٹر کا زمانۂ ابجد داری" اس کے رسالہ میں شائع ہو جائے مگر گوئٹے اس کی اشاعت کا انتظام پہلے ہی کر چکا تھا۔ یہ ناول شائع تو ہوا ۱۷۹۵ء میں مگر اس کی ابتدا اطالیہ کے سفر سے پہلے ہو چکی تھی اور آخر میں گوئٹے نے کافی ردوبدل بھی کیا۔ پہلے مسودہ میں ایک نوجوان "ولہلم مائسٹر" کا قصہ ہے جو کسی تھیٹر میں ملازم ہوا اور پھر وہیں کی ایک بیوفا ایکٹرس پر عاشق ہو گیا۔ اُس زمانہ میں ولہلم نے بڑی مصیبتیں اُٹھائیں اور تھیٹر سے بھی علحدہ ہو گیا۔ پھر اُس نے خود سرمایہ جمع کیا اور اپنا تھیٹر قائم کیا۔ اب وہ خود ڈرامے لکھنے لگا اور اُن کو کھیلنے لگا۔ اسی اثنا میں کسی شہر کو جاتے ہوئے اُسکا قافلہ لٹ جاتا ہے اور قزاق اُس کو زخمی کر کے تنہا چھوڑ جاتے ہیں پھر ایک حسینہ اُسکی جان بچاتی ہے۔ اس قصہ کا کچھ زیادہ مطلب نہیں نکلتا۔ مگر دوسرے مسودہ میں جو اطالیہ کا سفر شروع ہونے کے بعد لکھا گیا گوئٹے نے قصہ کا کچھ حصہ بدل کر

اس میں نئے معنی پہنائے ہیں۔ یعنی ولہلم مائسٹر بجائے معمولی تھیٹر کی اُمیدواری کے خود زندگی کے تھیٹر کی امیدواری کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ "اپنی فطرت کی نشوونما میں ہم آہنگی پیدا کرے" اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ گوئٹے کا مقصد آرٹ نہیں بلکہ خود زندگی ہے۔ آرٹ کو وہ زندگی کے تابع کرنا چاہتا ہے گڑبڑ اور بدنظمی کے مقابلہ میں نظم و ترتیب، گمان کے مقابلہ میں یقین اور عشق کے مقابلہ میں مداومت عمل کو سراہتا ہے۔ ولہلم پر بہت مصیبتیں پڑتی ہیں اور وہ اُنکا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے تب کہیں اُس کا شمار ایک خاص اور ممتاز گروہ کے لوگوں میں ہوتا ہے۔ اس قصہ کا مطلب یہ ہے کہ "عمل ہر شخص کرتا ہے مگر سوچنا ذرا مشکل کام ہے انسان بڑی مصیبتیں جھیلنے اور ٹھوکریں کھانے کے بعد دانائی سے عمل کرنا سیکھتا ہے! اصلی اُستاد وہ ہے جو جانتا ہے لیکن وہ جاننا نہیں جو سب جانتے ہیں بلکہ اصل جاننا وہ ہے جس سے معلوم کی مدد سے لامعلوم کا پتہ لگایا جائے۔ اور یہی چیز شاگرد کو اُستاد بنا دیتی ہے اس لئے انسان کی قوت عمل کو صحیح راستہ پر لگانا علم کا اصلی مقصد ہے" دوسرے لفظوں میں اُسکی تشریح یوں کیجا سکتی ہے کہ انسان زندگی کی صحیح تعلیم ٹھوکریں کھانے کے بعد حاصل کرتا ہے بشرطیکہ خلوص و صداقت کو اپنا مشعل راہ بنائے کیونکہ "خلوص ہی سے حیات ابدی ملتی ہے"۔ ولہلم مائسٹر کے متعلق شلر کا خیال ہے کہ "ولہلم اس حالت سے جس میں زندگی کا کوئی مقصد معین نہ ہو ایک ایسی منزل کی طرف ترقی کرتا ہے جہاں اسکی زندگی سراپا عمل ہے اور جہاں اُسکے مقاصد کا تعین بھی موجود ہے"۔

اسکے بعد گوئٹے نے اپنا افسانہ ہرمن اور ڈروتھیا شایع کیا جو شروع سے آخر تک نظم میں ہے۔ افسانہ کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ ایک شہر کے پروٹسٹنٹ طبقہ کے عیسائی شہر بدر کئے جاتے ہیں اور سفر کے دوران میں ان ہی کے ایک نوجوان ہرمن سے ایک حسین دوشیزہ ڈروتھیا سے ملاقات ہوتی ہے۔ ہرمن فوراً اُس پر عاشق ہو جاتا ہے اور اُسکا حسب و نسب دریافت کرکے اپنے باپ سے کہتا ہے کہ اگر وہ دوشیزہ مجھے نہیں ملی تو میں زندگی بھر شادی نہیں کرونگا۔ باپ بیٹے کو اس حرکت پر نصیحت کرتا ہے اور سمجھاتا ہے مگر بیٹا کہاں مانتا ہے۔ آخر باپ راضی ہو جاتا ہے وہ لڑکی بلائی جاتی ہے اور وہ بھی راضی ہو جاتی ہے اور پھر دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔ اس داستان میں گوئٹے نے اپنے زمانہ کے نوجوانوں کے عشق کی نفسی تصویر پیش کی ہے مگر انداز بیان اُس نے ہومر کا اختیار کیا ہے۔ گوتس اور ورتھر شایع کرنے کے بعد گوئٹے کے خیالات میں بڑی تبدیلی ہو گئی تھی۔ جذبات کو جو عوام کی تکمیل ہے وہ شبہ کی نظر سے دیکھنے لگا تھا۔ علاوہ بریں رومانیت[1] کا آغاز ہو چکا تھا اور اُنیسویں صدی کے ابتدائی دور میں تو اُسکا بہت زور تھا ان وجوہ سے اُس کی مقبولیت بہت کم ہو گئی تھی مگر ہرمن اور ڈروتھیا نے اسکی مقبولیت پھر زندہ کر دی۔ ہر طرف اُسکا چرچا ہونے لگا۔ اس مقبولیت کی وجہ یہی کتاب دل کی تفسیر ہے یعنی ہرمن اور ڈروتھیا کے آئینہ میں ہر حسن پرست دل رکھنے والا شخص اپنے ہی خط و خال کی جھلک پاتا اور مصنف کے کمال کی داد دیتا۔ ولہلم اور ہرمن و ڈروتھیا گوئٹے نے شلر کی زندگی میں شلر کے مشورہ سے شائع کی تھیں۔

---

[1] مغربی ادب میں اٹھارہویں صدی کے نصف دوم کا زمانہ رومانیت کی ابتدا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مغربی مصنفین ادب کی تمام تاریخوں میں اٹھارہویں اور اُنیسویں صدی کے ادب کو کلاسیکی اور رومانی دور میں تقسیم کرتے ہیں مگر یہ تقسیم جتنی ناجائز ہے اتنی ہی غلط بھی ہے کیونکہ کوئی دور خواہ وہ کلاسیکی ہو یا رومانی مکمل طور پر نہ تو کلاسیکی کہا جا سکتا ہے اور نہ رومانی کیونکہ ہر دور میں دونوں کی کچھ نہ کچھ خصوصیات پائی جاتی ہیں۔
جس طرح آج تک کسی معروف و مشہور چیز کی کوئی جامع تعریف نہ ہو سکی اسی طرح رومانیت کی بھی کوئی جامع تعریف نہیں ہوئی سا ایک مصنف اگر قرون وسطیٰ

شلر کی موت کے بعد گوئٹے کی زندگی کا دوسرا اور آخری دور شروع ہوتا ہے۔ شلر کی موت سے گوئٹے کو بہت صدمہ ہوا کیونکہ دس بارہ برس کے قریبی تعلق سے دونوں میں خاصی محبت ہوگئی تھی۔ شلر کی موت کے بعد سے وہ کچھ آزردہ خاطر اور پریشان حال رہتا اور کبھی کبھی بے چین بھی ہو جاتا۔ آخر طبیعت کی اصلاح کے لئے اُس نے چند مقامات کا سفر بھی کیا۔ اسی زمانے سے اُس میں ضعیفی اور پیری کے آثار نمودار ہوتے ہیں جب وہ سفر سے لوٹ کر آیا تو اُسکے تھوڑے ہی دنوں بعد یورپ میں نپولین کا ہنگامہ شروع ہوگیا۔ انقلاب فرانس کے بعد نپولین کے ہاتھ میں مطلق العنانہ اختیارات آگئے جس سے فائدہ اُٹھا کر وہ بادشاہ بن بیٹھا ۱۸۰۶ء میں اُس نے پروشیا پر حملہ کر دیا۔ وائمر کی ریاست پروشیا کی حلیف تھی۔ جینا کی مشہور جنگ میں پروشیا کے ساتھ وائمر کو بھی شکست فاش ہوئی۔ وائمر کو فرانسیسیوں نے خوب لوٹا مگر جنرل نے کی عنایتوں کی وجہ سے گوئٹے اس دستبرد سے بچا رہا۔ صلح کے بعد ۱۸۰۸ء میں گوئٹے کی ملاقات نپولین سے ہوئی اور بڑی دیر تک ادب وسیاست پر گفتگو ہوتی رہی۔ نپولین گوئٹے کا بڑا مداح تھا۔ اُس نے سات مرتبہ "ورتھر" پڑھا تھا اور مصر کی مہم پر اس کتاب کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ جب ملاقات ختم ہونے کو آئی تو نپولین بول اُٹھا کہ "بیشک یہ ایک انسان ہے"۔

۱۸۰۸ء میں گوئٹے کا شاہکار فاؤسٹ کا حصہ اول شایع ہوا۔ اُس ڈرامہ کا خاکہ اول اول اُس نے اسٹراس برگ میں تیار کیا تھا پھر فرینکفورٹ میں کچھ گھٹانے بڑھانے کے بعد اُس کو اطالیہ کے سفر تک یوں ہی ڈال رکھا۔ گوئٹے فاؤسٹ کے ڈرامہ کو اتنا اہم سمجھتا تھا کہ ہمت ہار کر اُس سے مایوس ہو بیٹھا تھا۔ شلر سے جب دبی رفاقت کا آغاز ہوا تو اُس نے گوئٹے کی توجہ فاؤسٹ کی طرف دلائی پھر اُس کے پیہم اصرار سے گوئٹے نے فاؤسٹ کا حصہ اول بڑی محنت سے ۱۸۰۵ء میں ختم کیا۔ پہلے مسودہ میں تو فاؤسٹ

کے جذبات وخیالات اور اُس زمانہ کے کارناموں کو دوبارہ زندہ کرنے کو رومانیت کہتا ہے تو دوسرا حیرت، حسن اور بیگانگی کو رومانیت کی روح قرار دیتا ہے پھر تیسرا رومانیت کو نامعلوم اور مبہم خواہشات کی تڑپ سے تعبیر کرتا ہے اور چوتھا اُس کو انسانی زندگی کے لامحدود گوشوں کی طرف اشارہ کرتا بتاتا ہے۔ پانچواں صرف انداز بیان پر اپنی پوری عمارت کھڑی کرتا ہے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں ہیں۔ لیکن ان مختلف بیانات کو اگر ملا دیا جائے تو رومانیت کے متعلق کچھ نہ کچھ علم ضرور ہو جائیگا۔ اصل میں رومانیت جوش میں ڈوبا ہوا ایک جذبہ ہے جو کائنات کے ہر مظہر میں حسن کی تلاش کرتا ہے اور اس تلاش میں اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ پھر عقل کے ساتھ ہم آہنگی ناممکن ہو جاتی ہے۔ ہر دیکھی بھالی چیز سے جس میں عقل کا ذرا سا بھی شائبہ ہو اُسکو نفرت پیدا ہو جاتی ہے اسی لئے یہ معلوم کے بجائے نامعلوم، حال کے بجائے ماضی اور محدود کے بجائے لامحدود کی طرف جاتا ہے اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ رومانیت کیفیات کی ایک دنیا ہے جس کو حاصل کرنے کے لئے روح مندرجہ ذیل چیزوں کی استعانت چاہتی ہے:۔

۱۔ مناظر قدرت۔ بہار و خزاں کی آمد ورفت۔ آفتاب و ماہتاب کا طلوع وغروب۔ سبزۂ وگل کی عطر بیزی، نسیم صبح کی دلآویزی غرض مناظر قدرت کی تمام نیرنگیوں سے انسان کے دل میں جذبات کا ایک طوفان برپا ہوتا ہے کیونکہ بزم قدرت حسن کا ایک بے پایاں سمندر ہے۔ اکثر مناظر قدرت کے مشاہدے سے انسان افسردہ دل اور پژمردہ خاطر بھی ہو جاتا ہے اور لالۂ صحرا کا داغ اُس کو اپنے ہی داغ دل کا پرتو نظر آتا ہے۔ پھر رات کی سنسان تاریکی اور وادیوں اور پہاڑوں کے خاموش گوشے اور قدرت کے مہیب مظاہر سے دلوں میں اضطراب پیدا ہوتا ہے جس سے انسان اکثر عالم کی حقیقت اور موت وحیات کے مسئلہ میں اُلجھ پڑتا ہے۔

۲۔ تخیل۔ مناظر قدرت نے جب دل میں اضطراب پیدا کر دیا ہو تو تخیل آکر اُسے چھیڑتا ہے کیونکہ روح کی بیقراریاں خود روح کی گہرائی

بالکل "طوفان وہیجان" کا دوسرا نقش تھا لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اور گوئٹے کے خیالات میں تبدیلی ہوتی گئی فاؤسٹ بھی اس تبدیلی کا ترجمان بنتا گیا۔ آخر جب یہ تبدیلی ایک خاص مرکز پر آکر جم گئی تو گوئٹے نے فاؤسٹ میں ہاتھ لگایا اور اُس کو اپنے "جدید" خیالات کا رنگ دیکر ختم کیا۔ قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک شخص فاؤسٹ کو جو سرتا پا عقل ہے، کائنات کا راز اور انسانی زندگی کی حقیقت معلوم کرنے کا بیحد شوق ہے اور اس شوق کی تحصیل میں اُس نے آدھی سے زیادہ عمر گذار دی۔ دنیا بھر کے علوم پڑھ ڈالے مگر سیری نہ ہوئی۔ کتابوں کے دریا کے دریا خشک کرڈالے لیکن جگر کی پیاس نہ بجھی۔ آخر علوم سے تنگ آ کر اُس نے فن سحر کی طرف توجہ کی مگر وہاں بھی بدستور سابق اُس کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اپنی ناکامی سے اُس کو اتنی مایوسی ہوئی کہ آخر وہ خودکشی کرنے پر آمادہ ہوگیا مگر پھر کچھ سوچ کر باز آیا۔ اسکے بعد ایک روز ایک کالے کتے کو دیکھتا ہے جو اُس کے گھر میں چلا آتا ہے۔ یہ کتا شیطان ہے جو گھر میں آکر ایسی شکل اختیار کرلیتا ہے جو کسی پادری یا ملا کی شکل سے ملتی جلتی ہے یا شیخ سعدی کی مجوزہ شکل سمجھئے یعنی۔

مرا ابلیس را دید شخصے بخواب   بقامت صنوبر برخ آفتاب

شیطان فاؤسٹ سے اُسکی آرزوؤں کی تکمیل کا وعدہ کرتا ہے بشرطیکہ فاؤسٹ مرتے وقت اپنی روح شیطان کے حوالے کردے۔ فاؤسٹ اپنے خون سے راضی نامہ لکھ دیتا ہے اور آرزوؤں کی تکمیل کی صورت یہ قرار پائی کہ فاؤسٹ تمام دنیا کا علم حاصل کرنے کے بعد اگر دنیا میں ملوث ہو جائے تو شیطان جیتا ورنہ فاؤسٹ۔ شیطان نے فاؤسٹ کو تمام دنیا کی سیر کرائی اور طرح طرح کے لوگوں سے اُسکی ملاقات کرائی اور اس خیال سے کہ دنیا کا مطالعہ ذرا اچھی طرح ہو سکے اُس نے جادو کے زور سے فاؤسٹ کو جوان بنا دیا۔ جوان فاؤسٹ اس کے بعد ایک لڑکی سے محبت کرتا ہے پھر قدیم یونان کی مشہور حسینہ ہیلن سے ملاقات کرتا ہے اور اس پر عاشق ہو جاتا ہے۔ آخر ایک شہر خود آباد کرکے اسکی نگہبانی اور ترقی کی ترکیبیں سوچتا ہے کہ اس کی زندگی کا وقت پورا ہو جاتا ہے مگر عین اُسوقت جب شیطان معاہدہ کے مطابق روح طلب کرنے آتا ہے نورانی فرشتے آکر اُس کی روح کو شیطان کے پنجہ سے چھڑا کر

سے پیدا ہوتی ہیں۔ تخیل رومانیت کا ایک ضروری عنصر ہے۔

۳۔ عہد ماضی کی داستان۔ خود تخیل کو بروئے کار لانے میں عہد ماضی کی داستان بہت مدد دیتی ہے۔ پرانی پرانی عمارتیں، بوسیدہ مزارات اور اُجڑے معبدگاہ وغیرہ جب زبان حال سے عظمت رفتہ کا افسانہ سناتے ہیں تو دلوں میں اضطراب پیدا ہوتا ہے اور یہی آرزو ہوتی ہے کہ

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو   دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

اور پھر آنکھوں سے دل کی تڑپ کا اظہار ہوتا ہے۔

اشکباری کے بہانے ہیں یہ اُجڑے بام و در   گریۂ پیہم سے بینا ہے ہماری چشم تر

۴۔ اخلاق۔ حال کی کیفیت ہمیشہ ناگفتہ بہ ہوتی ہے اس لئے لوگ اخلاقی ترقی کا نصب العین ماضی میں تلاش کرتے ہیں اور اس سلسلہ سے وہ ماضی کی داستان کو جذبات سے از سر نو زندہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

۵۔ دور دراز ملکوں کے قصوں اور حالات سے بھی تخیل کو حرکت ہوتی ہے۔ مثلاً مشرقی ممالک کے قصے اُس زمانہ میں یورپ میں بہت مقبول تھے۔

۶۔ عوام کے افسانوں اور قصوں سے جو صدہا برس سے سینہ بہ سینہ چلے آئے ہیں دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔

عالم قدس کی طرف لیجاتے ہیں اور فاؤسٹ کو نجات ملتی ہے۔ ڈرامہ کے شروع میں تین تمہیدی مناظر (سین) ہیں اور ان میں جو منظر تھیٹر کے لئے لکھا گیا ہے اُس سے کالیداس کے شکنتلا کا اثر معلوم ہوتا ہے کیونکہ مغربی ڈراموں میں اس قسم کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔

فاؤسٹ نہ صرف ڈرامہ کی ایک شخصیت ہے بلکہ تمام بنی نوع انسان کا ایک جیتا جاگتا نمائندہ ہے جو ہمکو اعتقاد و عمل کی دعوت دیتا ہے۔ اگر انسان میں نیک نیتی ہو تو خطا کوئی گناہ نہیں کیونکہ انسان خطا کا پتلا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انسان کے قدم حقیقت کی تلاش میں ڈگمگا جاتے ہیں مگر آخر میں کامیابی اُسی کے ہاتھ ہے۔ شیطان بھی انسان کے لئے ایک ضروری چیز ہے۔ اس کا سارا دجل و فریب انسان کی اخلاقی ترقی کے لئے ناگزیر ہے کیونکہ روحانی اور اخلاقی ترقی کے راستہ میں شیطان ایک بہت بڑی دیوار ہے اور کشاکش پیدا کرتا ہے اور اسی کشاکش پر کامرانی اور فتحمندی حاصل کرنا بنی نوع انسان کا سب سے بڑا کمال ہے۔ یہ کشاکش نہ ہو تو پھر انسان انسان نہ ہو۔ دنیا میں دراصل برائی کی کوئی طاقت نہیں اور جو چیز ہم کو بظاہر بُری معلوم ہوتی ہے وہ بھی ہم کو بالواسطہ اچھائی کی طرف لے جاتی ہے۔ اس کشاکش سے انسان کو اس لئے نااُمید نہ ہونا چاہئے کہ انسان غلطی کر بیٹھتا ہے بلکہ انجام کار پر اعتقاد رکھ کر خلوص کے ساتھ پیہم عمل کرنا چاہئے۔ جب تک دل میں اعتقاد و عمل کی چنگاری نہیں بجھتی ہے انسان باوجود غلطیوں کے خدا کا خاص بندہ ہے اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ خدا اپنے بندہ کو دوزخ کی آگ سے محفوظ رکھے گا۔ آخر میں نیکی و بدی بذاتہ کوئی چیز نہیں رہجاتی گویا یہاں پہونچکر گوئٹے کی دونوں متخالف روحوں میں کمال درجہ کی ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔

فاؤسٹ شایع کرنے کے بعد گوئٹے کے قلم میں پھر فرینکفورٹ کے آخر زمانہ کی سی روانی آگئی اور اُس نے بہت سی تصنیفیں یکے بعد دیگرے شایع کیں۔ ۱۸۰۹ء میں اسکا مشہور ناول "انتخابی مماثلت" شائع ہوا۔ قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک شخص ایڈورڈ اور ایک لڑکی شارلٹ دونوں کمسنی کے زمانہ سے آپس میں محبت کرتے چلے آئے ہیں۔ بڑا ہونے پر ایڈورڈ اپنے خاندان کے اثر سے کہیں دوسری جگہ شادی کر لیتا ہے چنانچہ شارلٹ کی بھی دوسری جگہ شادی ہو جاتی ہے۔ شادی کے بعد دونوں ملتے ہیں اور کسی طرح پھر ایک جگہ دونوں میاں بیوی کی طرح رہنے سہنے لگ جاتے ہیں۔ تھوڑے دنوں بعد ایڈورڈ کا ایک پُرانا دوست کپتان آتا ہے اور ایڈورڈ کے ساتھ رہنے لگ جاتا ہے۔ پھر کچھ دنوں کے بعد ایڈورڈ کی دعوت پر شارلٹ کی بھتیجی اوٹیلی بھی آکر وہیں رہنے لگتی ہے۔ ان چار آدمیوں کے اکٹھا رہنے سے ان لوگوں کی قدرتی مماثلت اپنا اثر دکھاتی ہے یعنی جن دو شخصوں کی طبیعت ہم رنگ ہوتی ہے وہ آپس میں محبت کرنے لگتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کپتان شارلٹ سے اور ایڈورڈ اوٹیلی سے محبت کرنے لگتا ہے۔ ایک دن بحث کے دوران میں اس نئی طرز کی محبت پر یوں روشنی پڑتی ہے کہ جب دو ہم مثل اجزا ملتے ہیں تو اُن کے امتزاج سے ایک تیسرا جزو بنتا ہے۔ لیکن اس عشق کا نتیجہ نہایت

اٹھارہویں صدی کے آخر میں ان چیزوں کا داخلہ یورپ کے ادب میں ہونے لگا جس سے عقلیت کی زنجیریں ٹوٹنے لگیں اور احساس کا عمل بڑھنے لگا۔ جرمنی کی تحریک "طوفان و ہیجان" کے ایوان کی زیبائش انھیں چیزوں سے کی گئی ہے۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں یہ چیزیں روحانی تحریک میں منتقل ہو گئیں۔ تحریک طوفان و ہیجان اور رومانیت میں فرق یہ ہے کہ تحریک طوفان و ہیجان ان چیزوں کے ساتھ ایک زبردست پیغام عملی بھی ہے اور روحانی تحریک سراسر جذبات کا انفعالی پہلو لئے ہوئے ہے عمل اس میں مفقود ہے۔

خطرناک صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ شارلٹ اور ایڈورڈ نہایت دردناک حالت میں جان دیتے ہیں۔ کپتان کا بھی بُرا حال ہوتا ہے گوئٹے نے اس قصہ میں میاں بیوی کے تعلقات کی نفسی تحلیل کی ہے اور شادی کی اہمیت اور میاں بیوی کے صحیح تعلقات پر زور دیا ہے اور بتایا ہے کہ اخلاق کے زبردست اور عالمگیر قانون سے سرکشی سخت خطرہ کا باعث ہے۔ اب صاف معلوم ہوتا ہے کہ گوتس اور ورتھر کے مصنف کا نظریہ بدل چکا ہے۔ پہلے وہ سوسائٹی کی کچھ پروا نہیں کرتا تھا جماعت کے مقابلہ میں فرد کی کوششوں کو لائق تحسین قرار دیتا تھا لیکن اب سماج کے اثرات اور اخلاقی قوانین کی پیروی پر نہ صرف زور دیتا ہے بلکہ اُن کا پرچاری ہے اس کے بعد گوئٹے اپنی سوانح عمری لکھنے میں مشغول ہوا جس کو اُس نے کئی حصہ کرکے ۱۸۱۱ء سے لیکر ۱۸۳۱ء تک شائع کیا اور اُس کا نام "شاعری اور حقیقت" رکھا۔ یہ سوانح عمری بچپن سے لیکر وائمر کی روانگی تک یعنی پچیس برس کی مکمل داستان ہے۔ اس میں گوئٹے نے اپنے مختلف عشقیہ کارنامے دوستوں کا حال جرمن ادب کی حالت اپنی تعلیمی سرگرمی غرض جو کچھ اُس کی ذات سے وابستہ تھا اس کو لکھ کر اپنی روحانی اور ذہنی ارتقاء کی تصویر پیش کی ہے۔ جوانی کی خام کاریوں اور ہجر و وصال کی کیفیتوں کو نظرانداز نہیں کیا گیا ہے مگر طرز بیان میں اتنی متانت ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک پیر پختہ کار اپنی جوانی کے جوش و خروش کو دیکھ رہا ہے۔ بعض لوگوں نے کہیں کہیں واقعات کی غلطیاں بتائی ہیں مگر یہ غلطیاں شاید ارادۃً نہ ہوں مثلاً "طوفان و ہیجان" کی تحریک کے زور کا جسکا ذکر ادبی تاریخوں میں ملتا ہے اور جسکا خود گوئٹے علمبردار تھا اس میں بالکل پتہ نہیں چلتا۔ پھر لائپزگ کی رنگین زندگی کا حال صاف طور پر نہیں کھلتا۔ طرز تحریر صاف اور سادہ اور کہیں کہیں زوردار بھی ہے۔ کارل بریول کا خیال ہے کہ گوئٹے سے قبل جتنی بڑی سوانح عمریاں شائع ہوئیں ہیں اُن میں زیادہ تر مصنف کے ذاتی نشو و نما کا حال ہوتا ہے۔ مگر گوئٹے تنہا وہ شخص ہے جس نے اپنی سوانح عمری میں جماعت کے ساتھ فرد کے ارتقائی منازل کی کیفیتیں پیش کی ہیں اور اُن کے پیش کرنے کا مطلب صرف اظہار نہیں ہے بلکہ خود اُس کے ذہنی ارتقاء کو سائنس اور فلسفہ کے نقطۂ نظر سے سمجھنے کی دعوت عام ہے۔ ..... اس لئے "شاعری اور حقیقت" اپنے اعلیٰ مقصد کے لحاظ سے محض معمولی حقائق سے نکلکر ایک زبردست اور زندہ حقیقت کی دنیا میں پہونچ جاتی ہے۔"

پھر تھوڑے دنوں بعد اُس نے اپنا "مغربی مشرقی دیوان" شائع کیا۔ اس میں گوئٹے کی وہ غزلیں اور نظمیں درج ہیں جنھیں اُس نے بادہ مشرق سے مست ہوکر لکھی ہیں۔ ۱۸۱۴ء میں گوئٹے کی نظر سے دیوان حافظ کا جرمن ترجمہ گذرا جس کو آسٹریا کے ایک عالم فان ہیمر پرگسٹال نے دو ایک سال قبل شایع کیا تھا۔ مگر مشرق کی طرف گوئٹے کی توجہ مبذول کرنے والا صرف دیوان حافظ ہی نہیں تھا بلکہ اس مشرقی تحریک کے آغاز سے جو دیوان حافظ کا ترجمہ چھپنے کے بعد شروع ہوگئی تھی مدتوں پہلے گوئٹے مشرقیت کا شیدائی تھا مشرقی ادب میں عالم رنگ و بو کی کیفیت، احساس کی حرکت اور تخیل کی آمیزش کے ساتھ ایک نہ ملنے والی چیز کی جستجو اور تڑپ بھی ہے جسکا گوئٹے اپنے شاعرانہ احساس و لطافت کی بنا پر مدتوں سے دلدادہ تھا۔ علاوہ بریں جرمنی میں مدتوں سے مشرقی ادب کا چرچا چلا آتا تھا۔ گلستان و بوستان کا ترجمہ سترھویں صدی کے آخر میں ہوا۔ الف لیلہ اٹھارھویں صدی میں تمامتر

مقبول ہوئی۔ فرانسیسی بھی مشرق سے متاثر تھے جس کا اثر بالواسطہ جرمنی پر بھی پڑا لیسنگ نے اپنے ڈرامہ ناتن کا ماحول بالکل مشرقی رکھا ہے۔ آخر میں ہرڈر کے اثر سے مشرقی ادب میں کافی دلچسپی بڑھ گئی تھی اور اسٹراس برگ میں ہرڈر ہی کے فیض صحبت سے گوئٹے کی روح میں جو نئی دنیا تعمیر ہوئی تھی وہ بڑی حد تک ہامن اور مشرقیت کی مرہون منت تھی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ گوئٹے اول اول انجیل کو محض قدرتی ماحول کی خاطر جس سے دور دراز مشرق کی بو آتی تھی پڑھا کرتا تھا۔ پھر اسٹراس برگ کے گاتھی وضع کے گرجا سے اسکی دلچسپی میں مشرقی عنصر بھی موجود ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ الف لیلہ سے اُسکو خاص شغف تھا کیونکہ " ورتھر" میں جس جگہ کشتی ڈوبنے اور اُس کا لوہا کسی مقناطیسی پہاڑ میں جا کر لپٹ جانے کا حوالہ ہے، وہ سندباد جہازی کے ایک سفر کا حال ہے۔ پھر جب اس نے فاؤسٹ شائع کیا تو تمہیدی مناظر میں ایک منظر تھیٹر کے متعلق لکھا جو نظر کالیداس کے شکنتلا کی یاد دلاتا ہے۔ یہ اثرات اس کے ذہن میں پہلے سے موجود تھے کہ دیوان حافظ شائع ہوا اور اُس نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ گوئٹے نے خواجہ حافظ کی آنکھوں سے جو ایرانی کیف و سرمستی، رندی و ہوسناکی کا مشاہدہ کیا تو بے اختیار ہو گیا اور اُس میں اُس کو " اپنی ہی تصویر نظر آئی۔ اُس کو کبھی کبھی یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ شاید میری روح ہی حافظ کے پیکر میں رہ کر مشرق کی سرزمین میں زندگی بسر کر چکی ہے"۔ مگر ان جذبات کو فی الفور چھیڑنے کے لئے رگ جان کے قریب ایک اور نشتر بھی تھا اور وہ میرین ویلمر کی ذات تھی۔ یہ فرینکفورٹ کے ایک تاجر کی حسین بیوی تھی۔ گوئٹے جب ۱۸۱۴ء میں فرینکفورٹ آیا تو اُس سے شناسائی ہوئی۔ اس حسن کی دیوی کی صورت دیکھ کر اس پیر کہن سال کی رگوں میں پھر خون حیات دوڑنے لگا اور اُس کی یاد میں اُس نے جو غزلیں لکھی ہیں اُنھیں مغربی دیوان میں زلیخا سے خطاب کیا ہے۔

مغربی دیوان کی غزلوں کا جوش اُن کے کیف اور ان کی مستانہ بیخودی سے پتہ چلتا ہے کہ کافور پیری میں ابھی جوانی کی آگ پوشیدہ ہے اور یہ آگ سوزش و حرارت میں کسی طرح فرینکفورٹ کے زمانہ سے کم نہیں۔ ان غزلوں میں ایک بات خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ گوئٹے فارسی استعارات و تشبیہات استعمال کرنے کے باوجود اپنے جذبات کے اظہار میں بالکل مغربی بلکہ جرمن ہے۔ گویا اس نے ایک مغربی عروس کو مشرقی لباس میں سنوارا ہے " وہ اپنی مغربیت کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیتا اور اُس کی نگاہ صرف انھیں مشرقی حقائق پر پڑتی ہے جس کو اُس کی مغربی فطرت جذب کر سکتی ہے"۔

۱۸۲۱ء میں اُس کا دوسرا ناول " ولہلم مائسٹر کی سرگذشت" شائع ہوا۔ اس میں ولہلم معہ اپنے لڑکے فیلکس کے سفر پر روانہ ہوتا ہے اور مختلف مقامات کی سیر کرتا ہے۔ جہاں بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ سفر سے تجربہ بھی خوب ہوتا ہے ناول میں کئی قصے ہیں جو کسی نہ کسی طرح آپس میں جوڑ دیئے گئے ہیں۔ اس ناول میں گوئٹے نے مذہب، صنعت، حرفت، تعلیم اور معاشرت کے زریں اُصولوں پر بحث کی ہے اور دلنشیں مثالوں سے انھیں سمجھایا ہے۔ مذہبی تعلیم کے متعلق کہتا ہے کہ اپنے سے اعلیٰ اور اپنے سے کمتر اور جو کچھ اپنے اندر موجود ہے اُن کی تعظیم کرنی چاہئے کیونکہ انھیں تینوں کا باہمی امتزاج صحیح مذہب کی روح ہے"۔ صنعت و حرفت کے متعلق اُس نے جو کچھ لکھا ہے اُس سے یورپ کے معاملات میں اُس کے کمال

پیش بینی کی داد دینی پڑتی ہے یعنی بھاپ اور بجلی کی ترقی، کارخانوں کی کثرت اور مزدوروں اور سرمایہ داروں کی آنے والی آویزش کا اس نے دھندلا سا اندازہ کر لیا تھا اور ان مسئلوں کو حل کرنے کی جو صلاح اُس نے دی ہے اس میں دورِ حاضرہ کے بعض ناقدین کو اشتراکیت کی داغ بیل معلوم ہوتی ہے۔

گوئٹے کا آخر زمانہ ہے دور دور سے لوگ اس سے ملنے آتے ہیں اور اُس سے ملنے کو باعث فخر جانتے ہیں۔ وہ دنیائے ادب کا بادشاہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ تمام یورپ پر اس کا سکہ بیٹھا ہوا ہے۔ گوئٹے اُن چند خوش قسمت لوگوں میں سے تھا جنہوں نے اپنی شہرت اپنی زندگی ہی میں دیکھ لی مگر اس کی طبیعت اداس رہتی تھی۔ بیٹا بالکل ناکارہ نکل گیا۔ بہو سے بھی ان بن ہو گئی بیٹے کی نالائقی سے گھر میں ایک طوفان بے تمیزی برپا رہتا تھا۔ اُس زمانہ میں اُس نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ "لوگ میری تعریف برابر اس طرح کرتے ہیں کہ قسمت نے ہمیشہ میری یاوری کی اور اب میں اپنی قسمت کا کوئی شکوہ بھی نہیں کرتا لیکن اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو میری زندگی محنت اور تکلیف کا مجموعہ رہی ہے اور میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ۷۵ برس تک مجھے چار ہفتے بھی حقیقی آرام نہیں ملا۔" رفتہ رفتہ اُس کے تمام یاران قدیم اُٹھتے جاتے تھے ۱۸۳۰ء میں جب ڈیوک مرا تو وہ بالکل خانہ نشین ہو گیا اور گھر میں بیٹھ کر رسائل وغیرہ پڑھتا۔ بہت دنوں سے اُس کو فاؤسٹ کا دوسرا حصہ لکھنے کا خیال تھا۔ اُس کو اُس نے پورا کیا اور سر بمہر کر کے اپنی موت کے بعد شائع کرنے کی تاکید کر دی آخر ایک ہفتہ کی علالت کے بعد بمقام وائمر ۲۲ مارچ ۱۸۳۲ء کو اس عالم فانی سے ہمیشہ کے لئے کوچ کر گیا۔ مرتے وقت اُس کی زبان
الف ۷ پر "روشنی، مزید روشنی" کے الفاظ جاری تھے۔ گوئٹے کی زندگی ایک اچھے خاصے عہد کی داستان ہے کیونکہ اس عہد میں جرمنی کی ادبی ترقی اپنے معراج کمال پر پہونچی اور اس ترقی میں گوئٹے کا حصہ سب سے نمایاں تھا۔ اُس نے ادب کو خستہ حال اور کم مایہ پایا لیکن جب اُسے چھوڑ کر مرا تو جرمن ادب کا نام دوسرے ادبوں کے مقابلہ میں عزت کے ساتھ لیا جاتا تھا۔

گوئٹے کو انتقال کئے سو برس ہوئے مگر اس پر تنقید کا سلسلہ اب تک بند نہیں ہوا۔ کسی نہ کسی نقطۂ نظر کے مطابق برابر اس پر تنقید ہوتی چلی آتی ہے اور حال میں اس کی شہرت تو کافی بڑھ گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں اُن کی صرف فہرست سے ڈیڑھ ہزار صفحات پُر ہو جائیں گے۔ یہ اعزاز آج تک کسی مصنف کو نہیں حاصل ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بحر تصنیف میں کچھ ایسے گہر آبدار بھی ہیں جنکی چمک تا ابد قائم رہے گی۔ لیکن اسکی بے شمار تصانیف دیکھ کر جب ہم فاؤسٹ، اِفی گینیا، تاسو، ہرمن اور ڈروتھیا اور ورتھر پر نظر ڈالتے ہیں جنکو قبول دوام کی سند متفقہ طور پر مل چکی ہے تو ہم کو اس مختصر تعداد پر تعجب ہوتا ہے اور سوال کرنے کو جی چاہتا ہے کہ اتنے بڑے آدمی کی زندہ جاوید تصنیفیں اتنی کم؟ لیکن اگر ہم اس کی زندگی پر غور کریں تو جواب آسانی سے مل جائیگا یعنی اُس کا باعث وہی اُسکی دونوں روحیں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان دو روحوں کی وجہ سے اس میں توازن و تجربہ، فہم و دانائی بہت آ گئی تھی اور وہ زندگی کے مسائل کو بصیرت کے ساتھ سمجھنے بھی لگا تھا مگر فنون لطیفہ کی نظر میں جو ادب کا معیار ہے یہی چیزیں کم درجہ کی ثابت ہوتی ہیں کیونکہ فنون لطیفہ کے پرستاروں کا یہ مذہب ہوتا ہے کہ

وہ اسی کے ہو رہتے ہیں اور اُسی کے پیچھے اپنے کو کھو دیتے ہیں۔ ان کی مملکت میں "یک گیر و محکم گیر" کا سکہ چلتا ہے۔ وہ روح کی پرواز کے لئے صرف ایک ہی فضا تیار کرتے ہیں اور اُسی پر زندگی بھر قائم رہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس طرح ایک ہی فضا میں پرواز کرنے سے جو بلندی حاصل ہوتی ہے وہ کئی راستوں میں جانے سے نہیں ہوتی۔ برخلاف اس کے گوئٹے کی طبیعت ہمہ گیر تھی اور دونوں روحوں کی کشمکش سے اس میں ایک طرح کا توازن پیدا ہو گیا تھا۔ وہ سائنس، فلسفہ، مذہب، تعلیم وغیرہ میں یکساں طور پر دلچسپی لیتا تھا۔ وہ زندگی کے نشیب و فراز دیکھ چکا تھا اور فلسفۂ زندگی پر گہری نظر رکھتا تھا اُس نے زندگی کو ہم آہنگ بنانے کی خاطر فرینکفورٹ کے زمانہ کی "طوفانی" تحریک سے اپنا تعلق قطع کر لیا اور اپنے روحانی ارتقاء کی خاطر زندگی کے مختلف مظاہر کے مطالعہ میں مصروف ہو گیا۔ اُس کی یہ ہم آہنگی زندگی کے لحاظ سے گو اُس کا سب سے بڑا کارنامہ سہی مگر فن کے راستہ میں یہ ایک سنگ راہ ثابت ہوئی کیونکہ یہاں توازن کے بجائے وسعت پرواز اور ہمہ گیری کے بجائے یک گیری کی ضرورت ہے۔

"ورتھر" کی ابتدا

جب گوئٹے وبزلر سے لوٹ کر فرینکفورٹ آیا تو اس کے بہت سے قریبی دوست فرینکفورٹ سے جا چکے تھے۔ ان کی عدم موجودگی اس پر سخت گراں گذری۔ تنہائی میں وہ پھر غور و فکر کی طرف مائل ہو گیا۔ اکثر دنیا کی بڑی بڑی شخصیتوں سے جو اس کے حاشیۂ خیال میں تھیں باتیں کرتا اور فن مصوری کے عمدہ شاہکاروں کو دیکھتا۔ ان کے علاوہ لاٹشن کی محبت کا نقش بھی اب تک دل سے مٹا نہ تھا۔ جب اس کی یاد آتی تو دل بیقرار ہو جاتا۔ لاٹشن کے رخ کی یکطرفہ تصویر دیوار پر لٹکا کر گھنٹوں دیکھا کرتا۔ ابھی فرینکفورٹ آئے دو ہفتہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ ایک خط میں لکھتا ہے کہ "میں ابھی ابھی رات کے وقت لاٹے (لاٹشن) کے رخ کی یکطرفہ تصویر سے رخصت ہو کر آیا ہوں"۔ پھر دوسرے خط میں لکھتا ہے کہ کھانا کھانے کے قبل میں نے اس کی تصویر کا بڑے شوق سے استقبال کیا"۔ تیسرے خط میں لکھتا ہے کہ "کیسٹنر! یقین مانو کل شام کو تم سے اور لاٹے سے میں قریب ایک گھنٹہ تک باتیں کرتا رہا... دروازہ کی طرف جاتے ہوئے میرا ہاتھ ایک کاغذ پر پڑا.... دیکھا تو لاٹے کی تصویر تھی۔ اس چھونے سے کیسا دل خوش کن احساس پیدا ہوا میں نے اُسے بڑے شوق سے سلام کیا اور چلا گیا"۔ اس طرح وہ برابر عالم خیال میں حرکتیں کرتا رہتا اور اس بات کی مطلق پروا نہ کرتا کہ لاٹے کیسٹنر کی بیوی ہو گئی ہے جو اس کا دوست ہے۔ "ورتھر" میں یہ واقعہ بھی تغیر کے ساتھ درج ہے۔

نومبر ۱۷۷۲ء میں گوئٹے کو اطلاع ملی کہ اس کے وبزلر کے دوست یروشلم نے خودکشی کر لی۔ سفارتخانہ کے کام میں یروشلم کا جی بہت کم لگتا۔ اس وجہ سے سفیر سے ان بن ہو گئی تھی البتہ شعر و شاعری و فلسفہ کا دلدادہ تھا۔ تنہائی پسند تھا اور اکثر چاندنی راتوں میں تنہا سیر کو نکل جاتا حساس دل رکھنے کی وجہ سے اکثر غمگین رہا کرتا اور موت کی آرزو کرتا۔ خودکشی کے کچھ دنوں قبل اس نے ایک شخص سے خودکشی کے مسئلہ پر گفتگو بھی کی تھی جب محفل رقص کے موقع پر گوئٹے اور لاٹے کی ملاقات ہوئی تو یروشلم بھی وہاں موجود تھا۔ نیلا کوٹ اور پیلا پتلون پہنتا تھا جو ورتھر کی

پوشاک بتائی گئی ہے۔ ویزلر کے ایک دوسرے سفیر کے پرائیویٹ سکریٹری کی حسین بیوی پر ہزار جان سے عاشق ہوگیا مگر کچھ سوسائٹی کی طعنہ زنی اور اپنی معشوقہ کی سرد مہری اور بے نیازی سے تنگ آکر اُس نے ایک روز آدھی رات کو اکتوبر ۱۷۷۲ء میں کیسٹنر سے پستول منگوا کر خودکشی کرلی۔ اس خطرناک واردات کے دن وہ اپنے کاغذوں کی دیکھ بھال میں مصروف رہا اور متعدد بار باہر بھی گیا۔ اسی روز اس نے اپنا قرض وغیرہ بھی ادا کیا رات کو نوکر سے آگ جلوائی اور دوسرے روز علی الصباح تیار رہنے کا حکم دیا۔ رات کو اس نے تھوڑی سی شراب بھی طلب کی تھی۔ اُس کی میز پر لیسنگ کا ناول "ایمیلا گیلوٹی" کھلا پڑا تھا۔ چونکہ اس نے خودکشی کی تھی اس لئے عیسائی مذہب کے مطابق کوئی پادری اُس کے جنازہ میں شریک نہیں ہوا اور نہ کوئی مذہبی رسم پوری کی گئی۔ اس دلدوز واقعہ کی خبر سے تمام قصبہ میں اتنی سنسنی پھیلی کہ بہت سے لوگ اپنی نیند کھو بیٹھے۔

گوئٹے ان واقعات کے معلوم ہونے پر اپنی سوانح عمری میں لکھتا ہے کہ "اسی زمانہ میں مجھے یروشلم کی موت کا حال افواہاً معلوم ہوا اور بعد کو پورے واقعہ کی تفصیل بھی معلوم ہوگئی۔ اسی وقت "ورتھر" کا خاکہ ذہن میں تیار ہوگیا اور تمام چیزیں مکمل صورت میں اس طرح جمع ہوگئیں جس طرح ایک برتن میں جمتا ہوا پانی ایک معمولی حرکت سے جمکر فوراً برف ہو جاتا ہے"۔ گوئٹے کا ایک مشہور جرمن سوانح نگار گوئٹے کے اس بیان کو تسلیم کرتا ہے مگر دورِ حاضرہ کے ایک مشہور انگریز ناقد پروفیسر رابرٹسن کو اس بیان کے تسلیم کرنے میں اس لئے پس و پیش ہے کہ یروشلم کی موت کے تقریباً ۱۵ ماہ بعد یہ افسانہ لکھا گیا حالانکہ بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ افسانہ فوراً لکھا گیا۔ لیکن گوئٹے کے بیان میں تعجب کی کیا بات ہے! وہ صرف خاکہ کا ذکر کرتا ہے افسانہ لکھنے کا ذکر نہیں کرتا۔ خود فاؤسٹ کا خاکہ اس کے ذہن میں اسٹراس برگ کے زمانہ میں آیا مگر یہ خاکہ اس کے دماغ میں کئی برس پڑا رہا۔ پھر اُس نے فرینکفورٹ میں کچھ لکھ کر قلم روک لیا۔ غرض اس کام کو اس نے کئی دفعہ چھوڑا اور اٹھایا تب کہیں مدتوں کی محنت کے بعد پورا کیا۔ اسی طرح بہت ممکن ہے کہ یروشلم کی موت نے افسانہ کا ایک معمولی خاکہ اس کے ذہن میں تیار کر دیا ہو مگر لکھنے کی نوبت نہ آئی ہو اس لئے کہ اس زمانہ میں وہ زیادہ تر نقاشی اور مصوری میں مصروف رہا۔ پھر جب طبیعت مائل ہوئی تو لکھنے لگا اور اُس کو پورا کر دیا۔

ہم بتا چکے ہیں کہ فرینکفورٹ میں اس کی طبیعت کو افسردگی نے گھیر رکھا تھا۔ دل برابر ناخن غم سے کاوش کا تقاضا کرتا تھا۔ لاٹے کی غارتگر صبر و شکیب یاد آتی تو دل بے اختیار ہو جاتا۔ وہ ویزلر کی "جنت نگاہ و فردوس گوش" یاد دل سے محو کرنا چاہتا تھا اسی لئے اُس نے نقاشی و مصوری کی طرف توجہ بھی کی تھی مگر ناکام رہا۔ آخر اس نے اپنی روحانی کاوشوں اور اندرونی پریشانیوں کو کم کرنے کی ایک تدبیر سوچی اور وہ تدبیر یہ تھی کہ دنیا والوں کو بھی اس سوزِ غم میں شریک کر لیا جائے تاکہ جو آگ ایک سینہ میں جل رہی ہے اگر وہ سب کے سینوں میں جلنے لگ جائے تو شاید اُس کی سوزش بھی کم ہو جائے اس خیال سے ویزلر کی داستان کو اُس نے ایک ادبی تصنیف کا آرٹ بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا

سناتے ہیں انھیں افسانہ قیس بہانے ہیں یہ عرضِ مدعا کے

مگر یہ واضح رہے کہ ورتھر کے قصہ کا اہم اور آخری جزو خود گوئٹے کی ذاتی تجربات سے بالکل مختلف ہے۔ البتہ اول باب کا بیشتر حصہ

گوئٹے کی داستان ویزلر کا ایک رنگین ورق ہے جس کو وہ تھوڑے سے تصرف کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ گوئٹے ورتھر نہیں ہے۔ گو ایک حد تک دونوں کی سیرت بہت ملتی جلتی ہے مگر دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ گوئٹے خارجی دنیا کے حالات سے آشنا، اپنے اوپر قابو رکھنے والا انسان ہے۔ اس کا عشق کبھی جنون کی اس حد تک نہیں پہنچا کہ خودکشی کی نوبت آئی ہو جیسے کہ ورتھر کو پیش آئی۔ اسکا قدم میدان زندگی میں نہایت مستحکم طریقہ پر پڑتا ہے۔ وہ منزل عشق میں اپنی تمام وارفتگی کے باوجود کہہ سکتا ہے کہ

باچنیں زور جنوں پاس گریباں داشتم در جنوں از خود نہ رفتن کار ہر دیوانہ نیست

اور ورتھر سراسر تخیل و جذبات کا بندہ ہے کبھی خوش کبھی ناخوش۔ فطرت کے دل خوش کن مناظر سے آخر میں اس کو تکلیف ہونے لگتی ہے اور سب سے بڑی مسرت اُس کو اشکباری میں ملتی ہے۔ ورتھر کی سیرت کا یہ رنگ یروشلم کی سیرت سے ملتا جلتا ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ گوئٹے نے اپنی اور یروشلم کی سیرت کے باہمی امتزاج سے ورتھر کی تشکیل کی ہے۔

فرینکفورٹ آ کر اُس کی طبیعت ادب سے ہٹ کر مصوری وغیرہ کی طرف مائل ہوگئی تھی لیکن ۱۷۷۴ء کے موسم گرما میں اُس کی طبیعت میں لکھنے کا جوش پیدا ہوا اور جوش کا پیدا ہونا تھا کہ اس نے اپنے کو تمام کاموں سے علیحدہ کر کے "ورتھر" لکھنا شروع کیا اور ٹھیک ایک مہینہ میں ختم کیا۔ سال کے آخر میں یہ افسانہ چھپ کر شایع ہوگیا۔

"ورتھر" کا قصہ

ورتھر ایک نہایت تیز حس رکھنے والا نوجوان ہے جو شاید گوئٹے کا ہم عمر ہے۔ بلا کا ذہین ہے قابلیت بھی ایسی ہے کہ جس کام میں لگا دیا جائے اسکو اچھی طرح پورا کریگا مگر پہلو میں ایسا حسن پرست دل ہے جو پکار پکار کر کہتا ہے کہ

الفراق اے صبر و تمکیں، الوداع اے عقل و دیں

طبیعت میں طوفان کا سا جوش ہے اور قدرت نے ایسا رنگین تخیل عطا کیا ہے کہ عارض گل و شفق کی سرخی کو اپنے ہی خون دل کی لالی سمجھتا ہے۔ مناظر قدرت کے نظارہ سے بقدر تخیل بیقرار ہو جاتا ہے۔ پابندیاں خواہ وہ کسی قسم کی ہوں اسکے لئے بلائے جان ہیں۔ آزادی کا دم بھرتا ہے اس وجہ سے نوکری وغیرہ میں اُسکا جی نہیں لگتا۔ ایک دفعہ سفارتخانہ میں ملازم بھی ہوگیا مگر آخر استعفا دیکر علیحدہ ہوگیا۔ افسانہ میں کہیں اس کے باپ کا ذکر نہیں ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرچکا ہے۔ باپ کے مرنے کے بعد اُسکی ماں نے کسی دوسرے قصبہ میں جا کر سکونت اختیار کرلی ہے۔ ورتھر کا بچپن نہایت مسرت و شادمانی کے عالم میں گذرا۔ البتہ استاد کی تیوری کبھی کبھی ناگوار ساعت ضرور پیدا کر دیتی تھی۔ دادی جان پریوں کے قصے سنایا کرتی تھیں۔ قصبہ کے سامنے پہاڑ اور دریا کا منظر کافی دلچسپ تھا۔ محلہ کے لڑکوں کے ساتھ کھیل کود خوب ہوتا مگر کھیل کی حد نیبو کے دو درخت تھے جن سے آگے وہ نہیں بڑھتا تھا اور اسی حد پر کھڑے ہو کر تخیل کے زور سے پہاڑوں کے اندرونی مناظر کی سیر اور دریا پر سفر کرتا۔ بچپن کے آخری زمانہ میں کسی لڑکی سے ملاقات ہوئی جو اس سے عمر میں بڑی تھی۔ اُس کی ہم نشینی سے ورتھر کی تمام خفیہ قوتیں بیدار ہونے لگیں اور

اُس کو اپنے دل کی گہرائی کا احساس ہونے لگا لیکن اُس کی صحبت دیرپا ثابت نہیں ہوئی کیونکہ وہ کچھ دنوں کے بعد انتقال کر گئی۔ ورتھر پھر رنج و الم کا شکار ہو کر تنہائی کی زندگی بسر کرنے لگا اور اس دوران میں پھر ایک لڑکی لیونورا سے ملاقات ہوئی جو خود ورتھر پر عاشق ہو گئی مگر ورتھر اُس سے کسی طرح دور ہی رہا۔ یہ زمانہ بہر حال لطف سے گذرتا ہے کہ رفتہ رفتہ وہ بچپن کی معصومانہ اور بے فکری کی زندگی سے نکل کر شباب کی خارزار وادی میں قدم رکھتا ہے جس کا ہر جلوہ نظر فریب اور جس کا ہر خار جگر دوز ہے۔ مئی کا خوشگوار مہینہ ہے وادیاں اور مرغزار دل کو لبھاتے ہیں۔ بہار کی طراوت گدگدی پیدا کرتی ہے۔ فضا میں تتلی کو مصروف رقص دیکھ کر بے اختیار پرواز کی خواہش ہوتی ہے۔ سرشاری اور بے خودی کا عالم ہے۔ نگاہ کسی نو بہار ناز کی طلب میں محو تجسس ہے کہ آخر دل کی مراد پوری ہوتی ہے یعنی جون میں ایک محفل رقص کے موقع پر ایک حسینہ شارلٹ سے ملاقات ہوتی ہے۔ اس کی نگاہ بیباکانہ سے ورتھر کا دل ہاتھ سے چلا گیا اور دل کے ساتھ صبر و قرار بھی رخصت ہو گیا۔ ورتھر اسی روز سے برابر شارلٹ کے مکان پر جاتا ہے اور اس کے پاس بیٹھ کر باتوں میں اُس سے دل بہلاتا ہے۔ گو اس کو معلوم ہو چکا ہے کہ شارلٹ ایک شخص البرٹ سے منسوب ہے مگر ورتھر اسکی کچھ پروا نہیں کرتا۔ اسی طرح دن گذرتے ہیں کہ جولائی کے آخر میں شارلٹ کا منگیتر البرٹ آتا ہے حالانکہ البرٹ نیک سیرت اور رقابت کے جوش سے خالی ہے مگر اسکی آمد ہی سے ورتھر کی حرارت عشق سرد پڑنے لگتی ہے اور اب اسکی طبیعت میں نہ تو وہ اگلی سی روانی باقی رہتی ہے اور نہ وہ والہانہ شیفتگی۔ وہ معاملہ کی نزاکت کو سمجھتا ہے مگر تب بھی کچھ نہیں کرتا۔ مناظر قدرت کی دلفریبیاں اب اسکے دل میں کوئی شوق نہیں پیدا کرتیں یعنی "جو جذبہ مناظر قدرت کی طرف سے اسکے دل میں محبت پیدا کر کے اس کو مسرت و شادمانی سے بیخود کر دیتا اور بہشت کی ساری نعمتوں کو اُس کے سامنے پیش کرتا تھا اُس نے اب ایک ناقابل برداشت درد و محن کی صورت اختیار کر لی ہے"۔ اس نا اُمید زندگی کی نوبت یہانتک پہونچی کہ وہ البرٹ سے خودکشی پر بحث کرتا ہے۔ پھر آگے چلکر اُس کے سامنے سے سارے حجابات اُٹھ جاتے ہیں اور قبر کا گڑھا منہ پھیلائے ہوئے بھیانک انداز میں دکھائی دیتا ہے اور وہ زندگی کے فانی ہونے پر بحث کرتا ہے ان باتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسکا دماغ اب تندرست نہیں رہا۔ اسکے دوست ولہلم کو جب ورتھر کے ان خیالات سے آگاہی ہوتی ہے تو وہ ورتھر کو بار بار وہاں سے چلے آنے کی تاکید کرتا ہے مگر ورتھر کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈھ کر رک جاتا ہے۔ بالآخر ۱۰ ستمبر کو ورتھر چلا آتا ہے یہاں اول باب ختم ہوتا ہے۔

دوسرے باب کے شروع ہی میں ہم کو علم ہوتا ہے کہ ورتھر کسی سفارتخانہ میں منشی کے عہدہ پر مامور ہو گیا ہے کام میں مشغول رہنے سے اُس کی طبیعت میں سکون پیدا ہو گیا ہے اور کام بھی وہ جی لگا کر کرتا ہے مگر سفیر سے ان بن ہو گئی کیونکہ سفیر چڑچڑے مزاج کا آدمی ہے اور کاغذات وغیرہ میں زبردستی قاعدہ وغیرہ کی پابندی کراتا ہے دوران ملازمت میں اُسکو وہاں کے اُمراء سے ملنے کا موقع ملتا ہے اور ان کے اخلاق کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر جس میں منصب کی لالچ کا نمایاں حصہ ہے اُسکو غصہ بھی آتا ہے اور افسوس بھی۔ اسی طرح سال ختم ہو جاتا ہے۔ فروری میں اسکو شارلٹ اور البرٹ کی شادی کا حال معلوم ہوتا ہے اور وہ اُن کو مبارکباد دیتا ہے۔ مارچ میں طبقہ اُمراء میں سے اُسکا ایک دوست کاونٹ سی اُسکو مدعو کرتا ہے جس دن ورتھر کاونٹ کے یہاں جاتا ہے اتفاق سے اُسی روز کاونٹ کے یہاں اُمراء کے مجمع کا دن ہے اُمراء کو منصب اور درجہ کا بہت خیال ہے۔ وہ کسی کم درجہ کے آدمی سے ملنا اپنی ہتک سمجھتے ہیں۔ ورتھر وہاں بھولے سے ٹھہر جاتا ہے اور ایک جانی پہچانی

لڑکی سے باتیں کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر وہ اسوقت جواب سے احتراز کرتی ہے آخر ورتھر سے کہہ دیا جاتا ہے کہ آپ یہاں سے تشریف لیجائیے ورتھر اس پر بہت برہم ہوتا ہے اور اسی غصہ کی حالت میں گھر آتا ہے اور اسی مہینہ میں استعفا دیدیتا ہے۔ مئی میں ایک پرنس کے ساتھ سیر و تفریح کی خاطر اُس کی دعوت پر اسکے یہاں جاتا ہے مگر اصل مطلب اس سے فوج میں داخلہ کی سفارش کرانا ہے۔ پرنس اس خیال کی مخالفت کرتا ہے جس سے ورتھر اس خیال سے باز آجاتا ہے۔ جون کے آخر میں پھر وحشت دل اُسکو شارلٹ کی طرف لیجاتی ہے۔ البرٹ اُس کا خیر مقدم کرتا ہے لیکن اب وہ زمیں رہی نہ وہ آسماں، نہ وہ دل رہا اور نہ وہ حوصلے۔ ہر چیز اُسے بیگانہ معلوم ہوتی ہے۔ اُس کو کسی چیز سے لطف نہیں ملتا کیونکہ زندگی کا سارا آرام جو غم کی افزائش اور آنسوؤں کے گرم قطروں میں پنہاں تھا چلا گیا۔ اب نہ وہ گریۂ سحری رہا نہ وہ آہ نیم شبی رہی

گو شارلٹ اب البرٹ کی وفاشعار بیوی بن چکی ہے مگر ابتدائی ملاقات کے وہ آزادی کے مزے ابھی تک دماغ سے محو نہیں ہوئے۔ شارلٹ اپنی اور ورتھر کی طبیعت کی ہم آہنگی محسوس کرتی ہے اور ورتھر کی شادی اپنے کسی دوست کے ساتھ کرکے ورتھر کو اپنے نزدیک ہی رکھنا چاہتی ہے۔ ورتھر وہاں کچھ دن اور رہ جاتا ہے مگر اس کا دل نہ تو مقصد کی تڑپ سے معمور ہے اور نہ اُمید کی چمک سے اُسکے عزم میں استقامت ہے مستقبل کا وہ خیال کرتا ہے تو لرز جاتا ہے۔ ان افکار کے ہجوم میں اُس کو ہر طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آتی ہے لیکن اس گہری تاریکی میں ایک اور چیز ہے جو "دلیل سحر" کا کام دے سکتی ہے اور وہ مذہب ہے۔ وہ مذہب کی طرف جھکتا ہے مگر وہاں بھی اسکی تسلی نہیں ہوتی۔ فطرت کے مہیب مناظر مثلاً طوفان و سیلاب سے اُسکو دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے جاڑے کی ٹھنڈی اور تاریک طوفانی راتوں میں وہ تنہا سیر کو نکل جاتا ہے لیکن وحشت کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب اُسکا وقت قریب آتا جاتا ہے اور پھر اسی اضطراب میں وہ موت کا دروازہ کھٹکھٹانے کی ٹھان لیتا ہے مگر مرنے سے پہلے اس دردمند عشق کی ایک خواہش ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک دفعہ شارلٹ کے دیدار سے پھر آنکھیں منور ہو جائیں آخر البرٹ کی عدم موجودگی میں کرسمس سے ایک دن قبل شام کو وہ شارلٹ کے یہاں جاتا ہے اور اوسیان کا ترجمہ پڑھتا ہے اور پڑھتے پڑھتے دونوں بیتاب ہوکر روتے ہیں۔ پھر دونوں اسی بیقراری کے عالم میں ہم آغوش ہوتے ہیں اور ورتھر شارلٹ کے عفت مآب لبوں پر صدہا بوسہ شوق دیتا ہے۔ شارلٹ فوراً اپنے کو ورتھر کی اس بے راہ روی سے چھڑا کر پاس والے کمرہ میں چلی جاتی ہے۔ ورتھر مایوسی اور نامرادی کے عالم میں پکارتا ہے مگر وہاں جواب ندارد۔ آخر واپس چلا آتا ہے اور دوسرے روز البرٹ سے پستول منگوا کر ٹھیک ۱۲ بجے رات کو خودکشی کر لیتا ہے۔ لیسنگ کا ناول ایمیلا گیلوٹی جس میں خانگی زندگی کی آویزش کے حالات ہیں اس کی میز پر کھلا ہوا پایا جاتا ہے۔ ورتھر کی لاش گویا زبان حال سے یہ سوال کر رہی ہے۔ کس کے گھر جائیگا سیلاب فنا میرے بعد؟

ورتھر کی موت ایک ایسی شریف النفس ہستی کی موت ہے جس پر صاحبان دل جتنا ماتم کریں کم ہے۔ ورتھر میں صحیح جذبہ عشق کے ساتھ انتہا درجہ کی غیرت اور حیا بھی ہے۔ وہ اپنے نفس کی عزت کرتا ہے اور کسی قسم کی بے عزتی برداشت نہیں کرتا۔ وہ کمزوروں پر رحم کرتا ہے اور ظالموں اور بدنہادوں کا جانی دشمن ہے۔ وہ قدرت کا شیدائی اور حسن کا پرستار ہے۔ مگر اُس کی سیرت کا سب سے بڑا نقص اُس کی قوت ارادی کی کمزوری، اسکی تلون مزاجی اور کاہلی ہے لیکن ہم ان باتوں کے باوجود اس سے محبت کرتے ہیں اور اُس کی کمزوریوں پر پردہ ڈالتے

ہیں کیونکہ اُس کا دل اتنا نازک اور حساس واقع ہوا ہے کہ عشق کی ناکامی اسکی طبیعت کا فطری سوز و گداز اور سوسائٹی کی بداطواری اُسکو توڑ دیتی ہے۔ افسانہ کی ابتدا ہی سے ہم کو ورتھر کے المناک نتیجہ کا کچھ کچھ گمان گذرنے لگتا ہے اور جب وہ آگے چلکر مغموم رہنے لگتا ہے اور خودکشی پہ بحث کرتا ہے تو یہ گمان یقین سے بدل جاتا ہے اور اسوقت معلوم ہوتا ہے کہ اُسکی قسمت کا راز اُسکی سیرت میں پوشیدہ ہے۔ ورتھر ہر چیز کو تخیل کی نظر سے دیکھتا ہے وہ تخیل کا عاشق اور جذبات کا بندہ ہے آخر میں وہ خارجی ماحول سے بالکل بیگانہ ہو جاتا ہے اور اُس کی فطرت تاریک و متشائم خیالات کا گہوارہ اور رنج والم کا مسکن بن جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کے لئے یہ دنیا بالکل ناموزوں جگہ ہے اور ایسا آدمی یہاں زیادہ دن نہیں رہ سکتا۔ ہاں اگر تخیل کے ساتھ عمل بھی ہوتا تو ورتھر کو اپنے ماحول کی مشکلات کا احساس ہوتا اور تب شاید اُس کی جان بچ جاتی۔ خالی تخیل زندگی کے لئے سخت خطرناک ہے کیونکہ ایسا تخیل قویٰ کو مضمحل کر کے زندگی کو ختم کر دیتا ہے۔ اگر زندگی قائم رکھنا ہے تو تخیل کے ساتھ عمل بھی ضروری ہے۔ عمل کے اس فقدان سے "ورتھر" تحریک طوفان و ہیجان سے ایک علیحدہ چیز ہو گئی ہے اور چونکہ اس میں اس تحریک کا انفعالی اثر ہے اس لئے ہم اُس کو رومانیت کا مظہر کہہ سکتے ہیں جہاں عمل کے بجائے سراسر جذبات کی دنیا آباد ہوتی ہے۔

نپولین نے "ورتھر" پر رائے زنی کرتے ہوئے کہا تھا کہ "ورتھر کی طبعی افسردگی اسکی خودکشی کا باعث ہوئی حالانکہ اُس کی خودکشی کی وجہ اُس کے ناکام عشق کو ہونا چاہئے تھا۔ پھر اُس کی افسردگی میں اُس کے مقاصد کی ناکامی کو بھی دخل ہے" یعنی نپولین اس کو خلاف فطرت قرار دیتا ہے۔ ہرڈر کا اعتراض تھا کہ یہ آرٹ کا نقص ہے گوئٹے نے ان دونوں اعتراضوں کو صحیح مان لیا اور خاموش ہو گیا لیکن جارج ہنری لوئس کا خیال ہے کہ گوئٹے نے جو کچھ لکھا ہے وہ بالکل صحیح اور عین فطرت کے مطابق ہے کیونکہ ورتھر کا آخری حصہ یروشلم کی داستان کا چربہ ہے اور جب اصلی واقعہ یہی ہے کہ یروشلم کو عشق میں اور مقاصد کے حصول دونوں میں ناکامی ہوئی تو پھر نتیجہ خلاف فطرت کیسے ہو سکتا ہے۔

ورتھر کے بعد ہم جس شخص سے روشناس ہوتے ہیں وہ ورتھر کی محبوبہ شارلٹ ہے۔ شارلٹ کسی حد تک خیال پرستی کی شکار تو ضرور ہے مگر گھر کے کاروبار اور بچوں کی دیکھ بھال سے اُس میں یہ جذبہ ورتھر کے جنون تک نہیں پہنچتا۔ وہ اپنے شوہر کی وفا شعار بیوی بھی ہے اور ورتھر سے اُس کو طبعی مناسبت بھی ہے مگر وہ کوئی ایسا قدم نہیں اُٹھانا چاہتی جس سے ورتھر کو کسی قسم کی بیجا محبت ہو۔ شارلٹ کا شوہر البرٹ فی الواقعی کیسٹنر کی شبیہہ ہے مگر قصہ میں کیسٹنر سے بہت مختلف ہے وہ ایک متین خشک مزاج سرکاری ملازم ہے۔ ہر چیز کو عقل کی عینک سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ گو اس میں اور اسکی بیوی کی سیرت میں بڑا فرق ہے مگر وہ اپنی بیوی سے بے حد محبت کرتا ہے۔ ان تینوں شخصوں کے علاوہ اور بہت سے اشخاص سے ہماری پر لطف ملاقات ہوتی ہے جن کی سیرت کے متعدد پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں۔

"ورتھر" کی شہرت

"ورتھر" شائع ہوئی تو لوگوں نے اسکا نہایت پرجوش استقبال کیا کیونکہ اٹھارہویں صدی کی ساری جذباتی خصوصیت اُس میں صاف

جھلکتی تھی اور یہ گوئٹے کا بڑا کمال تھا کہ اس نے "ورتھر" کو اس عہد کا ایک ایسا مکمل آئینہ بنا دیا جس میں ہر شخص اپنے جذبات کی صحیح تصویر دیکھ سکتا تھا اس عہد کی خاص خصوصیت خیال پرستی ہے جو ایک روحانی بیماری کے درجہ تک پہنچ گئی تھی۔ جذبات کی آگ کو بجائے عمل کے آنسوؤں سے بجھانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر لوگ بے اختیار ہو کر نوحہ کرتے تھے۔ لب و لہجہ میں بیقراری اور دردمندی کا قبضہ ہو گیا تھا۔ اسی زمانہ میں عقلیت کی ترقی سے مذہب میں انقلاب برپا ہو رہا تھا۔ مسیحیت پر سخت عقلی تنقیدیں ہو رہی تھیں جس سے شک و تذبذب کی عام روحانی وبا پھیل گئی اور یہ وبا مذہب کے علاوہ فلسفۂ اخلاق و سیاست غرض زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہو گئی۔ لوگ قدیم روایات پر بیدردی سے نکتہ چینی کرنے لگے۔ "ترقی" کی آواز لوگوں کو پریشان کرنے لگی۔ آزادی فکر و آزادی عمل کی ہر طرف پکار اُٹھی۔ اس ہنگامہ میں سوسائٹی کا نظام درہم برہم ہونے لگا اور اس برہمی کا سب سے بڑا شکار شادی بیاہ کی مقدس رسم ہوئی خیالات کے اس جوش میں خانگی زندگی کی دیواریں بھی محفوظ نہ رہ سکیں یعنی بہت سے زندہ دل ایسے تھے جو شادی کی مبارک رسم کو پس پشت ڈال کر بجائے اپنے ہمسایوں کے اُن کی بیویوں سے کھلم کھلا صحبت کرنے لگے۔ غرض یہ سارا آتش گیر مادہ یوں ہی تیار ہو رہا تھا کہ گوئٹے نے "ورتھر" کی چنگاری اُس میں ڈال دی اور اُس چنگاری کا پڑنا تھا کہ سارا مادہ چشم زدن میں اُڑ گیا۔ گوئٹے اپنی سوانح عمری میں لکھتا ہے کہ "اس چھوٹی سی کتاب کا نہایت زبردست اثر پڑا کیونکہ اس نے اس عہد کی خصوصیتوں کو چھیڑ دیا جس طرح ایک دیا سلائی دکھانے سے بارود سے بھری ہوئی سرنگ اُڑ جاتی ہے اسی طرح میری تصنیف سے زبردست دھماکا ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے عہد کے نوجوانوں نے اپنی زندگی کو کھوکھلا کر کے بارود کی سرنگ کی طرح بنا لیا تھا اور زور بھی اس لئے زیادہ تھا کہ اس میں اس عہد کے تمام بیجا مطالبات، ناآسودہ خواہشات اور خیالی تکالیف کا پرجوش طریقہ سے ذکر کیا گیا تھا۔ عوام سے اس بات کی خواہش کرنا بالکل فضول ہے کہ وہ ذہن کو فن کی نظر سے دیکھیں۔ واقعتاً اس کا صرف نفس مضمون دیکھا گیا۔ میرے بعض دوستوں نے بھی اُس کو اسی نظر سے دیکھا اس لئے ان میں وہ پرانا تعصب بھی ظاہر ہوا کہ ہر چھپی کتاب میں کوئی نہ کوئی اخلاقی سبق ضرور ہونا چاہئے، لیکن زندگی کی اصلی تصویر میں ایسی کوئی چیز نہیں ہوتی کیونکہ زندگی نہ تو سراہتی ہے اور نہ مذمت کرتی ہے بلکہ احساس اور عمل کو قدرتی نتائج کے ساتھ آگے بڑھاتی ہے اور یہی اُسکا سب سے بڑا سبق ہے"۔ کارلائل کا خیال ہے کہ "اس عہد کے اثرات کو تمام لوگ محسوس کرتے تھے مگر ان اثرات میں آواز صرف گوئٹے نے پیدا کی اور گوئٹے کی شہرت کا راز بھی اسی میں پوشیدہ ہے۔ اپنے دل میں اُس نے وہ چیز محسوس کی جو اُس عہد کے ہزاروں دلوں میں چبھ رہی تھی اور اپنی خداداد تخلیقی قوت سے جو شاعر ہونے کی حیثیت سے اُسکا حصہ تھا، اُس نے اس احساس کو ایک صورت میں متشکل کر کے اُس کا نام رکھا اور اسکی جائے سکونت بھی تیار کر دی۔ اپنے اس کارنامہ سے وہ اپنے عہد کی زبان بن گیا۔" "ورتھر" کے شہرت کی ایک وجہ اور بھی تھی یعنی یروشلم کی خودکشی کا واقعہ ابھی تازہ تھا اُس کی موت کی تفصیلات سے عام و خاص دونوں گروہوں میں سخت بے چینی پیدا ہو گئی تھی اور جب "ورتھر" شائع ہوئی جس میں یروشلم کے واقعہ کو فنی نقطۂ نظر سے پیش کیا گیا تھا تو لوگ بے اختیار "ورتھر" کے استقبال کے لئے آگے بڑھے۔ کہا جاتا ہے کہ جرمن زبان میں آج تک "ورتھر" جیسی شہرت و مقبولیت اور کسی

تصنیف کو حاصل نہیں ہوئی اور نہ کسی ملک کی کسی ادبی تصنیف نے بھی آج تک اتنی جلدی اتنی عظیم الشان شہرت پائی۔ لوگوں کے پرجوش استقبال کی نوبت یہاں تک پہونچی کہ نوجوانوں نے ورتھر کی معروف پوشاک پہننی شروع کر دی اور کتنوں نے نقل دام دی ہی شائع ورتھر کی طرح ذرا بندو دلفگار بن کر خود کشی بھی کر لی ہے کتنی بیویاں اپنے خشک مزاج شوہروں سے عاجز آ کر کسی رنگیں مزاج ورتھر کی دلنواز صحبتوں سے لطف اٹھانے کی آرزوئیں کرنے لگیں۔ ادب میں بھی ورتھر بہت بُری طرح سرایت کر گئی۔ ورتھر اور شارلٹ پر نظمیں لکھی گئیں جنھیں عوام سڑکوں پر گاتے پھرتے تھے۔ خیر جرمنی میں تو یہ سب ہوتا رہا مگر یورپ کے دوسرے ملکوں میں بھی اس کی شہرت بہت جلد ہو گئی۔ فرانس میں اس کا شاندار خیر مقدم کیا گیا اور انگلستان میں اسکا پہلا ترجمہ فرانسیسی سے شائع ہوا۔ تھوڑے دنوں میں گوئٹے یورپی ادب کی ایک نہایت ممتاز اور قابل احترام ہستی تسلیم کیا جانے لگا، ور مدتوں وہ صرف " ورتھر کے مصنف " کی حیثیت سے مشہور رہا۔ لیکن " ورتھر " کو صرف اٹھارہویں صدی کی خیال پرستی کا آئینہ ہی نہیں سمجھنا چاہئے۔ " ورتھر " ایک ایسے زخمی دل کی پکار ہے جو خیال پرستی کا عہد ختم ہو جانے کے بعد بھی آج ہماری توجہ کو کاوش و اضطراب کے ساتھ اپنی طرف جذب کرتی ہے۔ کون ہے جسکی آہوں سے افسانۂ سوز و گداز نہ نکلا ہو اور کون ہے جو حادثات زمانہ کے بیرحم ہاتھوں سے محفوظ رہا ہو؟ جب تک سینۂ انسان میں رنج و الم کا داغ اور درد کی خلش موجود ہے اور جب تک دل کے ٹکڑے آنکھوں کی راہ بہہ نکلنے کے لئے تیار رہیں ورتھر ایک زندہ اور غیر فانی ہستی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر شخص کو اس سے ہمدردی ہو جاتی ہے۔

الف ۸

" ورتھر " کا طرز بیان

گوئٹے نے جو طرز تحریر اختیار کیا وہ " ورتھر " کے لئے خاص طور پر موزوں تھا کیونکہ کسی فرد کی نفسی تصویر خطوں سے اچھی اور کسی طرز میں نہیں پیش کی جا سکتی۔ اس طرز کا سراغ لگانے کے لئے تھوڑی سی تفصیل کی ضرورت پڑے گی۔ سترہویں صدی کے آخر میں انگلستان میں تھیٹر صرف طبقۂ امراء کا ایک آلۂ تفریح بن گیا تھا۔ عوام اور اوسط درجہ کے لوگوں کو اس میں مطلق بار نہ ملتا تھا تھیٹر کی یہ فضا خود اُس کی ترقی کے لئے نہایت ناساز گار ثابت ہوئی کیونکہ عوام کا داخلہ بند کر کے اُس نے تخیل و جذبات پر بھی بندش کر دی اس بندش سے لوگ کسی ایسے ذریعہ کی تلاش کرنے لگے جو اُن کے تخیل و جذبات کی خواہش اظہار کو پوری کرے۔ بالآخر اس خواہش کا ظہور افسانوں میں ہوا۔ تھیٹر کی تنزلی اور تخیل و جذبات کی خواہش اظہار نے افسانہ نویسی کی بنا ڈالی اور یہ بنا روز بروز استوار ہو کر ایک شاندار عمارت میں بدل گئی۔

اسی زمانہ کے ایک مصنف رچرڈسن (۱۶۸۹ - ۱۷۶۱) نے فوراً لوگوں کی اس اندرونی خواہش کو بھانپ لیا۔ رچرڈسن اوائل عمر میں ایک چھاپہ خانہ میں ملازم تھا اور چونکہ پڑھا لکھا تھا اس لئے نوعمری ہی کے زمانہ سے نوجوان لڑکیاں اس کے پاس آکر اپنے دوستوں کو عشقیہ خطوط لکھوایا کرتی تھیں۔ خطوط لکھتے لکھتے اُس کو عورتوں کے جذبات و حسیات سے کماحقہ واقفیت ہو گئی۔ بیشتر اسکے افسانوں کی بنیاد اسکا یہی تجربہ ہے۔ ۵۱ برس کی عمر میں اُس نے اپنا پہلا افسانہ پامیلا شایع کیا اور سات برس بعد اُسکا شاہکار

کلیریسا شائع ہوا۔ ان افسانوں کا طرز یہ ہے کہ ایک دور اُفتادہ لڑکی خطوط کے ذریعہ سے اپنے کسی عزیز یا دوست کو آپ بیتی سناتی ہے اور اُس آپ بیتی میں وہ اپنے دھڑکتے ہوئے دل کا افسانہ عشق، پھر اپنی مصیبتوں اور تکلیفوں کا حال نہایت سوز و گداز کے ساتھ بیان کرتی ہے اور آخر میں کوئی نہ کوئی اخلاقی نتیجہ نکلتا ہے۔ ریچرڈسن چونکہ طبقۂ عوام خاصکر اوسط درجہ کے لوگوں سے اچھی طرح واقف تھا اسلئے ان افسانوں میں اس نے انھیں کے نازک اور غمگین جذبات کی تصویر تخیل کی رنگ آمیزی کے بعد بڑی اُستادی سے کھینچی ہے اس کے ناولوں کو یورپ میں بڑی شہرت ہوئی۔ فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں ان کے ترجمے شائع ہوئے۔ مشہور فرانسیسی مصنف روسو کے افسانہ "نیا یونان" کا طرز ریچرڈسن ہی کے افسانوں کا ہے۔ جرمنی میں گیلرٹ نے جو لائپزگ میں ادب کا پروفیسر تھا ریچرڈسن کے ناولوں کا ترجمہ شائع کیا گوئٹے خود گیلرٹ کے لکچروں میں شامل ہو چکا تھا اُس نے ان ترجموں کو مع روسو کے افسانہ کے شوق سے پڑھا اور جب ورتھر لکھنے بیٹھا تو اُس نے ریچرڈسن کے طرز کو معراج کمال پر پہنچا دیا۔ ریچرڈسن کے ناولوں کی سب سے بڑی خرابی اُن کی طوالت و ضخامت ہے۔ ایک واقعہ کئی کئی بار دہرایا گیا ہے۔ پھر واقعات کی رفتار بہت سست ہے۔ پڑھتے پڑھتے طبیعت اکتا جاتی ہے۔ گوئٹے نے ان خامیوں سے احتراز کیا اور ریچرڈسن کا ناصحانہ و واعظانہ انداز بیان بھی ترک کر دیا۔

افسانہ لکھنے کے تین طرز ہو سکتے ہیں۔ پہلا طرز تو وہ ہے جس میں افسانہ نویس آپ کے سامنے قصہ کو ابتدا سے لیکر انتہا تک بیان کر جاتا ہے۔ گو اُس کی شخصیت "میں یا ہم" میں ظاہر نہیں ہوتی تاہم آپ برابر محسوس کرتے ہیں کہ کوئی شخص پس پردہ افسانہ سنا رہا ہے۔ آپ افسانہ سنتے ہیں مگر آپ افسانہ نویس کے واقعات پر کوئی نکتہ چینی نہیں کر سکتے۔ وہ واقعات کے معاملہ میں بالکل آزاد ہے۔ آپ کو یہ پوچھنے کا مطلق حق نہیں کہ اُس کو واقعات کہاں سے ملے۔ وہ جو قصہ اور جسکا قصہ چاہے سنائے۔ یہ موجودہ دور کے افسانوں کا طرز ہے اور اس طرز کے مشہور افسانہ نگاروں میں نذیر احمد، سرشار اور شرر کا نام لیا جا سکتا ہے۔ افسانہ نویسی کا دوسرا طرز وہ ہے جس میں ساری داستان مصنف کسی نامور فرد داستان کی زبان سے ادا کرتا ہے۔ اُس میں داستان کے سارے ضروری اور غیر ضروری اجزا اس ایک فرد کی ذات سے وابستہ ہوتے ہیں اور قصہ کی روانی اسی کے ساتھ ساتھ حرکت کرتی رہتی ہے۔ مصنف کی شخصیت بالکل پردہ میں ہوتی ہے۔ یہ طرز اب پرانا ہو چکا ہے۔ قصہ حاتم طائی اور باغ و بہار اسی طرز کی یادگار ہیں۔ داستان گوئی کا ایک تیسرا طرز بھی ہے یعنی افسانہ کا ہیرو یا خاص فرد خطوں کے ذریعہ سے اپنے واقعات و حسیات کا اظہار کرتا ہے۔ اُردو میں اس طرز کا کوئی افسانہ نہیں۔ یہ خاص ریچرڈسن کی ایجاد ہے اور اس ایجاد کی وجہ اُس کی وہی عشقیہ خطوط نویسی کا تجربہ ہے۔ اُس نے اوّل دو طرزوں کی خصوصیتوں کو ملا کر اپنے خاص طرز کی بنا ڈالی یعنی اس رقعاتی طرز میں واقعات پوری آزادی کے ساتھ ایک فرد کی زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ کسی کی رُوحانی کلفتوں کی خبر دوسرے کو نہیں ہو سکتی ہے جس پر پڑتی ہے وہی جانتا ہے۔ خواہ انسان کتنی ہی ہمدردی کیوں نہ کرے لیکن دوسرے کے حسیات و جذبات سے پوری آگاہی مشکل ہے۔ ورتھر کی روح کی بیقراری اور تکلیف کوئی دوسرا نہیں بیان کر سکتا تھا اسلئے لازم تھا کہ خود وہی بیان کرے اور یہ بیان کسی دوسرے پر ظاہر ہونا چاہئے جو لامحالہ خط کی شکل اختیار کرے گا۔

ان خطوں کے لئے ایک مکتوب الیہ کی ضرورت ہے جو کاتب کا ایسا دلی دوست ہو جس سے کاتب اپنا تمام حال بیان کر سکتا ہو۔ ڈراز
میں ولہلم کی شخصیت بالکل ایسی ہے۔ وہ ورتھر کا دوست ہے مگر اُس کی طبیعت ورتھر کی طبیعت سے مختلف ہے۔ وہ زیادہ حقیقت پسند واقع
ہوا ہے۔ وہ ورتھر کی ذہنی کیفیت دور سے دیکھ رہا ہے اور موقع بہ موقع اُسکو مشورہ بھی دیتا ہے اور جب دیکھتا ہے کہ اب ورتھر کا جنون
بہت تیز ہو گیا ہے تو اُس کو شارلٹ کے پاس سے چلے آنے کی تاکید کرتا ہے۔ چنانچہ ورتھر اُس کی تاکید پر چلا جاتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے
کہ ولہلم اصل میں گوئٹے کا دوست مرک ہے جس کو اُس نے ویزلر سے خطوط لکھے تھے اور "ورتھر" کے خطوط ایک حد تک مرک کے خطوط کے تصرف
شدہ چربے ہیں مگر ان دونوں باتوں کو تسلیم کرلینے کی کوئی شہادت نہیں کیونکہ سوائے دو ایک معمولی خطوں کے ویزلر کے زمانہ کا گوئٹے کا کوئی بھی
خط دستیاب نہیں ہوا۔ اسلئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ولہلم کو مرک سے کوئی تعلق نہیں اور "ورتھر" کے خطوط بالکل گوئٹے کے دماغ کا نتیجہ ہیں جن کو اُسنے
اپنی غیر معمولی تخلیقی قوت سے ریچرڈسن کے رنگ میں ایجاد کیا۔ خطوں کا یہ سلسلہ آخر تک چلا جاتا ہے لیکن جب ورتھر کے احساسات قریب
قریب جواب دے چکتے ہیں اور اس میں اتنی طاقت نہیں رہتی کہ ولہلم سے باقاعدہ خط وکتابت کرے تو گوئٹے خود قلم ہاتھ میں لیکر انجام تک کا حال بیان کرتا ہے۔

ان خطوں کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ انکو پڑھ کر ہر دردمند دل بےچین ہو جاتا ہے کیونکہ ان میں صرف واقعات کی تفصیل ہی نہیں ہے بلکہ
حسن کی بے مہری و بے التفاتی اور عشق کی نامرادی و ناکامی کی داستان بھی ہے۔ ان میں نفس انسانی کی جو تحلیل کی گئی ہے وہ مشہور مصنفوں کی
ضخیم ادبی کارناموں میں بھی نہیں مل سکتی۔ ایک ایک خط گویا دل کا ایک ٹکڑا ہے جو صفحۂ کاغذ پر اس طرح بچھا دیا گیا ہے کہ اس میں سے کبھی انتظار
وتمنا کے اور کبھی یاس وحرماں کے قطرے ٹپکتے ہیں۔ معاملات وجذبات پر قوت متخیلہ کے زور سے ایسی روشنی ڈالی گئی ہے کہ ذرا ذرا سی تفصیل
نہایت دلچسپ ہو گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز پر خردبین کا عمل ہو رہا ہے۔ اگر ایک جگہ پہاڑیاں اور وادیاں آغوش بہار میں دکھائی
گئی ہیں جہاں چڑیوں کے چہچہے اور کیڑوں کی سریلی آواز سے سارا منظر ایک نغمہ زار نظر آتا ہے تو دوسری جگہ خزاں کی زردی، جاڑے کی آمد، برف
باری، بارش کا سیلاب اور بجلی کی کڑک وغیرہ دل کی بیقراری کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ غرض مناظر قدرت کا ہر رنگ ایک ایک کرکے نہ صرف
سامنے آتا ہے بلکہ انکا اثر جذبات پر بھی پڑتا ہے۔ بہار کے موسم میں ہر طرف رقص وسرود، خوشی وشادمانی کا سماں دکھایا گیا ہے لیکن جب دسمبر کی
تاریک طوفانی راتیں نہایت ہولناک صورت اختیار کرلیتی ہیں تو ورتھر کا دل بھی یاس والم کا مسکن بن جاتا ہے اور یہی بھیانک خارجی
مناظر روح پر اثر ڈالکر ایک خطرناک انجام کا احساس پیدا کرتے ہیں۔

ان خطوں کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی سیہ بخت اور دلفگار ہستی رنج والم کی حالت میں اپنا افسانۂ دل پرجوش
طریقہ سے سنا رہی ہے۔ تشبیہات واستعارات اغراق سے بالکل پاک ہیں۔ البتہ کہیں کہیں کٹے کٹے جملے نظر آتے ہیں
جو خیالات کے ہجوم کا پتہ دیتے ہیں لیکن ان خطوں کی سب سے نمایاں خصوصیت اُن کی دلچسپی ہے۔ پڑھنے والا
کبھی شروع کرکے چھوڑ نہیں سکتا کیونکہ

دلچسپ تر ز واقعہ ما نیست قصۂ   تاریخ روزگار سراپا نوشتہ ایم

گوئٹے کا فلسفہ

خاتمہ سخن پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تھوڑا سا گوئٹے کے فلسفہ کے متعلق بھی لکھ دیا جائے تاکہ ناظرین کو اس کی حکیمانہ نگاہ کا کچھ اندازہ ہو جائے گوئٹے کی حقیقت کوش طبیعت کو رسمی فلسفہ سے کبھی تسکین نہیں ہوئی کیونکہ رسمی فلسفہ انسان کو بجائے حقیقت کے مجاز کی طرف لیجاتا ہے۔ اُسے رسمی فلسفہ سے نفرت بھی تھی اس لئے کہ فلسفیوں کے مذہب میں شک و تذبذب علم کا پہلا زینہ ہے اور گوئٹے شک و تذبذب سے ہمیشہ بھاگتا رہا لیکن ان مسائل سے جو فلسفہ کی جان ہیں مثلاً کائنات کی حقیقت، انسان کا اُس سے تعلق اور زندگی کا مقصد وغیرہ وغیرہ وہ برابر دلچسپی لیتا رہا۔ وہ شاعر کا ناز کدل لیکر آیا تھا جس پر فطرت خود اپنا راز منکشف کرتی ہے اس لئے اس کو رسمی فلسفہ میں اُلجھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ ان مسائل کو شاعری کی عینک سے دیکھتا تھا اور شاعری ہی کے زینہ سے حقیقت کی اس بلندی پر پہنچا جہاں فلسفہ کی ساری دراز دستیاں کوتاہ ہو کر پیچھے رہ جاتی ہیں۔

اسٹراس برگ میں وہ مشہور اطالوی فلسفی گیارڈانو برونو (۱۶۰۰ - ۱۵۴۸) سے روشناس ہوا جو وحدت الوجود کا قائل تھا۔ برونو کا خیال تھا کہ تمام کائنات ایک لامحدود حقیقت واحد کی مظہر ہے اور یہ لامحدود حقیقت زندگی کی تمام شرائین میں جاری و ساری ہے۔ برونو کی تصانیف میں اُس نے اپنے فطری ذوق کے مطابق جو کل کا مطالعہ کیا تو شوق نے مطالعہ کے میدان میں قدم اور بھی آگے بڑھایا تا آنکہ اس نے اسپنوزا کی تصنیفات بھی دیکھیں۔ اسپنوزا کا قول ہے کہ اس کائنات کی روح رواں ایک عالمگیر الٰہی حقیقت ہے اور اگر انسان اپنی فطرت صحیحہ پر عمل کرے تو وہ اس حقیقت کا قرب حاصل کر سکتا ہے گوئٹے ان دونوں فلسفیوں کے خیالات سے بہت متاثر ہوا اور اس کا عقیدہ بھی بڑی حد تک ان دونوں سے ملتا جلتا ہے۔ گوئٹے کا خیال ہے کہ کائنات اور زندگی میں ایک آویزش و کشاکش جاری ہے اور یہ کشاکش سلسلہ بہ سلسلہ کائنات و زندگی کے تمام شعبوں میں موجود ہے۔ انسان اس عظیم الشان کائنات کے سامنے اپنے کو مجبور پاتا ہے لیکن اسکی برابر یہی خواہش رہتی ہے کہ کسی طرح اس کشاکش سے آزادی حاصل کیجائے لیکن روح کو آزادی اسوقت مل سکتی ہے جب روح کی تمام خفیہ قوتوں کو بیدار کرکے ایک نظام عمل کے مطابق اس کشاکش پر فتح پانے کی مسلسل و متواتر جدوجہد کیجائے مگر کائنات پر یہ فتح آخر کس قسم کی ہوگی؟ یہ فتح روحانی ہوگی یعنی اگر تمام نظام کائنات کو روح کی گہرائیوں میں چھپا لیا جائے تو گویا روح کی فتح ہوگئی اور روح کشاکش سے آزاد ہوگئی۔ بعض لوگ کائنات سے مرعوب ہو کر اور اکثر بد دل ہو کر آزادی روح کی خاطر سنسان جنگلوں، پہاڑوں اور غاروں میں جا کر زندگی بسر کرتے ہیں کیونکہ انکے خیال میں ترک دنیا سے روح کو آزادی ملتی ہے۔ آزادی روح اُن کے خیال میں نام ہے ترک خواہشات کا ظاہر ہے کہ یہ فتح کا صور یا آزادی روح کی جستجو نہیں بلکہ اعتراف شکست کا کھلا اعلان ہے اور اگر کسی طرح یہ فتح کہی جا سکتی ہے تو ہم غالب کی زبان میں اسے ہوس کی فتح سے تعبیر کرینگے ایسے لوگوں میں صحیح انسانیت کی خو بو کم ہوتی ہے لیکن جو لوگ انسان ہوتے ہیں وہ اسی دنیا میں رہ کر روح کی آزادی کی کوشش کرتے ہیں اور اسکے لئے برابر جدوجہد کرتے ہیں گوئٹے ایک بلند پایہ انسان تھا اس لئے اُس نے موخر الذکر طریقہ اختیار کیا۔ اسکا خیال ہے کہ روح کو فتح و کامرانی اُسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب انسان زندگی کے میدان میں کائنات کے مقابلہ میں پیہم سرگرم عمل اور متواتر جوش جدوجہد دکھائے۔ روح کی خواہش آزادی اور جدوجہد میں مطابقت پیدا کرنے کیلئے عمل کی یکسوئی اور روحانی تربیت کی ضرورت ہے تاکہ نتیجہ پیش از پیش ہو کیونکہ اس جگہ کامیابی بقدر سعی و عمل ملتی ہے پھر یہ نظام عمل کیا چیز ہے؟ یہ خود انسان کی فطرت ہے۔ ہر انسان کی فطرت پاک و صاف ہے اور اس میں ترقی کی انتہائی گنجائش ہے مگر ہر شخص کی فطرت دوسرے شخص سے کچھ نہ کچھ مختلف ہوتی ہے اسلئے ہر شخص کا اولین فرض یہ ہے کہ اپنی فطرت کو معلوم کرے تاکہ اسکی روحانی ارتقاء کی منزلیں

بآسانی طے ہوسکیں۔ جس طرح ایک بیج فطرت کے اثر سے ایک تناور درخت بن جاتا ہے اُسی طرح انسان اگر اپنی فطرت پر عمل کرے تو وہ روحانی ترقی کے انتہائی مدارج پر پہنچ سکتا ہے لیکن اس روحانی معراج پر پہنچنے کے بعد بھی انسان انسان ہی رہے گا ٹھیک اسی طرح جس طرح ایک تناور درخت باوجود بڑھ جانے کے بیج سے علیحدہ نہیں ہوسکتا انسان اپنی فطرت نہیں بدل سکتا لیکن اگر اس نے روحانی معراج پر پہنچکر اپنی فطرت بدلنے کی کوشش کی یعنی مکمل فرد یا خدا بننے کی کوشش کی تو وہ اپنی روح سے ہاتھ دھو بیٹھے گا کیونکہ انسان فرد کامل نہیں ہے اُسکی ہستی ناقص اور محدود ہے اسکی قوت کمزور ہے مگر باوجود اس نقص اور کمزوری کے انسان کے دل میں اس ذات واحد سے جاکر ملجانے کی آرزو ہوتی ہے۔ ورتھر کو پہاڑوں اور میدانوں اور چڑیوں کی پرواز دیکھکر اسی قسم کی آرزو ہوتی ہے گو اس آرزو کا نتیجہ خراب ہے مگر آرزو خراب نہیں کیونکہ آرزو و عمل سے روح بلند مرتبہ حاصل کرتی ہے اور اس حقیقت اعظم سے روشناس ہوتی ہے۔

کائنات و زندگی کی کشاکش کے علاوہ خود زندگی میں دو طرح کی قوتیں کشاکش پیدا کرتی ہیں۔ ایک تو طوفانی قوت ہے اور دوسری نظم و ترتیب کی قوت۔ اوّل اوّل زندگی تند و تیز طوفان کی طرح بہنے کی کوشش کرتی ہے اور تمام رکاوٹوں کو اپنے ساتھ بہالیجاتی ہے۔ یہ طوفانی قوت دراصل انسان کی زبردست قوت تخلیق کا منبع ہے لیکن اگر اس سیلاب کو خالی چھوڑ دیا جائے تو سخت خطرکا اندیشہ ہے اسلئے ضروری ہے کہ اس پھیلاؤ کو سمیٹ کر اور اس بہاؤ میں نظم و ترتیب پیدا کرکے اسکو ایک ایسے راستہ پر لگایا جائے جو تمدن انسانی کیلئے مفید ثابت ہو۔ گوئٹے اپنی ابتدائی زندگی میں اس زبردست طوفانی قوت کا قائل تھا چنانچہ اس نے گوئٹس اور ورتھر میں اسی خیال کو پیش بھی کیا ہے لیکن اطالیہ کے سفر سے اس میں ترتیب و ہم آہنگی پیدا ہوجاتی ہے اور وہ اس بہاؤ کیساتھ ساتھ قانون اور نظام پر زور دیتا ہے۔

کائنات کو وہ کوئی ایسی ٹھوس چیز نہیں سمجھتا جس میں بڑھنے کی گنجائش نہ ہو بلکہ کائنات میں لچک موجود ہے۔ نشو و نما کی قوت برابر اپنا کام کررہی ہے اور ہر لحظہ اس میں نئی زندگی پیدا کررہی ہے۔ کائنات کو وہ ایک لامحدود واحد قوت کا مظہر سمجھتا ہے جس کی ہستی اس کائنات سے علیحدہ نہیں ہے بلکہ اسکی رگ و پے میں روح کیطرح سرایت کئے ہوئے ہے اور یہی وہ قوت ہے جسکو وہ حقیقت سے تعبیر کرتا ہے۔ اسکا خیال ہے کہ ہر جزو پر کل کا یکساں پرتو پڑتا ہے کیونکہ کثرت میں وحدت ہے اس طور سے وہ ہر جزو کی تعظیم اور زندگی کے ہر ذرہ کی پرستش کرتا ہے لیکن ہر جزو باوجود اسکے کہ کل میں شامل ہے اور کل سے اُسکا گہرا تعلق ہے اپنی صرف روحانی انفرادی حیثیت رکھتا ہے جسے ہم خودی کہہ سکتے ہیں اور جو پرتو ہے اس حقیقت اعظم کا، بلکہ دوسرے اجزا کے مقابلہ میں اور خود کل کے مقابلہ میں ایک حد تک آزاد ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ گوئٹے انسان کو مختار مطلق سمجھتا ہے نہیں ایسا نہیں ہے لیکن اس کا خیال ہے کہ انسان اپنی فطرت کو صحیح طور پر استعمال کرنے میں یقیناً آزاد ہے اور یہی آزادی ہے جو اسکی ترقی کی ضامن ہے۔ یوں تو کائنات کے ہر جزو میں خودی کا عنصر موجود ہے مگر انسان ہی جو اشرف المخلوقات ہے جس میں اس عنصر کا بہت بڑا جزو موجود ہے کیونکہ انسان ہی وہ ہستی ہے جو اپنی خودی کے زور سے آپ اپنی دنیا پیدا کرسکتی ہے اور زمان و مکان کے حلقہ سے نکلکر جاودانی حاصل کرسکتی ہے۔ اپنی فطرت پر عمل کرنا اور دوسروں کو ان کی فطرت پر عمل کی آزادی دینا یہی گوئٹے کے خیال میں مذہب کی صحیح روح ہے۔ وہ مذہب کو رسم و رواج کا مجموعہ نہیں سمجھتا اور اسی لئے اُس میں تقشف نام کو نہ تھا لیکن جہاں مذہب کی روح کا تعلق ہے وہ مذہب کا شیدائی اور پرستار تھا۔ وہ کہتا ہے کہ "میں خدا پر ایمان رکھتا ہوں لیکن خدا پر ایمان رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ تمام مظاہر میں صرف اُسی کی ذات کو تسلیم کیا جائے اور دنیا میں سچی عبادت یہی ہے۔"

انسان کو حقیقت کا علم کیسے ہوسکتا ہے؟ گوئٹے کا خیال ہے کہ حقیقی علم صرف مشاہدہ، ترتیب و استقرار سے حاصل نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ چیزیں سراسر عقلی و نظری ہیں اور عقل نہایت ناکافی ہے بلکہ بیشتر یکطرفہ اور غلط ثابت ہوتی ہے۔ فاؤسٹ میں ایک جگہ وہ شیطان کی زبان سے کہتا ہے کہ "نظری علوم بالکل خشک اور بے کیف ہوتے ہیں اور انکے مقابلہ میں، زندگی کا درخت ہرا بھرا ہوتا ہے" یعنی حقیقت زندگی کے ہر لمحہ میں موجود ہے کیونکہ ہر لمحہ اس صانع ازل کی تخلیقی قوت کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔ اسلئے اگر ہم ہر لمحہ زندگی کا احساس کریں تو گویا ہم نے اُس حقیقت کبریٰ کا احساس کرلیا جو اس دوامی نظام کائنات کو چلا رہی ہے۔ مگر اس احساس کیلئے ضرورت ہے کہ انسان غور و فکر کی عادت پیدا کرے، زندگی کا مشاہدہ کرے اور روح کو اس صانع اعظم کی تخلیقی قوت سے قریب تر کردے۔ مگر انسان آخر غور و فکر و مشاہدہ کے بعد کس طرح علم حاصل کرسکتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ انسان کا قاعدہ ہے کہ وہ کسی چیز کے علم میں اپنی طبیعت کے مطابق نیک و بد کا پہلو بھی داخل کردیتا ہے مثلاً زہر کو لیجئے چونکہ زہر حیات انسانی کے لئے مضر ہے اس لئے اسکو خراب

کہا جاتا ہے۔ گوئٹے کہتا ہے کہ علم میں نفع و نقصان کا پہلو داخل کرنا صحیح علم کی راہ میں ایک زبردست سنگِ راہ ہے اس کے خیال میں نوشدارو اور زہر دونوں کی حیثیت ایک ہے اور اسی حیثیت سے دونوں کو دیکھنے کے لئے "التفات بیگانہ" کی ضرورت ہے۔ فاؤسٹ میں وہ ایک جگہ شیطان کے قلم سے لکھتا ہے کہ "تم کو دیوتاؤں کی طرح نیکی و بدی دونوں کا علم حاصل کرنا چاہیے" یعنی دونوں کو ایک نظر سے دیکھنے کے بعد تم کو وہی بصیرت حاصل ہو سکتی ہے جو دیوتاؤں کو حاصل ہوتی ہے۔ اس مقام پر نفع و نقصان، رنج و راحت، نزد و دور، اور ظلم و نور کی کوئی تمیز نہیں رہ جاتی
ڈاکٹر اقبال نے پیام مشرق میں سرود انجم کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اُس کے بعض بند اس مفہوم کو پوری طرح ادا کرتے ہیں مثلاً

جلوہ گہ شہود را
بتکدۂ نمود را
رزم نبود و بود را
کشمکش وجود را
عالم دیر و زود را ، می نگریم و می رویم

انجم میں تو یہ بیگانگی ممکن ہو سکتی ہے کیونکہ وہ ہم سے بہت دور ہے لیکن انسان میں یہ بیگانگی کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ گوئٹے کا خیال ہے کہ اگر ہم اپنے اندر ایک "غیریت اور خارجیت" پیدا کر لیں تو ہم بھی ستارہ کی بلندی پر پہونچ کر حقیقت سے واقف ہو سکتے ہیں مرزا غالب اس "خارجیت" کو ایک خط میں یوں ادا کرتے ہیں کہ "آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں، رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے آپ کو اپنا غیر تصور کر لیا ہے...." اس طرح آپ اپنا تماشائی بن جانے سے روح اور خارجی ماحول میں جو مطابقت اور ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے وہ علم کی جان اور صحیح تخلیق کا منبع ہے۔

اس سلسلہ میں فن اور فطرت کی بحث بھی سامنے آتی ہے یعنی فن کو آیا فطرت سے علحدہ یا عین فطرت ہونا چاہئے۔ فن نام ہے اس اندرونی تخلیقی قوت کے اظہار کا جو ہر صاحب فن میں فطری طور پر پائی جاتی ہے۔ چونکہ ایک صاحب فن فطرت کا ایک جزو ہے اس لئے جو کچھ اس سے ظہور میں آتا ہے وہ عین فطرت کے مطابق ہوتا ہے لیکن ہر صاحب فن کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی روحانی قوتوں کا اندازہ کرے اور اس سے واقف ہو تاکہ جو عمارت وہ کھڑی کرنا چاہتا ہے وہ عین فطرت کے مطابق ہو اور یہی سچی تخلیق ہے جو روح کو مجاز و حقیقت اور کیف و کم کے جھگڑوں سے بلند کرتی ہے اصلی صاحب فن وہ ہے جو ان جھگڑوں سے گذر کر صانع اعظم کے دامن میں پناہ لیتا ہے۔

اس طرح تمام نظام کائنات وحدت و کثرت، سکون و حرکت، جدائی و استحکام، انسان و کائنات کے پردوں میں نہ صرف ہم آہنگی بلکہ ایک روحانی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

اعتذار خیال تھا کہ اس ترجمہ کو گوئٹے کی صد سالہ برسی کے موقع پر مارچ ۱۹۳۲ء میں شائع کرتا اور اس ارادہ سے میں نے ۱۹۳۱ء کے اواخر سے کام بھی شروع کر دیا تھا مگر تھوڑے وقتوں کے بعد واقعات نے کچھ ایسی کروٹ بدلی کہ مجھکو دوسری طرف متوجہ ہو کر قلم ہاتھ سے رکھ دینا پڑا۔ اس عرصے میں وقت گذرتا جاتا تھا اور میں کچھ نہ کر سکتا تھا بالآخر پھر ایسی خوشگوار صورت پیش آئی کہ میں نے قلم اٹھایا اور اس کام کو ختم کر دیا گو حسب خواہش یہ کام موقع پر انجام نہ پا سکا تاہم جو کچھ ہوا ہوا ناظرین اتنی دیر کے بعد بھی اگر اسکو اسی موقع کے سلسلے میں منسلک سمجھیں تو کیا اچھا ہو۔

پبلک لائبریری۔ الہ آباد
دسمبر ۱۹۳۲ء

ریاض الحسن

نوجوان ورتھر کی داستانِ غم

نوجوان ورتھر کی داستانِ غم

باب اول

خامہ ہمراز دم گرم من ست   آتش از نے در نیستاں می زنم

۴ مئی

وہاں سے چلے آنے پر میں کتنا خوش ہوں۔ میرے دوست! انسان کا دل بھی کیا چیز ہے۔ تم مجھ کو کتنے عزیز ہو اور تمھاری جدائی ناقابل برداشت ہے۔ بھلا میں تم سے چھوٹ کر کس طرح خوش ہو سکتا ہوں۔ مگر میں جانتا ہوں کہ تم مجھے معاف کر دو گے۔ اور یوں تو قدرت نے مجھ پر ستم توڑنے کے لئے معلوم نہیں کتنی چیزیں محبت کے لائق پیدا کی ہیں! ہائے غریب لیونورا! اگر میرا اس میں کیا قصور؟ کیا میں اُس کی اُس وقت کی محبت کا ملزم قرار دیا جا سکتا ہوں جب میں اُس کی بہن کے حسن دلنواز میں محو تھا۔ نہیں ہرگز نہیں! میں بالکل بے گناہ ہوں۔ تاہم کچھ نہ کچھ حصہ میرے سر بھی ہے اس لئے کہ میں نے اُس کے جذبۂ محبت کو شہ دی ہے اور اُس کے اظہار محبت پر جو فی الحقیقت مسرت انگیز ہونے کے بجائے مفرح تھا، شادماں ہو کر اُس میں اور اضافہ کر دیا۔ کیا مجھسے ایسا فعل سرزد نہیں ہوا؟ — لیکن آخر تمہیں بتاؤ کہ آدمی بھی کیا چیز ہے جو خود اپنا گلہ شکوہ کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ میرے شفیق دوست! میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اب میں اپنی حالت درست کروں گا اور اپنی معمولی سے معمولی گزشتہ مصیبتوں کو یاد کر کے جیسا کہ میری عادت رہی ہے، اپنے اوقات خراب نہ کروں گا۔ میں اب ماضی کو بھول کر صرف حال سے لطف اندوز ہونگا۔ تم بالکل صحیح کہتے ہو کہ آج دنیا میں رنج و مصیبت کا کہیں نام نہ ہوتا اگر انسان دلیکن خدا جانے انسان کیوں ایسا بنایا گیا ہے، اپنے تخیل کے زور سے اپنے گزشتہ آلام و مصائب کو یاد کرنے کے بجائے اپنی موجودہ حالت کو نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کرتا۔

براہ مہربانی میری والدہ سے جا کر کہو کہ میں ان کے کام کی انجام دہی میں اپنی حسب قابلیت مشغول ہوں اور میں ان تمام باتوں کے متعلق مفصل طور پر ان کے پاس بہت جلد لکھنے والا ہوں

چچی صاحبہ سے حال ہی میں ملاقات ہوئی تھی۔ بجائے بد مزاج اور ترش رو ہونے کے جیسا کہ لوگوں نے اُن کو مشہور کر رکھا ہے وہ نہایت باسلیقہ اور خوش باش ہیں وہ زندہ دل بھی ہیں اور خلیق بھی اور سینہ میں ایک نیک دل رکھتی ہیں میں نے اُن کو اپنی والدہ کی اُن غلطیوں سے آگاہ کر دیا ہے جن سے اب تک وہ واقف نہیں تھیں انھوں نے خود مجھ سے اپنا ارادہ و منشا ظاہر کیا اور ان شرائط کا بھی ذکر کیا جن پر وہ اپنے حصہ سے دست بردار ہونے اور ہم لوگوں کی طلب سے کہیں زیادہ دینے پر تیار ہیں۔ فی الحال میں اس امر کے متعلق زیادہ لکھنا نہیں چاہتا البتہ والدہ کو اتنا یقین ضرور دلادوں کہ تمام کام بہتر طریقہ پر انجام پا رہے ہیں۔ میرے دوست مجھے اس موقع پر یہ معلوم ہوا کہ دنیا میں بہ نسبت مفسدہ پردازی اور کینہ پروری کے لاپروائی اور غلط فہمی سے زیادہ نقصانات اور تکلیفیں ہوتی ہیں۔ بہر حال ان دو اوّل الذکر چیزوں کا ظہور کم ہوتا ہے۔

میں اپنی موجودہ حالت میں خوش ہوں۔ اس ارضی جنت میں تنہائی میرے دماغ کے لئے ایک علاج شافی ہے۔ موسم بہار کی تازگی میرے اکثر شک کرنے والے دل کو مسرت اور روح کو فرحت بخشتی ہے۔ جس درخت کو دیکھو پھولوں سے لدا ہوا ہے۔ اس بہشت زار میں بس یہی خواہش ہوتی ہے کہ کسی طرح تتلی بنکر اس معطر فضا میں پرواز کروں اور اپنی ہستی کو ٹھکانے لگاؤں۔ لیکن خود قصبہ نہایت ناگوار ہے۔ البتہ اس کے آس پاس کے مضافات مناظر قدرت کی بے شمار دستکاریوں اور حسن آرائیوں سے پٹے پڑے ہیں۔ اسی وجہ سے کاؤنٹ ھم نے پہاڑیوں کے اس ناتمام سلسلہ میں جس کی کڑیاں ایک دوسرے کو نہایت دلفریب طریقہ سے کاٹتی اور وادیاں بناتی چلی گئی ہیں، ایک ڈھلواں پہاڑی پر ایک باغ لگایا تھا۔ سرسری طور پر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ باغ معمولی ہے اور اسکا نقشہ کسی علمی یا فنی حیثیت سے نہیں تیار ہوا بلکہ کسی اہل دل نے اس باغ کی ترتیب محض لطف اور تفریح کے خیال سے دی ہے۔ میں اس کے متوفی مالک پر ایک اُجڑے ہوئے تاب خانہ میں جو اُس کی محبوب جگہ تھی اور آج میری ہے آٹھ آنسو بھی چکا ہوں تھوڑے عرصہ میں میں اس باغ کا مالک ہو جاؤں گا اس لئے کہ گذشتہ چند دنوں سے باغبان پر میرا تصرف ہو گیا ہے اور اس سے اسکو کوئی نقصان نہیں۔

۱۰ رمئی

میری روح میں موسم بہار کی ابتدائی صبحوں کی طرح، جنکا میں خوب لطف اُٹھاتا ہوں، عجیب طرح کا آرام وسکون ہے میں تنہا ہوں اور اس جگہ تنہائی اور خاموشی سے مجھے زندگی کا بہترین لطف ملتا ہے۔ شاید اس قسم کی اکیلی جگہیں مجھ ہی جیسے لوگوں کے آرام وسکوں کے لئے بنائی گئی ہیں میں اتنا خوش ہوں اور اپنی خاموش زندگی کے لطیف احساس میں اتنا گم ہوں کہ میں اپنی تمام اہلیت اور استعداد بھول بیٹھا ہوں۔ اس حالت میں کوئی تصویر نہیں بنا سکتا ہوں۔ تاہم میں اپنے کو ایک زبردست مصور اور نقاش تصور کرتا ہوں۔ جب تمام میداں میں ایک خفیف سا دھواں اُٹھتا ہے اور جب آفتاب کی شعاعیں ٹھیک دوپہر کے وقت میرے گھنے درخت سے کے بالائی حصّہ پر پڑتی ہیں اور کچھ پتیوں سے چھن کر اندر بھی آتی ہیں تو اُسوقت میں چشمہ کے کنارے گھاس پر لیٹ جاتا ہوں اور لیٹ کر ہزاروں کیڑوں مکوڑوں کی ہستی کو محسوس کرتا ہوں۔ جب گھاس کی پتیوں میں اس چھوٹی دنیا کا ترنم سنکر بے شمار کیڑوں اور مکوڑوں پر دقف تماشا ہوتا ہوں تو اُس وقت میں اپنے ننھا نخاشہ دل میں اُس مجلی ہستی کی چمک پاتا ہوں جس نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا اور جس کی عالمگیر محبت ہماری زندگی کا سکون اور جس کی ابدی رحمت ہماری حیات کا ستون ہے۔ میرے دوست! اس حالت میں میری آنکھیں بند ہوتی ہیں اور میرا دل دنیا ومافیہا کا مسکن بنا ہوا ایک معشوقہ کے حالت تصور کے مانند تمام احساسات اور روابط کا مرکز ہوتا ہے پھر میری یہ تمنا ہوتی ہے کہ کاش میں صفحۂ کاغذ پر ان تصورات واثرات کے اظہار پر اُسی سوز وگداز کے ساتھ قدرت رکھتا کہ وہ میری روح کا ٹھیک اسی طرح آئینہ ہوتے جیسے میرا سینہ اس ہستی بے پایاں کا گنجینہ ہے۔ لیکن اس معاملہ میں میری استطاعت کا کیا ذکر، میں تو صرف اس کی عظمت اور بزرگی کے تصور ہی سے بے قابو ہوا جاتا ہوں

---

۱۲ رمئی

شاید اس جگہ پرفریب ارواح کی آمدورفت ہے یا یہ خود میرے فرش سے عرش تک جانے والے تخیل کی جولانی ہے جس کے اثر سے میرے اردگرد کی ہر چیز بہشت کا نمونہ معلوم ہوتی ہے۔ مکان کے سامنے ایک چشمہ ہے جس پر میں ملوسینا اور اُس کی ہمشیرہ کے مانند بہت فریفتہ ہوگیا ہوں۔ پہاڑی

سے اترتے ہوئے ایک محراب ملتا ہے جہاں سے کوئی بیس قدم اور نیچے ایک مرمریں چٹان سے بلور کی طرح صاف شفاف پانی برابر اُبلتا رہتا ہے۔ اُس کے اوپر ایک چھوٹی سی دیوار ہے۔ چاروں طرف درختوں کا جھرمٹ سایہ کئے ہوئے ہے جس سے ٹھنڈک بھی کافی ہے۔ ان سب باتوں سے منظر نہایت خوشگوار اور پسند خاطر ہوگیا ہے تقریباً روزانہ میں وہاں جاتا ہوں اور کم سے کم ایک گھنٹہ ضرور وہاں بیٹھتا ہوں۔ نوعمر لڑکیاں قصبہ سے پانی بھرنے آتی ہیں جو اُن کا معصوم اور ضروری مشغلہ ہے۔ اگلے زمانہ میں شاید بادشاہوں کی لڑکیاں بھی پانی بھرا کرتی تھیں اور جب میں وہاں آرام کرتا ہوں تو اسی نسبت سے عہد قدیم کا سارا بطریقی تمدن میری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے اور تخیل میرے سامنے وہ نقشہ پیش کرتا ہے جب خاندان کے بزرگ اشخاص چشموں کے کنارے خدا کو حاضر و ناظر جان کر اپنے حریفوں سے صلح کرتے یا اپنے حلیفوں سے رشتہ اتحاد و دوستی کو اور مضبوط کرتے تھے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چشموں پر کوئی نہ کوئی نیک فرشتہ ضرور مامور رہتا ہوگا۔ میرے دوست! جس نے تخیل کی آنکھوں سے یہ تماشا نہیں دیکھا اُس نے گویا موسم گرما میں ایک شیریں چشمہ کے کنارے سیر کے بعد ٹھنڈی ہوا کا لطف ہی نہیں اُٹھایا۔

۱۳ / مئی

تم مجھے کتابوں کی لالچ دیتے ہو۔ میں تو اب ان سے تنگ آگیا ہوں۔ خدا کے واسطے میرے پاس کوئی کتاب نہ بھیجو۔ میں اب از سرِ نو راہ نمائی نہیں چاہتا اور نہ کسی اضطرابی اور التہابی کیفیت سے دوچار ہونا چاہتا اسلئے کہ میرے قلب کی گہرائیوں میں خود ایک جوش اور ایک ہیجانی کیفیت برپا ہے اور اس میں نغمہ اور شعر کی مدد سے میں کمی کا خواہشمند ہوں۔ ہومر[۵] کی تصنیفات سے البتہ سکون ملتا ہے بیشتر اوقات میں نے اپنی رگوں میں خون کی روانی کو کم کرنے اور رہا قلب کے ناگہاں اور پُرجوش جذبات کو روکنے کی کوشش کی ہے لیکن تم تو جانتے ہو کہ میرا دل کتنا متلون اور انقلاب پذیر ہے، مگر ان تمام باتوں کی تصریحات کی چنداں ضرورت نہیں اور تم نے تو اکثر پریشان ہو کر میرے چہرہ کی کیفیت

۵؎ ہومر۔ قدیم ایشیائی یونان کا مشہور شاعر اپنی دو نظموں (اوڈیسی اور ایلیڈ) کی وجہ سے مشہور ہے۔ ان میں اوڈیسیوس کے سفروں اور ٹرائے کے محاصرہ کا حال ہے۔ ان سے تاریخی دور سے پہلے یونان کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کا پتہ چلتا ہے، جب لوگوں کی زندگی قدرت سے ہم آہنگ نظر آتی تھی، تہذیب و تمدن کی خرابیوں سے انسان کوسوں دور تھا اور زندگی پرتکلف ہونے کے بجائے سادہ تھی۔ گوئٹے ہمیشہ اس سادگی کا مداح رہا اور اسی وجہ سے ہومر کی استادی کا معترف تھا۔

انتہائی رنج سے انتہائی خوشی میں، اور معمولی دلگیری سے تند جذباتی میں بسرعت بدلتے دیکھا ہے میرا دل گویا ایک بیمار بچہ کی طرح ہے اور اسی لئے میں اس کی ہر بات پوری کرتا ہوں لیکن بھائی یہ قصہ ہمارے تمہارے درمیان کا ہے اور کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا۔ اس لئے کہ میں جانتا ہوں کہ اس معاملہ میں بہت سے لوگ مجھ پر آوازے کسیں گے۔

۱۵ر مئی

مجھے اب یہاں کے سب لوگ خاص کر بچے بخوبی جان گئے ہیں اور مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ پہلی دفعہ جب میں نے لوگوں سے باتیں کیں اور پھر دوستانہ لہجہ میں اُن کے روزمرہ کے مختلف مشغلوں کو پوچھا تو کچھ لوگ سمجھے کہ اس سے شاید مجھ کو ان کی ذلت مقصود ہے۔ اور یہ سمجھ کر وہ نہایت ترشروئی سے منہ پھیر کر چلے گئے۔ لیکن اس واقعہ کا میرے دل پر کوئی بُرا اثر نہیں ہوا بلکہ میں اپنے عقیدہ میں جیسا کہ میں نے بارہا تجربہ کیا ہے اور بھی پختہ ہوگیا یعنی ایسے لوگ جنکو بڑائی کا دعویٰ ہوتا ہے اپنے کو چھوٹوں سے نہایت سرد مہری کے ساتھ دور رکھنا چاہتے ہیں اور اُن کو اس طرح کا خیال ہوتا ہے کہ اگر وہ چھوٹوں کے پاس آئیں جائیں یا اُن سے ملیں ملائیں تو اُن کے رتبہ میں کمی آجائیگی بالکل یہی حال اُن کاہلوں اور بے وقوفوں کا ہے جو اپنے آپ کو عقل کا پتلا سمجھتے ہیں اور چھوٹوں سے اگر وہ صرف اس لئے ملتے ہیں کہ چھوٹے لوگ اُن "عقلمندوں" کی صحبت میں اپنی بدتمیزی اور گستاخی کا احساس کریں۔ میں خوب جانتا ہوں کہ ہم لوگ نہ تو برابر ہیں اور نہ برابر ہو سکتے ہیں۔ لیکن جو لوگ عام لوگوں سے صرف اس لئے الگ تھلگ رہتے ہیں تاکہ اُن کی عزت ہو۔ وہ میرے خیال میں بزدل اور کمزور ہیں اور اپنی کمزوری اپنے دشمنوں کے سامنے شکست کے ڈر سے ہمیشہ چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔

پچھلی دفعہ جب میں اس چشمہ کے پاس گیا تھا تو میں نے وہاں ایک جوان نوکرانی دیکھی جو سب سے نیچے کے زینہ پر اپنا گھڑا رکھے ہوئے کسی ایسے شخص کے انتظار میں کھڑی تھی جو اُسکا گھڑا سر پر اٹھوا دے۔ میں نے یہ دیکھتے ہی آگے بڑھ کر کہا کہ میں تمہارا گھڑا اُٹھوا دوں؟ یہ سنتے ہی وہ شرما گئی اور بولی "نہیں، نہیں، رہنے دیجئے" میں نے جواب دیا کہ "کوئی ہرج نہیں" اور یہ

کہہ کر میں نے اُسکا گھڑا اُٹھوا دیا۔ پھر وہ میرا شکریہ ادا کرکے چلی گئی۔

۱۷ مئی

یہاں میری بہتوں سے جان پہچان ہوگئی ہے لیکن کوئی سوسائٹی نہیں۔ معلوم نہیں کہ مجھ میں کیا خاص بات ہے جو لوگوں کو میری طرف کھینچتی ہے۔ لوگ میرے پاس آتے ہیں اور مجھ سے محبت کا برتاؤ کرتے ہیں مگر مجھکو افسوس ہوتا ہے کہ میں ان کے اخلاص و محبت کے برتاؤ کا بدلہ خاطر خواہ نہیں دے سکتا ممکن ہے تم مجھ سے سوال کرو کہ یہ لوگ کیسے ہیں؟ میرے دوست بس سمجھو کہ ایسے لوگ ہر جگہ مل سکتے ہیں، کوئی خاص فرق نہیں۔ انسان کی نسل ہر جگہ یکساں ہے۔ روزی کمانے کے لئے ان لوگوں کی بڑی تعداد محنت و مشقت میں اپنا زیادہ وقت گذارتی ہے اور جو کچھ وقت بچتا ہے اُس میں ان لوگوں کو اتنی کوفت ہوتی ہے کہ اس سے نجات پانے کے لئے وہ پھر ہر طرح کی محنت کرتے ہیں۔ انسان کی تگ و دو کا بس یہی حال ہے۔ لیکن یہ لوگ خوش مزاج اور نیک نہاد ہیں، ان کی صحبت میں اگر میں کبھی کبھی اپنے کو بالکل بھول کر ان معصومانہ تفریحوں سے لطف اُٹھاتا ہوں جو کسانوں میں ممنوع نہیں مثلاً بے تکلف دوستوں کی صحبت میں ایک صاف میز کے گرد آزادی اور اخلاص سے باتیں کرنا یا موقع سے کوئی محفل رقص یا سیر و تفریح کی خاطر سیر و سیاحت کا انتظام کرنا وغیرہ تو میری طبیعت پر ان باتوں کا اچھا اثر پڑتا ہے مگر اتنا ضرور ہوتا ہے کہ میں اپنے تمام اُن اوصاف کو یک قلم بھول جاتا ہوں جو ہنوز میرے قلب کی گہرائیوں میں عدم استعمال سے بیکار ہوتے جاتے ہیں اور میں ان کو ابھی احتیاط سے پردہ میں رکھنے پر مجبور ہوں۔ افسوس اس خیال سے میری روح پژمردہ ہو جاتی ہے اور اس پر طرہ یہ کہ غلط فہمی کے ہم شکار ہیں۔

افسوس! آج میرے جوانی کے زمانہ کی ایک سچی دوست دنیا سے چل بسی۔ ہائے میں نے اسے جانا ہی کیوں! آج میں اپنے کو مخاطب کرکے کہہ سکتا ہوں کہ "ورتھر تم جو خواب دیکھ رہے ہو اس کی تعبیر یہاں آسمان کے نیچے ملنی مشکل ہے" لیکن وہ میری رہ چکی ہے اور مجھے ناز ہے کہ کبھی میں بھی اُس دل کا مالک رہ چکا ہوں جس کی موجودگی میری تمام خفیہ استعداد کو بیدار اور میری روحانی قوتوں میں کافی اضافہ کردیتی تھی۔ میری اس سے ملاقات بھی کیا ملاقات ہوتی اُس وقت

گویا میری وہ ساری مخفی قوتیں بیدار ہو جاتیں جن کی وجہ سے میرا دل قدرت سے ہم آغوش ہوتا ہماری صحبتیں لطیف جذبات اور ایسی تیزی طبع کی دائمی یادگار ہوتیں جن کا بے تکاپن بھی خدا داد اہلیت کا نمونہ ہوتا۔ افسوس مجھ سے جتنے سال وہ بڑی تھی اسی حساب سے اُس کو مجھ سے پہلے قبر کے گوشہ میں آرام کرنا پڑا۔ میں اس کی خوش مزاجی اور علوئے استقلال کو کبھی نہیں بھول سکتا۔

تھوڑا عرصہ ہوا کہ میری ملاقات مسٹر و سے ہوئی جو ایک پسندیدہ صاف گو اور ہنس مکھ نوجوان ہیں۔ ابھی حال ہی میں یونیورسٹی سے تعلیم ختم کرکے آئے ہیں۔ باوجود اپنی اعلیٰ تعلیم کے وہ اپنے کو کسی بڑی شخصیت کا مالک نہیں سمجھتے ہاں اتنا ضرور ہے کہ اور لوگوں کے مقابلہ میں اپنی وسعت معلومات پر یقین رکھتے ہیں۔ دیکھنے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے طلب علم میں کافی محنت کی ہے اور مختصراً یہ کہ خاصی معلومات بھی رکھتے ہیں۔ جب اُن کو معلوم ہوا کہ میں کچھ یونانی زبان سمجھ سکتا ہوں اور مصوری بھی جانتا ہوں (یہ دونوں چیزیں اس ملک میں نہایت غیر معمولی خیال کی جاتی ہیں) تو وہ فوراً مجھ سے ملنے آئے اور اپنا تمام ادبی ذخیرہ بالو[51] سے لیکر ووڈ[52] تک اور دی پائلز[53] سے لیکر ونکلمن[54] تک دکھانے لگے۔ بعد ازاں اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ میں نے نظریۂ سلزر[55] کے حصہ اول کا بھی مطالعہ

---

۵۱ چارلس بالو اٹھارھویں صدی کے وسط میں فرانس کا ایک مصنف تھا جس نے اپنی کتاب "فنون لطیفہ اصول کی نظر میں" (مطبوعہ ۱۷۴۶) میں فنون لطیفہ کا مقصد فطرت کا چربہ اُتارنا قرار دیا اور ادب کو پرکھنے کیلئے نپے تلے قوانین مقرر کئے۔

۵۲ ووڈ۔ اٹھارھویں صدی کا مصنف ہے جو ادب میں دلچسپی لیتا تھا۔

۵۳ دی پائلز۔ یہ اٹھارہویں صدی کا مصنف ہے جس کی تصنیفات قدیم فنون لطیفہ سے تعلق رکھتی ہیں۔

۵۴ جان جاؤشم ونکلمن۔ (۱۷۱۷–۱۷۶۸) قدیم فن تعمیر و بت تراشی پر جرمنی کا مشہور مصنف۔ اٹھارہویں صدی میں فنون لطیفہ کا بہترین ماہر سمجھا جاتا تھا۔ یونان اور روما کی قدیم عمارتوں اور مرمریں مجسموں کی روح اور اصول کو واضح طور پر بیان کرنے کا اہم کام اُس نے اپنے ذمہ لیا اور بکمال دانائی کے ساتھ اُس میں کامیاب ہوا۔ اس کا خیال ہے کہ ان مجسموں میں "شاندار سادگی اور خاموش عظمت" کا اخلاقی نصب العین موجود ہے۔ روما کا سفر کرنے کے بعد اُس نے اپنی معلومات میں اچھا خاصہ اضافہ کیا۔ اس کی مشہور ترین تصنیف "قدیم فنون لطیفہ کی تاریخ" ۱۷۶۴ء میں شائع ہوئی اور شائع ہوتے ہی تمام یورپ میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی گئی۔ ۱۷۶۸ء میں ٹریسٹ میں ایک ڈاکو کے ہاتھ سے قتل ہوا۔

۵۵ سلزر۔ اٹھارہویں صدی جرمنی کا مصنف ہے جس نے غنائی ڈراما کے متعلق یہ نظریہ پیش کیا کہ رقص و سرود میں ہم آہنگی ہونا ضروری ہے اور اس مقصد کیلئے فنون لطیفہ کے تمام اجزا کو ہم آہنگ ہونا چاہئے۔ انیسویں صدی میں واگنر کے خیالات بھی بہت کچھ اسی نظریہ کے ممنون احسان ہیں۔

کیا ہے اور انطیقات کو سمجھنے اور اس پر غور کرنے کے لئے جو مضمون ہیلنے[1] نے لکھا تھا وہ میرے پاس قلمی صورت میں موجود ہے میں ان سب باتوں کو سنتا رہا اور خاموش رہا۔

ان کے علاوہ میں ایک دوسرے لائق شخص سے بھی واقف ہو گیا ہوں جو اس ضلع کا جج ہے وہ ایک صاف گو اور بے دھڑک آدمی ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اپنے بچوں میں بیٹھکر اُس کو جو مسرت ہوتی ہے وہ شاید اور کہیں نہیں ہوتی۔ اس کی نو اولادیں ہیں۔ اور بڑی لڑکی کا ذکر تو بہت سننے میں آیا ہے اور اس کی تعریف بھی ہوتی ہے۔ اس جج نے ملنے کے لئے مجھے بلایا بھی ہے اور پہلی فرصت میں جانے کا ارادہ بھی رکھتا ہوں۔ وہ شاہی شکار گاہ کے ایک مکان میں اُٹھ کر آ گیا ہے۔ جو یہاں سے ڈیڑھ گھنٹے کا پیدل راستہ ہے۔ اپنی بیوی کے مرنے کے بعد اُس کو اس مکان میں رہنے کی اجازت ملی ہے اس لئے کہ شہر میں اس کی سکونت اور دربار میں قیام سے اسکو اسکی مرحومہ بیوی کی یاد بےچین کرتی تھی۔

ساتھ ہی ساتھ چند بیہودہ قسم کے گنواروں سے بھی ملاقات ہو گئی ہے یا یوں کہو کہ انھوں نے مجھ سے زبردستی ملاقات پیدا کرلی ہے۔ ان کی ہر چیز ناگوار معلوم ہوتی ہے لیکن ان کی بدترین چیز ان کا ادعائے دوستی ہے۔ اچھا اب میں رخصت ہوتا ہوں۔ میرے خیال میں اس خط سے تم کو مسرت ہو گی اس لئے کہ سارا خط اچھی خاصی داستان ہے۔

---

۲۲ مئی

اکثر لوگوں کا اور میرا بھی یہی خیال ہے کہ انسان کی زندگی محض ایک خواب ہے۔ جب میں انسان کے مستفسرانہ جوہر اور شوقِ جستجو کو تنگ دائرہ کے اندر بند دیکھتا ہوں یا معلوم کرتا ہوں کہ انسان کی ساری قوتیں صرف ضروریات کی فراہمی اور آسائش کی تلاش میں صرف ہوتی ہیں جنکا مصرف سوائے اسکی ذلیل اور ناگفتہ بہ ہستی کو طول دینے کے علاوہ اور کچھ نہیں یا

---

[1] گوٹلوب ہینے۔ (۱۷۲۹-۱۸۱۲) جرمنی کا مشہور مصنف جس نے یونان اور رومار پر بہت سی کتابیں لکھیں۔ ۱۷۶۳ء میں گٹنگن یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہوا۔ بعد کو بہت سی دوسری یونیورسٹیوں نے پروفیسری کیلئے بلایا مگر اس نے انکار کر دیا دنیائے ادب میں وہ پہلا شخص ہے جس نے یونانی علم الاصنام اور اساطیر پر تنقیدی نظر ڈالی اور ان میں ترتیب پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اسکی تصنیفات میں۔ ہومر پنڈار۔ ورجل۔ تاریخ اور فنون لطیفہ سبھی شامل ہیں۔

جب دیکھتا ہوں کہ کسی موضوع پر ہماری ساری تلاش اور تجسس کا نتیجہ آخر کار ایک خاموش توکل میں گم ہو جاتا ہے حالانکہ اسوقت ہم اپنے کو قید خانہ کی دیواروں پر خوش آیند نقش و نگار اور چمکدار تصویریں بنا کر خوش کر لیتے ہیں تو میرے دوست! جب میں ان تمام چیزوں پر غور کرتا ہوں تو میری زبان نہیں کھلتی۔ میں خود اپنا جائزہ لینے لگتا ہوں اور اس تلاش میں تم جانتے ہو کہ مجھے کیا ملتا ہے؟ ایک دنیا جو عبارت ہوتی ہے چند تخیلات، چند مبہم خواہشات اور چند خیالی مناظر کی جو اعتقاد اور حقیقت کے مقابلہ میں بالکل مجہول اور نا معلوم ہے اُس وقت میری آنکھوں کے سامنے ہر چیز تنکے کی طرح بہتی ہے اور تب میں مسکرا کر اپنی خواب آسا کیفیت کو چھوڑ دیتا ہوں اور معمولی دنیا میں آجاتا ہوں۔

تمام علماء اور عقلاء اس بات پر متفق ہیں کہ بچوں کے ارادہ میں جو چیز حرکت پیدا کرتی ہے بچے اُس سے ناواقف ہوتے ہیں۔ لیکن بڑے لوگوں کو تو دیکھو وہ بھی بچوں کی طرح اس کائنات میں سرگرداں و پریشاں پھرتے ہیں ان کو اس کا مطلق علم نہیں کہ وہ کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جائیں گے ان کے اعمال بھی مقاصد کے داغ سے پاک ہوتے ہیں اور بچوں کی طرح ان کی رہنمائی بھی بسکٹ، مٹھائی اور چھڑی سے ہوتی ہے لیکن اسکو تسلیم کرنے کے لئے کوئی تیار نہیں حالانکہ میرے خیال میں اس سے زیادہ ظاہر اور باہر چیز اور کیا ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے تم اس کے جواب میں کہو کہ ہم میں سب سے زیادہ مسرور اور خوش باش وہی لوگ ہیں جو بچوں کی طرح کل کی فکر کرنے کے بجائے کھلونوں سے دل بہلاتے ہیں، گڑیوں کو کپڑے پہناتے اور اُتارتے ہیں اور مٹھائی کی الماری پر جس کو اناجان نے بند کر دیا ہے برابر نگاہ رکھتے ہیں جب کوئی مٹھائی مل جاتی ہے تو بڑے شوق سے کھاتے ہیں اور پھر دوسری مٹھائی کے لئے روتے اور چلاتے ہیں۔ ہاں یہ لوگ بے شک خوش ہیں مگر بہت سے ایسے بھی ہیں جو قابل رشک ہیں۔ وہ اپنے معمولی اشغال کو اور اکثر اپنے جذبات کو لمبے چوڑے القاب و آداب سے زینت دیتے ہیں اور لوگوں پر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اس قسم کے اعلیٰ کمالات صرف تمام لوگوں کی فلاح و بہبود اور شان و شوکت کیلئے

حاصل کئے گئے ہیں۔ لیکن جو شخص نہایت خاکساری سے ان تمام فضولیات کا دل سے اقرار کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ ایک خوشحال آدمی کس شوق سے اپنے باغ کو بہشت کا نمونہ بنانے کی فکر کرتا ہے یا ایک غریب کس صبر اور استقلال کے ساتھ اپنے تمام بار کا ضامن ہوتا ہے اور کس طرح ہر شخص کی یکساں طور پر یہی خواہش ہوتی ہے کہ آفتاب و ماہتاب سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھایا جائے؛ ہاں تو ایسا شخص مطمئن ہوتا ہے اور اپنے دل کے اندر اپنی دنیا پیدا کر کے اس خیال سے خوش ہوتا ہے کہ میں بھی ایک انسان ہوں اور انسانوں میں میرا شمار ہے۔ گو اس کا دائرۂ عمل محدود ہوتا ہے تاہم وہ اپنے سینہ میں آرزوئے آزادی کی پرورش کرتا ہے اور اس قید و بند سے نکلنے کی برابر فکر میں لگا رہتا ہے۔

---

۲۶ مئی

تم میرے تفریح کرنے کے پُرانے طریقہ سے خوب واقف ہو یعنی میں کسی تنہا مقام میں ایک جھونپڑا ڈھونڈھ نکالتا ہوں اور باوجود ہر قسم کی دقتوں کے اس میں جا کر رہتا ہوں یہاں بھی میں نے ایک ایسا ہی مقام ڈھونڈھ نکالا ہے اور اس کی دلچسپیاں میں تم سے کیا بیان کروں! قصبہ سے تین میل کے فاصلہ پر والہائم کا قصبہ ہے جو ایک خوشنما پہاڑی کے دامن میں آباد ہے۔ قصبہ سے باہر جانے والے راستہ سے تمام وادی بخوبی نظر آتی ہے اور وہیں ایک بُڑھیا چائے۔ شراب اور قہوہ بیچتی ہے۔ بُڑھیا باوجود اپنی زیادتی عمر کے خوش طبع معلوم ہوتی ہے پاس ہی گرجا گھر کے سامنے دو لیموں کے درخت ہیں جو اپنی لانبی شاخوں سے ایک مخملی سبزہ زار پر سایہ کئے ہوئے کھڑے ہیں۔ چاروں طرف کسانوں کے جھونپڑے، کھلیان اور کھیت ہیں۔ ایسی اکیلی اور خاموش جگہ شاید ہی میں نے پہلے کبھی دیکھی ہو۔ اکثر اُسی سبزہ زار پر اس بڑھیا کی دوکان سے کرسی منگوا کر بیٹھتا ہوں اور قہوہ پی کر ہومر کا مطالعہ کرتا ہوں۔ یہ سمجھو کہ بس بالکل اتفاقی طور سے میں نے ایک روز شام کو اس جگہ کا پتہ چلا لیا۔ ہر طرف سکون کے ساتھ ویرانی ہی ویرانی برستی تھی۔ کسان کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ صرف ایک چار برس کا بچہ اپنی گود میں ایک چھ مہینہ کی بچی لئے بیٹھا تھا اور اُس کو بھی

لوریاں دے کر اور کبھی اپنے ہاتھوں سے، جو اُس کے لئے آرام کرسی کے ہتھے کا کام دے رہے تھے اپنے سینے سے لپٹا کر بہلا رہا تھا۔ مگر بچہ باوجود خوش ہونے کے بالکل خاموش تھا۔ اس بچہ کے اس لاڈ پیار نے میرے دل پر کچھ ایسا اثر کیا کہ میں بھی پاس ہی ایک جگہ جا کر بیٹھ گیا اور ان دونوں محبت کرنے والے بچوں کی تصویر بنانے میں مصروف ہو گیا۔ اس تصویر میں میں نے آس پاس کی چیزوں کی مثلاً جھاڑیاں۔ کھلیان کے دروازے اور گاڑی کے ٹوٹے ہوئے پہیوں کی تصویریں بالکل اصل کے مطابق بنا ڈالیں اور ایک گھنٹہ کے بعد دیکھا تو معلوم ہوا کہ میں نے ایک نہایت عمدہ اور صحیح تصویر بغیر اپنی طرف سے کچھ گھٹائے بڑھائے تیار کر لی ہے۔ اس واقعہ سے قدرت کے چربہ اُتارنے کے میرے پُرانے عقیدہ میں اور بھی تقویت ہو گئی۔ صحیفۂ قدرت ایک لامتناہی شے ہے اور بڑے سے بڑے معلموں کی تعلیم و تربیت کے لئے کافی ہے مگر قواعد وغیرہ کی موافقت میں بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے اور اسی طرح سوسائٹی کے قوانین کی پابندی کے لئے بھی الفاظ استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ جس مصور کا کمال قواعد کی پابندی کر کے بڑھا ہے اس سے کم سے کم اتنا تو ہوگا کہ وہ اپنی تصویر اگر اچھی نہیں تو بُری بھی نہیں بنائے گا۔ ٹھیک اسی طرح جو شخص قوانین کی پیروی کرتا اور سوسائٹی کے شعور اور ادب کو تسلیم کرتا ہے وہ زاہد معاش اور ناقابل برداشت ہمسایہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اصول و قواعد کے متعلق تم جو چاہو کہو۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ وہ قدرتی جذبات کو بدل دیتے اور فطری طرز اظہار کو پلٹ دیتے ہیں۔ مجھ سے یہ نہ کہو کہ "یہ مشکل ہے اور قواعد و قوانین زوائد کو کاٹ چھانٹ کر اصل کو آراستہ کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ" اچھا اس مسئلہ کو صاف اور واضح کرنے کے لئے آؤ ذرا مسلک عشق و محبت پر غور کریں۔ مان لو ایک شخص کسی عورت پر دل و جان سے فریفتہ ہے اُسکا ہر لمحہ اس معشوقہ کی صحبت سے منور، ہر آن اُس کی چشم سحر کار کا مفتوں۔ وہ عاشق جانباز اپنی صحت، اپنا ذوق و شوق، اپنا مال و دولت غرض سب کچھ اُس کے حسن دلستان پر قربان کرتا ہے اور اُسکو یقین دلاتا ہے کہ میری زندگی کی سانس اگر ہے تو تو ہے، میرے کاشانۂ دل کا دیا اگر ہے تو تو ہے۔ اسی دوران میں ایک دنیادار اور قابل احترام شخص سے ملاقات ہوتی ہے جو کوئی حاکم ہے۔ وہ اس عاشق زار

سے مخاطب ہو کر یوں کہتا ہے کہ "میرے نوجوان دوست محبت بے شک ایک قدرتی جذبہ ہے مگر اُس کو جائز حدود کے اندر رکھنا چاہیئے۔ اپنے اوقات کو تقسیم کرو اور اُس میں سے کچھ حصہ اپنے کاروبار پر اور فرصت کا بقیہ حصہ اپنی محبوبہ پر صرف کرو۔ ساتھ ہی اپنی آمدنی کا حساب کتاب کرو۔ اور جو کچھ رقم فاضل ہو اُس میں سے اپنی محبوبہ کے لئے تحفہ تحائف خریدو لیکن یہ یاد رہے کہ ایسا ہمیشہ نہیں بلکہ وقتاً فوقتاً کرنا چاہیئے یعنی اُس کی سالگرہ کے دن یا اور کسی خاص موقع پر" اگر وہ نوجوان عاشق اِس اصلاح پر عمل کرنے لگے تو سمجھو کہ وہ سوسائٹی کا ایک کارآمد فرد ہے اور میں تو کسی حاکم اِن سے اس کو نوکری دینے کی سفارش بھی کروں گا۔ مگر اس کی محبت کا جانتے ہو کیا حال ہوگا؟ وہ بالکل برباد اور خستہ حال ہو جائے گی اور اگر کہیں وہ مصور ہوا تو اس کی ساری خدا داد اہلیت اور قابلیت خاک میں ملجائے گی۔ میرے دوستو۔ خداداد اہلیت اور قابلیت کا دریا ہمیشہ اتنے زور شور سے نہیں اُبلتا کہ تمھاری روحوں کو بھی بہا لیجائے بات یہ ہے کہ اس کے دونوں ساحلوں پر تنگ نظر اور ٹھنڈے دماغ والوں نے بڑے بڑے مضبوط پشتے باندھ دئے ہیں اور اُن کے کنارے مکانات بنائے ہیں، باغات لگائے ہیں اور اسی لئے وہ دریا کی بڑھتی ہوئی موجوں کو خوفناک سمجھتے ہیں۔ اکثر طغیانی کے خیال سے کانپ اُٹھتے ہیں اور ہمیشہ اپنے مکانات اور باغات وغیرہ کی خیر منانے میں عملی طور پر مصروف رہتے ہیں۔

---

۲۷ مئی

میں خوشی میں آپے سے باہر ہو کر شاید تشبیہ اور استعارہ میں پھنس گیا اور اپنے جوش اور ولولہ میں کہاں سے کہاں پہنچا کہ مجھ کو ان بچوں کا قصہ ختم کرنے کی بھی سُدھ نہ رہی میں نے اپنے پچھلے خط میں مختصراً اپنی مصوری کے متعلق کچھ لکھا تھا تو میں اس میں اتنا منہمک ہو گیا تھا کہ دو گھنٹہ اسی جگہ بیٹھا رہا یہاں تک کہ شام ہو گئی اُس وقت ایک جوان عورت ایک ٹوکری لئے تیز قدم بڑھاتی ہوئی بچوں کے پاس آئی جو اب تک اسی جگہ بیٹھے تھے اور دور ہی سے کہنے لگی کہ "فلپ تم بڑے اچھے لڑکے ہو" اُس نے پھر مجھ کو سلام کیا اور میں بھی جواب دے کر اُٹھا اور اُٹھ کر اسکے پاس گیا اور پوچھا کہ کیا آپ ہی ان خوبصورت بچوں کی

ماں ہیں۔ اُس نے کہا "ہاں" یہ کہہ کر بڑے کو اُس نے ایک روٹی کا ٹکڑا دیا اور چھوٹے کو گود میں لے کر مادرانہ شفقت اور محبت سے پیار کرنے لگی اور پھر میری طرف مخاطب ہو کر کہنے لگی کہ میں اس بچی کو فلپ کے سپرد کر کے اپنے بڑے لڑکے کے ساتھ روٹی، شکر اور ہانڈی وغیرہ خریدنے بازار چلی گئی تھی۔

ٹوکری پر سے ڈھکنا ہٹ جانے سے میں نے یہ سب چیزیں اُس کی ٹوکری میں دیکھیں پھر بولی کہ "میں ہانس (جو اس کی چھوٹی بچی کا نام تھا) کے لئے آج رات کو کچھ شوربا تیار کروں گی اس لئے کہ کل رات کو بڑے لڑکے نے شرارت سے فلپ سے لڑائی کر کے ہانڈی توڑ ڈالی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ آپ کا بڑا لڑکا کہاں ہے۔ وہ شاید یہ کہنے والی ہی تھی کہ اُسکا لڑکا دو مادہ قازوں کو چراگاہ سے ہنکا کر مکان لیجا رہا ہے کہ اتنے میں وہ خود ہی آگیا اور آتے ہی اُس نے فلپ کو بید کی ایک شاخ دی۔ میں کچھ دیر تک اُس عورت سے باتیں کرتا رہا اور اثنائے گفتگو میں معلوم ہوا کہ وہ ایک مدرسہ کے معلم کی لڑکی ہے اور اُسکا شوہر اپنے کسی عزیز کی موت پر اپنا ترکہ حاصل کرنے سوئٹزرلینڈ گیا ہے۔ پھر کہنے لگی "لوگ میرے شوہر کو فریب دے کر سارا مال ہڑپ کر لینا چاہتے تھے اور خط تک کا جواب نہیں دیتے تھے اسلئے ابکی وہ خود گیا ہے۔ اس کے جانے کے بعد البتہ مجھے اُس کی کوئی اطلاع نہیں ملی خدا کرے وہ صحیح سلامت اپنے سفر سے واپس آئے" میں کسی قدر افسوس کے ساتھ اُس عورت سے رخصت ہوا اور رخصت ہوتے وقت میں نے ہر لڑکے کو ایک ایک کریوزر[1] اور سب سے چھوٹے کو ایک کریوزر زائد شوربا اور روٹی خریدنے کیلئے دیا۔ پھر ہم لوگ جدا ہو گئے۔

ہاں میرے شفیق دوست! جب میں آپے سے باہر ہوتا ہوں تو اُسوقت میرے متلاطم جذبات میں سکون پیدا کرنے کیلئے مجھے اس عورت سے بہتر اور کوئی ہستی نہیں معلوم ہوتی۔ اپنی محدود ہستی کے دائرہ میں وہ کتنی مسرت آمیز بے فکری سے زندگی بسر کرتی ہے اور اپنی روزمرہ کی ضروریات کو پوری کرتی ہے۔ دن کا دن ختم ہو جاتا ہے مگر اُس کے دل میں نہ تو کوئی اضطراب پیدا

---

[1] چاندی کا ایک چھوٹا سکہ جو پہلے جرمنی اور آسٹریا میں استعمال ہوتا تھا۔

ہوتاہے اورنہ موسم خزاں کے زرد زرد بتجھڑ سے اس میں کوئی ہیجان اُٹھتا ہے ہاں اتنا ضرور ہے کہ کہ ان زرد پتیوں کے گرنے سے بس اس کو اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اب جاڑا آرہا ہے۔

اس شام کے بعد اس جگہ میں کئی مرتبہ گیا ہوں۔ بچے مجھ سے بہت کچھ ہل مل گئے ہیں قہوہ پیتے وقت شکر میں سے بھی میں اُن کا حصہ لگاتا ہوں اور رات کے وقت وہ سب میری روٹی مکھن اور دودھ میں بھی شریک ہوتے ہیں۔ ہر اتوار کو میں اُن بچوں کو ایک کریوزر ضرور دیتا ہوں اور جس روز شام کو گرجا کی عبادت کے بعد وہاں نہیں جاتا تو اُس دن کے لئے میں نے اُس عورت سے کہہ رکھا ہے کہ وہ میری طرف سے ان بچوں کو کچھ دیدے۔ بچے مجھ سے اتنا مانوس ہوگئے ہیں کہ جو کچھ وہ سنتے ہیں مجھ سے ضرور آکر کہتے ہیں۔ جب قصبہ کے اور لڑکے جمع ہوتے ہیں تو اُن بچوں کی سادگی اور خوش مزاجی سے مجھے خوشی ہوتی ہے۔ اُن کی ماں برابر ان سبھوں کو یہ کہہ کر پکڑلے جایا کرتی ہے کہ کہیں مجھے تکلیف نہ ہونے پائے۔ مگر میں نے بڑی مشکل سے اس کو سمجھا بجھا کر راضی کرلیا ہے کہ بچوں سے بدستور سابق کوئی مزاحمت نہ کی جائے۔

---

۳۰ رمئی

میں نے حال میں جو کچھ مصوری کے متعلق لکھا ہے وہ حرف بحرف شاعری کے لئے بھی صحیح ہے ہمارے لئے یہ جاننا ازبس ضروری ہے کہ کون سی چیزیں اچھی ہیں اور ان کا اظہار کس طرح کیا جائے۔ یعنی بہت کچھ مضمون تھوڑے لفظوں میں کیونکر ادا کیا جائے۔ آج ایک واقعہ پیش آیا جس کا اگر لفظ بہ لفظ ذکر کیا جائے تو بدوی زندگی کی ایک نہایت عمدہ داستان تیار ہوجائے گی لیکن شاعری قدرتی مناظر اور چرواہوں کی زندگی کے ذکر سے کیا فائدہ؟ کیا ہم فن کی مدد لئے بغیر قدرت سے براہِ راست لطف نہیں اُٹھا سکتے؟

اگر تم اتنے دیباچہ سے کسی عظیم الشان چیز کی اُمید باندھو گے تو تم کو مایوسی ہوگی کیونکہ اس کا تعلق تو ایک کسان کے خوش طبع لڑکے سے ہے جس سے مجھے گہری دلچسپی پیدا ہوگئی ہے میں اپنے قصہ کو جیسا کہ میرا دستور ہے نہایت بھونڈے طریقے سے سناؤں گا اور تم بھی اپنے دستور کے مطابق مجھکو ژولیدہ بیان اور آشفتہ مزاج تصور کروگے۔ خیر یہ والہانہ ہی ہے اور

ہمیشہ والہانہ ہی رہے گا جو ایسے عجیب و غریب واقعات پیش کرتا ہے۔

مکان کے باہر نیبو کے درختوں کے نیچے کچھ لوگ قہوہ پینے جمع ہوئے تھے۔اس مجمع سے مجھے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔اس لئے میں کوئی نہ کوئی عذر پیش کر کے وہاں سے دور ہی رہا اتنے میں قریب کے مکان سے ایک کسان نکل کر آیا اور اسی ہل کے کچھ حصہ کی مرمت کرنے لگا جس کی تصویر میں نے اُتاری تھی ۔ وہ کافی قبول صورت تھا اور میں نے اس سے باتیں بھی کیں اس کے حالات وغیرہ پوچھے ۔ بعد کو اُس سے کافی ملاقات بڑھ گئی اور جیسا کہ اس قسم کے لوگوں میں میرا دستور رہا ہے میں فوراً اُس کا رازدار ہوگیا۔اُس نے اپنا قصہ یوں بیان کیا کہ میں ایک جوان بیوہ کا نوکر تھا جو مجھ سے نہایت محبت کا برتاؤ کرتی تھی۔اُس نے اپنی مالکہ کا اتنا حال بیان کیا اور اُس کی اتنی تعریفیں کیں کہ مجھے فوراً معلوم ہوگیا کہ وہ اس پر ہزار جان سے عاشق ہے۔پھر کہنے لگا کہ" اُس کے عنفوان شباب کا زمانہ گزر چکا ہے ، اس کے متوفی شوہر نے اُس کے ساتھ ایسا بُرا برتاؤ کیا کہ وہ اب کسی طرح شادی کرنے پر راضی نہیں" اس کے بیان سے یہ صاف معلوم ہوتا تھا کہ اُس بیوہ کا حسن اُس کی آنکھوں میں سمایا ہوا ہے۔اُس کی بڑی تمنا یہی تھی کہ اپنے سابق شوہر کی تلخ یاد سٹانے کے لئے وہ اسی کو اپنا رفیق بنالے اچھا اس کے عشق کی گرویدگی اور صداقت کے اظہار کے لئے میں اسی کے الفاظ کیوں نہ استعمال کروں لیکن اس کے چہرہ کی ساخت، اُس کی آواز کی شیرینی اور اُس کی آنکھوں کا قدرتی جوش بیان کرنے کے لئے میرے خیال میں ایک بڑے شاعرانہ دل و دماغ کی ضرورت ہے ۔اسکی ہر حرکت اور ادا کا اظہار الفاظ سے بعید ہے اور میری کوشش خواہ کتنی بلیغ کیوں نہ ہو اس منظر کا خاطر خواہ نقشہ نہیں پیش کرسکتی۔اس کے اس اندیشہ سے کہ شاید میں اس کے اور اس کی معشوقہ کے تعلقات میں غلط فہمی کا شکار نہ ہو جاؤں یا اُس کی معشوقہ کے موجودہ رویہ کو نازیبا ٹھہراؤں میرے دل پر بڑا اثر پڑا۔جس فسوں کاری سے اُس نے اسکی شکل و صورت، قدوقامت (جنھوں نے جوانی کی رعنائی نہ رکھنے کے باوجود اُس کو کمند محبت میں گرفتار کرلیا)، کا حال بیان کیا وہ بالکل ناقابل اظہار ہے۔اس لئے میں اُس کو تخیل

پر چھوڑتا ہوں ۔ میں نے اپنی زندگی بھر میں ایسا پاک اور سچا عشق اور ایسی جوشیلی محبت نہ دیکھی ہے نہ سنی ہے اور نہ اس کا کبھی خیال کیا ہے ۔ للہ مجھ پہ الزام نہ لگاؤ اگر میں کہوں کہ اس معصوم اور سچے عشق کا تصور میری روح میں سرایت کر گیا ہے یا وفاداری اور محبت کی یہ جیتی جاگتی تصویر ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے پھرتی ہے یا خود میرا دل اس شعلہ سے جل کر اندر ہی اندر بھڑک رہا ہے ۔

میرے جی میں آتا ہے کہ میں بھی ایک دفعہ اس مجسمۂ حسن کو جاکر دیکھ آؤں ۔ پھر خیال آتا ہے کہ کیوں جاؤں اسلئے کہ بہتر یہی ہے کہ اس کو اُس کے عاشق کی آنکھوں سے دیکھوں ۔ ممکن ہے کہ اُسکی دلربائی دیکھنے سے اتنی نہ ہو جتنی کہ اس وقت میری آنکھوں سے معلوم ہوتی ہے اور جب یہ معاملہ ہے تو میں کاہے کو ایسی دلربا تصویر کا نقش اپنے دماغ سے مٹاؤں ؟

---

۱۶ ر جون

میں نے اس طرف بہت دنوں سے تمہیں کوئی خط نہیں لکھا ۔ اسکا کیا سبب ہے ؟ بھائی تم تو ہر معاملہ کی تہ تک پہنچنے کا دعویٰ کرتے ہو اور پھر بھی اس قسم کے سوالات کرتے ہو ۔ اس لحاظ سے تو تم کو سمجھ جانا چاہیئے تھا کہ میں اچھا ہوں ۔ مختصر یہ کہ میں نے یہاں ایک ایسی ہستی سے ملاقات پیدا کر لی ہے جس نے میرا دل موہ لیا ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی ملاقات میں مجھے ایک ایسی چیز ملی ہے جس کا مجھے خود بھی علم نہیں ۔ تمہارے پاس برابر اس قسم کا خط لکھتے رہنا کہ میں نے کسی طرح ایک زندہ دل اور لطیف طبع خاتون سے ملاقات پیدا کی ، یقیناً بڑا مشکل کام ہوگا ، لیکن میں خوش ہوں اور قانع بھی اور واقعات کے لحاظ سے شائد اسی لئے ایک خراب وقائع نگار ہوں ۔

اسے کوئی فرشتہ کہنا حماقت ہوگی حالانکہ ہر شخص اپنی محبوبہ کو فرشتہ سے کم نہیں سمجھتا لیکن پھر بھی میں تم سے اس کے کمالات نہ تو اچھی طرح بیان کر سکتا ہوں اور نہ اُس کے اسباب پر بحث کر سکتا ہوں ۔ بس اتنا کہنا کافی ہے کہ اُس نے میرے تمام حواس کو تسخیر

کر لیا ہے۔ اس میں انتہائی سادہ دلی کے ساتھ عقل، نرمی کے ساتھ عزم، اور دماغی سکون کے ساتھ متحرک زندگی کے عناصر اس درجہ موجود ہیں کہ تعریف محال ہے لیکن اس قسم کے چلتے ہوئے فقرے عام طور پر خیالات کے اظہار کے لئے استعمال ہوتے ہیں جن میں اصلیت کا کہیں پتہ نہیں ہوتا۔ اچھا میں اُس کی صحیح سیرت پھر کبھی بیان کرونگا اچھا تو ابھی بیان کئے دیتا ہوں ورنہ پھر موقع شاید ہی ملے اس لئے کہ جب سے خط لکھنے بیٹھا ہوں تین دفعہ قلم پھینکتے پھینکتے اور گھوڑا منگا کر اُس کے یہاں جاتے جاتے رک گیا حالانکہ میں نے قسم کھائی تھی کہ آج صبح وہاں نہیں جاؤں گا مگر یقین مانو کہ ہر لحظہ میں کھڑکی کی طرف اُٹھ کر دیکھتا رہا کہ آفتاب کتنا بلند ہوا۔

اس کشاکش میں آخر میں ہی مغلوب رہا اور وہاں گیا اور وہاں سے ابھی واپس آنے کے بعد یہ خط تم کو کھانے کے وقت لکھ رہا ہوں۔ اُس کو اُس کے بچوں اور آٹھ بھائیوں اور بہنوں کے درمیان دیکھ کر مجھ کو بڑی خوشی ہوئی۔ لیکن اگر میں یہ سب لکھتا جاؤں تو خط کبھی ختم ہی نہیں ہوگا اور نہ تم کچھ سمجھو گے۔ اچھا لو سنو اب میں ذرا تفصیل سے روشنی ڈالوں گا تاکہ تم کو کچھ اندازہ ہو جائے۔

کچھ دنوں قبل میں تمہیں لکھ چکا ہوں کہ میری ملاقات ایک صاحب مسمی س سے ہوئی ہے جو یہاں ضلع کے جج ہیں۔ انھوں نے مجھے ایک دفعہ اپنے گھر بلانے کی دعوت بھی دی تھی جہاں وہ عزلت گزینی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ میں بہر حال وہاں جانا بھول گیا اور شاید نہ جاتا اگر اتفاق سے ایک خزانہ کا پتہ چلتا جو اس اکیلی جگہ میں چھپا ہوا ہے۔

میرے چند احباب نے تجویز پیش کی کہ ایک محفل رقص ہونی چاہئے۔ میں نے بھی اس میں شرکت کی فوراً منظوری دے دی اور اس تقریب کی خاطر پاس پڑوس کی ایک خوبصورت اور پسندیدہ مگر معمولی لڑکی کو اپنی رفیقہ منتخب کر لیا۔ بعد کو ہم دونوں میں قرار پایا کہ میں ایک گاڑی کرایہ کر لوں اور اپنی رفیقہ اور اُس کی چچی کو ساتھ لیکر شارلٹ کے مکان پر سوار ہو کر جاؤں اور پھر اُس کو بھی لے کر محفل رقص میں جاؤں۔ جب ہم اس

شکارگاہ والے مکان کے سامنے سے گذر رہے تھے تو میری رفیقہ نے کہا کہ تم سے ایک نہایت خوبصورت اور دلربا لڑکی سے ملاقات ہوگی۔ پھر فوراً ہی اُس کی چچی بولی کہ دیکھنا کہیں تم اسپر عاشق نہ ہو جاؤ۔

میں نے پوچھا کہ آخر اس میں بات کیا ہے۔ اس پر اُس نے جواب دیا کہ وہ لڑکی پہلے ہی سے ایک بڑے آدمی سے منسوب ہے جو اپنے باپ کی موت کے بعد اپنی جائداد کے تمام معاملات طے کرنے کہیں گیا ہے اور اب تو وہ اچھی خاصی موروثی جائداد کا مالک ہوگا۔ اس خبر سے مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوئی۔

جب ہم دروازہ کے پاس پہنچے تو سورج پہاڑی کی چوٹیوں کے پیچھے لہلہا رہا تھا ہوا کچھ تیزی سے چل رہی تھی اور کالے بادل بھی اُفق پر پھیلے ہوئے تھے۔ اس پر عورتوں کو طوفان وغیرہ کی آمد سے اندیشہ ہوگیا لیکن میں نے موسم کا گُر سمجھنے والا بن کر اُن کو تسلی دی اور انکے اندیشہ کو کم کیا حالانکہ اُس وقت میں خود ڈر رہا تھا کہ اگر کہیں طوفان آیا تو ہمارا سارا لطف کرکرا ہو جائیگا۔

میں گاڑی سے باہر نکلا اور میرے اُترتے ہی ایک خادمہ دروازہ پر آئی اور کہنے لگی کہ ذرا ایک منٹ کے لئے ٹھہر جائیے میری مالکہ آپ لوگون کے استقبال کے لئے تشریف لا رہی ہیں۔ بہر حال میں صحن میں سے ہوتا ہوا ایک عمدہ مکان کے سامنے آیا اور سامنے والی سیڑھیوں سے چڑھ کر اندر گیا اور جیسے ہی میں نے دروازہ کھولا ویسے ہی ایک ایسا روح پرور اور دل نواز منظر نظر آیا جو میں نے اپنی زندگی میں شاید ہی کبھی دیکھا ہو۔ دو برس سے لے کر گیارہ برس تک کے چھ بچے بڑے کمرے کے اندر دوڑتے اور دوڑ کر ایک اوسط قد کی حسین عورت کے ارد گرد جو سفید کپڑوں پر لال فیتے لگائے ہوئے تھی جمع ہو جاتے اور روٹی کے ٹکڑے پاکر زور سے خوشی میں چلاتے۔ اُس کے ہاتھ میں ایک روٹی تھی جسکو کاٹ کر اور مکھن لگا کر وہ بچوں کو بھوک اور عمر کے لحاظ سے بانٹ رہی تھی۔ یہ کام وہ اتنی خوش اسلوبی سے کرتی تھی کہ ہر بچہ باری باری ہاتھ پھیلاتا اور روٹی کا ٹکڑا لے لیتا۔ تھوڑی دیر بعد بعض

بچے تو رات کا کھانا کھانے چلے گئے اور بعض جو کم شرارتی تھے اُس اجنبی کی گاڑی دیکھنے باہر چلے گئے جس میں شارلٹ جانے والی تھی۔ اتنے میں شارلٹ بولی کہ میری وجہ سے آپ نے جو یہاں تکلیف فرمائی ہے میں اسکی معافی چاہتی ہوں اور مجھے افسوس ہے کہ خواتین کو میرے انتظار میں دیر ہوئی وجہ یہ ہوئی کہ کپڑے بدلنے اور دیگر امور خانہ داری میں اتنا مشغول ہو گئی کہ بچوں کو کھانا دینا بھول گئی اور بچے بھی ایسے ہیں کہ میرے بغیر کسی اور کے ہاتھ سے کھاتے بھی نہیں۔ میں نے اس کے جواب میں آہستہ سے کوئی بے معنی تعریف کا فقرہ کہدیا جو مجھے اب یاد نہیں مگر ہاں اتنا جانتا ہوں کہ اُس کی شیریں آواز سن کر اور اُس کی دلربا اداؤں کو دیکھ کر میرا دل بے اختیار ہاتھ سے جاتا رہا اور قبل اس کے کہ میری بیخودی اور بیقراری کو چین آئے وہ دوسرے کمرہ میں اپنا دستانہ اور پنکھا لینے چلی گئی۔ جب وہ کمرہ میں تھی تو میں سب سے چھوٹے بچہ کے پاس گیا جو بہت خوبصورت تھا۔ اس پر دوسرے بچے کنکھیوں سے مجھے دیکھنے لگے۔ چھوٹا بچہ مجھے دیکھ کر پیچھے ہٹا مگر اتنے میں شارلٹ آگئی اور کہنے لگی "لوئس اپنے عم زاد سے کیوں نہیں ہاتھ ملاتے" بچہ نے جلدی سے ہاتھ بڑھایا اور میں نے بھی خوب جی بھر کے اُس کو پیار کیا۔ بعدازاں بچہ کو شارلٹ کی گود میں دے کر میں نے پوچھا کہ "کیا مجھے آپ سے رشتہ داری کا فخر حاصل ہے؟" فوراً اُس نے اپنے ہونٹوں کی محراب نما مسکراہٹ سے جواب دیا کہ "میرے تو بہت سے بھائی ہیں اور اگر آپ ان میں سے ناقابل ثابت ہوں تو مجھے افسوس ہوگا"۔ رخصت ہوتے وقت اُس نے اپنی بہن صوفی سے جو گیارہ برس کی تھی، بچوں کی نگرانی کی تاکید کی اور کہا کہ جب ابا جان سیر کر کے واپس آئیں تو مکان چلی جانا۔ اور بچوں سے بھی کہدیا کہ صوفی کے حکم کی تعمیل میرے حکم کی طرح کریں۔ بعض بچوں نے وعدہ بھی کر لیا۔ مگر چھ برس کی ایک خوبصورت بچی اس پیمان پر کچھ مضطرب نظر آئی اور شارلٹ سے کہنے لگی کہ "صوفی تمہارے برابر نہیں ہوسکتی اور نہ اُس کو ہم تمہاری طرح پیار کر سکتے ہیں" اس عرصہ میں دو لڑکے گاڑی کے اوپر والے حصہ پر چڑھ کر بیٹھ گئے اور میری درخواست پر اس شرط پر اُن کو جنگل کے آخری حصہ تک جانے کی اجازت دی گئی کہ وہ بالکل خاموشی سے مضبوط پکڑ کر بیٹھے رہیں۔

ہم لوگ روانہ ہونے کے لئے گاڑی میں بمشکل بیٹھے ہی تھے اور عورتوں نے ابھی ایک دوسرے کی مزاج پرسی اور ایک دوسرے کی پوشاک اور رقص میں ملنے والے لوگوں کے متعلق کوئی بات بھی نہیں کی تھی کہ شارلٹ نے گاڑی رکوا دی اور اپنے بھائیوں کو اُتروا دیا۔ ان دونوں نے اُس کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور اُتر گئے۔ بڑے نے تو ایک پندرہ سال کے نوجوان کی طرح نرمی اور چھوٹے نے محبت اور بے پروائی دکھائی۔ اس نے بچوں کو پیار کہلایا اور پھر گاڑی چلی۔

میری رفیقہ کی چچی نے شارلٹ سے پوچھا کہ کیا آپ میری بھیجی ہوئی کتاب ختم کر چکیں۔ شارلٹ نے کہا کہ "میں نے ابھی شاید اُسے اچھی طرح دیکھا بھی نہیں۔ وہ مجھے بالکل پسند نہیں آئی۔ آپ اُسے لے سکتی ہیں۔ مجھے اس کتاب سے پہلے والی کتاب کی طرح کوئی خاص لُطف نہیں آیا۔"

جب اُس نے میرے پوچھنے پر کتاب کا نام بتایا تو میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی مجھے تو اس کے ہر قول میں باریک بینی اور نکتہ سنجی کا پہلو معلوم ہوتا تھا اور جب اسکا فقرہ سامعین اچھی طرح سمجھ لیتے تو اس کے چہرہ پر ایک طرح کی چمک اور خداداد قابلیت کا ایک نیا انداز ہویدا ہوتا۔ اس کے بعد وہ یوں گویا ہوئی کہ "جب میری عمر اس سے کم تھی تو مجھے دنیا میں رومانیت سے زیادہ اچھی اور کوئی چیز نہیں معلوم ہوتی تھی۔ فرصت اور چھٹی کے وقت کسی گوشہ میں بیٹھ کر جب میں کسی خیالی لیولورا[۵] کا افسانۂ الم و نشاط پڑھتی تو میری خوشیوں کی کوئی انتہا نہیں ہوتی میں اس سے انکار نہیں کرتی کہ اب بھی مجھ پر ایسی کتابوں کا کچھ نہ کچھ اثر ہوتا ہے۔ مگر میں پڑھتی بھی کم ہوں اور چاہتی ہوں کہ جو پڑھوں وہ بالکل میرے مزاج کے موافق ہو۔ میں اُن مصنفوں کی تصنیفات کو زیادہ پسند کرتی ہوں جو اپنی کتابوں میں خود میری جیسی زندگی کے مناظر پیش کرتے ہیں جہاں میں اپنے احباب کو بالکل فطری ماحول میں پاتی ہوں اور جہاں کی

---

[۵] لیولورا ۔ یہ پندرہویں اور سولھویں صدی کی ایک جرمن گیت ہے جس میں ایک لڑکی کے واردات عشق کا افسانہ ہے ۔ برگر (۱۷۴۷ء-۱۷۹۴ء) نے اس کو نظم کیا ۔ یہ نظم پہلی بار ۱۷۷۳ء میں شایع ہوئی اور بہت مشہور ہوئی ۔ جرمنی کے رومانی شعرا میں برگر کا درجہ بہت بلند ہے ۔ عشقیہ مضامین کو بڑے سوز و گداز کے ساتھ ادا کرتا ہے ۔ کچھ دنوں گٹنگن کی یونیورسٹی میں پروفیسر بھی تھا ۔ اپنے جذبات کی فراوانی کی وجہ سے "طوفان و ہیجان" کے دور میں پھنس کر رہ گیا اپنی اوباشانہ زندگی کی وجہ سے اپنے بہت سے قدیم دوستوں سے اسکو علیحدہ ہونا پڑا اور بالآخر انتہائی مفلسی اور غربت میں مرا۔

زندگی میری مکانی اور خانگی زندگی سے بالکل مشابہ اور اسی طرح دلچسپ اور پُراثر ہوتی ہے اور جو بہشت کا نمونہ بنے بغیر میرے لئے اطمینان اور مسرت کا مرکز اور منبع ہے۔

آخری فقرہ کے اثر کو میں نے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی مگر یہ کوشش دیر تک نہ چل سکی جب اُس نے ویکار آف ویکفیلڈ[1] پر اور دوسری کتابوں پر جنکا نام بتانا ضروری نہیں معلوم ہوتا نہایت خوبصورتی سے منصفانہ اور ناقدانہ اظہار خیال کیا تو میں اپنے کو بالکل نہ روک سکا اور بکمال شوق میں اسطرح نفس مضمون پر اپنے خیالات ظاہر کرنے لگا کہ تھوڑی دیر کے بعد جب شارلٹ نے ان دونوں عورتوں سے گفتگو شروع کی تو مجھے ان کی موجودگی کا دوبارہ احساس ہوا اور انکو متعجبانہ انداز میں بت بنا بیٹھا ہوا دیکھا گیا۔اس پر وہ بڈھی چچی مجھکو بار بار چین بجبیں ہوکر دیکھتی جاتی مگر میں نے اس کی مطلق پروا نہیں کی۔

بعدازاں ہم لوگوں نے رقص، لطف اور تفریح پر بات چیت شروع کی۔ شارلٹ نے کہا کہ اگر رقص کا پسند کرنا معیوب ہے تو مجھکو اپنی غلطی تسلیم کرنے میں ذرا باک نہیں اس لئے کہ رقص سے بڑھ کر مجھے اور کوئی تفریح مرغوب نہیں۔اگر میری طبیعت اُچاٹ ہوتی ہے تو میں پیانو پر وہ راگ بجاتی ہوں جس پر میں نے اکثر رقص کیا ہے اور تب میری طبیعت بہل جاتی ہے اور تمام غم غلط ہو جاتا ہے۔

تم چونکہ مجھے خوب جانتے ہو اس لئے تم اچھی طرح سمجھ گئے ہوگے کہ دوران گفتگو میں میرا

---

[1] انگلستان کے مشہور مصنف اولیور گولڈاسمتھ (۱۷۲۸-۱۷۷۴) کی مشہور تصنیف ہے جو ۱۷۶۶ء میں شائع ہوئی۔ کہنے کو تو مصنف نے ایک پادری کی خانگی زندگی کے حالات قصہ کے رنگ میں لکھے ہیں۔ مگر درحقیقت اس میں انگلستان کی اٹھارہویں صدی کے اوسط درجہ کے لوگوں کی ذہنی اور معاشرتی تصویر تخیل اور جذبات کی رنگ آمیزی کے بعد پیش کی گئی ہے اور سادہ اور قدرتی زندگی کو تہذیب کی خلاف فطرت زندگی کے مقابلہ میں سراہا گیا ہے۔ مگر انداز بیان میں روسو کے جوش و خروش کا کہیں نام نہیں۔ آخر میں نیکی اور خدا پرستی کی تلقین کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ صرف نیکی ہی ایسی چیز ہے جس سے انسان دنیا کی برائیوں سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ گوئٹے نے اس ناول کی سادگی اور اسلوب فطرت کے درس کا بہت اثر قبول کیا اور اپنی خود نوشتہ سوانح عمری میں اس قصہ کو تمام ناولوں سے برتر بتایا ہے۔

تار نظر برابر اُس کی مست اور سیاہ آنکھوں میں پیوست ہوتا رہا اور میری روح اُس کے بہت نازک اور رخسار صندلین پر تصدق ہوتی رہی اور میں اُس کی شیریں کلامی میں اتنا محو ہو گیا کہ اُس کے الفاظ کا بھی خیال نہ رہا۔ اسی حالت میں میں دنیا و مافیہا سے اسطرح بیگانہ ہو کر گاڑی سے اُترا جیسے کوئی مدہوش خواب یا سرمست شراب ہوا اور اُس نغمہ کو بھی سن نہ سکا جو سامنے والے روشن کمرہ سے بلند ہو رہا تھا۔ مسٹر اندران اور کوئی صاحب ن۔ ن نے (میں نام سے زیادہ واقف نہیں)، جو اس بڑھی چچی اور شارلٹ کے رفیق رقص تھے، ہم لوگوں کا گاڑی کے پاس استقبال کیا اور اپنی اپنی رفیقہ کو ہمراہ لے گئے۔ میں بھی پیچھے پیچھے اُن لوگوں کے ساتھ ہو لیا۔

سست قدم والے رقص سے ابتدا ہوئی۔ میں نے یکے بعد دیگرے کئی عورتوں کے ساتھ رقص کیا اور جو ان میں نہایت بدصورت تھیں وہ جلد میرا ساتھ نہیں چھوڑتی تھیں۔ شارلٹ اور اس کے ہمراہی نے انگریزی طرز کا ایک دیہاتی رقص شروع کیا اور جب ان دونوں نے رقص کرتے کرتے میری طرف رخ کیا تو اسوقت میرا دل مارے خوشی کے اتنا اُچھل رہا تھا کہ تم اسکا اندازہ نہیں کر سکتے۔ کاش تم شارلٹ کو رقص کرتے دیکھتے جب وہ رقص کرتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ساری کائنات رقص میں مصروف ہے، اُسکی زندگی گویا سراپا رقص ہے۔ ہاں، وہ رقص کرتے وقت دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر معلوم ہوتی ہے۔ اُف! اُسکا جسم کتنا سڈول، ہلکا اور خوبصورت ہے۔ میں نے جب اُس سے اپنے ساتھ رقص کرنے کی درخواست کی تو وہ ایک دوسرے شخص کے ساتھ دوبارہ مصروف رقص تھی۔ تاہم تیسری بار ہم آغوش ہو کر رقص کرنے کے لئے اپنی ہمراہی کا فخر مجھے بخشنے پر وہ نہایت آزادی سے راضی ہو گئی۔ ساتھ ہی اُس نے اپنے دلفریب ہونٹوں کو ہلا کر جس پر ایک نہایت سحر طراز مسکراہٹ کھیل رہی تھی کہا کہ مجھے تو جرمن طریقے کا رقص (یعنی ہم آغوش ہو کر رقص کرنا) بہت پسند ہے اور اس طرف رواج بھی یہی ہے کہ نوجوان عورتوں اور مردوں کے جوڑ جرمن ناچ ناچتے ہیں لیکن میرے ساتھی کو اس میں بالکل لطف نہیں آتا اور اگر میں یہ رقص ختم کردوں تو شاید

اُسکو ایک طرح کا آرام ہے۔ اور میں دیکھتی ہوں کہ آپ جس خاتون کے ساتھ رقص کر رہے ہیں اُس کا بھی یہی حال ہے۔ شاید اسکو اس قسم کے ناچ کا طریقہ معلوم نہیں لیکن انگریزی طرز کے دیہاتی رقص کے وقت میں دیکھ رہی تھی کہ آپ جرمن ناچ خوب ناچتے ہیں۔ اچھا آئیے ہم آپ جرمن ناچ ناچیں۔ اس کی اطلاع آپ اپنے ساتھی کو اور میں اپنے ساتھی کو دیدوں تاکہ دونوں جوڑوں کو آسانی ہو۔

ہم لوگ اس تبادلہ پر راضی ہو گئے اور ہمارے ساتھیوں نے بھی اس تبادلہ کو منظور کر لیا۔ اوّل اوّل تو ہم دونوں اپنے بازوؤں کو ہر قسم کا چکر دیکر خوش ہوتے رہے لیکن اتنے ہی میں مجھے معلوم ہو گیا کہ اس کے ہاتھ اُٹھانے کی ادا بھی کتنی پیاری اور دلکش تھی۔ جب ہم آغوش ہو کر رقص کا وقت آیا اور ہر جوڑ بڑے زوروں کے ساتھ ناچنے لگا تو بعضوں کی ناتجربہ کاری سے محفل میں برہمی پھیل گئی مگر ہم دونوں بڑی صفائی سے اس ریلے سے بچتے رہے اور جب ہنگم اور بد وضع ناچنے والوں نے اپنا رقص ختم کر دیا تو ہم دونوں نے از سر نو رقص شروع کیا۔ اسوقت وہاں صرف ایک جوڑ موجود تھا۔ میں تم سے کیا بتاؤں کہ اسوقت میرے بدن میں کس بلا کی چستی تھی، بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رگوں میں خون کے ساتھ کسی نے پارہ ملا دیا ہے یا میں کوئی بالا از انسانیت ہستی تھا۔ جو اپنی آغوش میں دنیا کی خوبصورت ترین ہستی کو لئے ہوئے ہے اور رقص میں بھی میں باد صبا جیسی شوخیاں دکھا کر دنیا سے بیگانہ ہو جاتا۔

اب میں تم سے اپنے دل کی ایک بات کہتا ہوں یعنی ایسی خوبصورت ہستی کے ساتھ تھوڑی دیر محو رقص ہو سکنے کے بعد جی تو یہی چاہتا ہے۔ خواہ اس آرزو میں مجھے کتنی ہی سزا کیوں نہ بھگتنی پڑے کہ اب وہ کسی غیر کے ساتھ نہ تو لطف صحبت اُٹھائے اور نہ رقص کرے۔ ہاں تو تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو گے۔ ہم دونوں تھوڑی دیر تک اپنی سانس درست کرنے کے لئے کمرہ میں ٹہلتے رہے۔ بعدازاں جب شارلٹ بیٹھ گئی تو میں نے نیبو کی کچھ قاشیں جو میں اپنے ساتھ لایا تھا اس لئے کہ وہاں ان کا ملنا مشکل تھا پیش کیں۔ لیکن ہر قاش جو وہ اپنے

کسی ہم نشین کو دیتی میرے دل پر تیر و نشتر کا کام کرتی - ویہاتی طریقہ کے تیسرے رقص میں ہمارا نمبر دوسرا تھا اور جب ہم دونوں رقص ختم کرکے سیڑھیوں سے نیچے اُتر رہے تھے دہائے اُسوقت کتنے مضطر بانہ اور والہانہ انداز سے میں نے اُس کے بازوؤں اور رس بھری آنکھوں کو دیکھا تھا جو محبت اور فطرت کی جیتی جاگتی تصویریں تھیں) تو ایک خاتون جس کا چہرہ باوجود جوانی کی بہار ختم ہو جانے کے حسین تھا سامنے سے گذری اور شارلٹ کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور اپنی انگلیوں کو جارحانہ انداز میں بلند کرکے ایک خاص پر معنی لہجہ میں کہا " البرٹ - البرٹ ،، فوراً ہی میں نے شارلٹ سے اپنی جسارت کی معافی مانگ کر پوچھا کہ یہ البرٹ کون ہے؟ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اتنے میں سیڑھیوں پر میرا اور اُسکا ہاتھ ایک عورت کے درمیان آجانے سے چھوٹ گیا اور جب ہم دونوں پھر آمنے سامنے آئے تو اُسوقت اُس کے چہرے پر حزن اور فکر کے اثرات تھے - اُس نے اپنا ہاتھ میری طرف ٹیکنے کے لئے بڑھایا اور کہنے لگی کہ " آپ سے میں کیا چھپاؤں کہ البرٹ کون ہے - البرٹ آدمی اچھا ہے اور میرا منگیتر ہے " اس فقرہ میں کوئی خاص بات نہ تھی اسلئے کہ گاڑی میں مجھے یہ خبر معلوم ہو چکی تھی - ہاں اتنا ضرور تھا کہ اُسوقت تک میں البرٹ کو شارلٹ کے سلسلہ سے نہیں جانتا تھا - کون شارلٹ ؟ وہی شارلٹ جس کا میں اتنی معمولی ملاقات میں گرویدہ ہو گیا - بس اتنا میرے لئے کافی تھا - میرے حواس بالکل پریشان ہو گئے جس سے تمام لوگوں میں برہمی پھیل گئی اور اگر شارلٹ مجھے کھینچ کر ٹھیک نہ کرتی تو معلوم نہیں کیا ہوتا -

جب ہم لوگ رقص میں مصروف تھے تو اُس وقت آسمان پر بجلی چمک رہی تھی - میں پہلے کہہ چکا تھا کہ موسم گرما کے لئے بجلی کا چمکنا کوئی خاص بات نہیں - یہ تو اس موسم میں ہوتا ہی رہتا ہے مگر اب بجلی کی چمک زیادہ پریشان کن ہو گئی اور گرج کی آواز تو اتنی زیادہ ہو گئی کہ سارنگی کے ہر تار سے اس کی صدائے بازگشت نکلتی - یہ رعد و برق کی تیزی آخر کار اتنی بڑھی کہ تین عورتیں رقص چھوڑ کر چلی گئیں اور ان کے ساتھ انکے ہمراہی بھی فقرو ہو گئے -

اور بعد کو تو انتشار کی کیفیت عام ہوگئی، جس کو دیکھئے پریشانی اور خوف کی صورت بنا ہوا پناہ کی جگہ تلاش کر رہا ہے۔ اتنے میں باجہ بجنا بھی بند ہوگیا۔ ہم لوگ جب عیش ونشاط کے عالم میں ہوتے ہیں تو ذراسی تکلیف اور ہراس کا اثر ہماری طبائع پر بہت زیادہ شاید اس وجہ سے پڑتا ہے کہ حالت ضد اور مقابلہ میں چیزوں کا پرتو صاف اور واضح ہو جاتا ہے یا پھر اس لئے کہ طبائع کی کیفیت اس وقت زیادہ اثر پذیر ہوتی ہے اور ذرا سا اثر بھی زیادہ معلوم ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس خاص حالت میں عورتیں اکثر چیخ اُٹھتی ہیں۔ ایک عورت دریچہ کی طرف اپنی پیٹھ کئے ہوئے نہایت ہمت کے ساتھ اپنے کانوں میں اُنگلی دیئے ہوئے بیٹھی تھی اور دوسری اُس کے زانو پر اپنا سر رکھ کر دبکی جاتی تھی اور تیسری تو اپنی چھوٹی بہن کو لے کر دونوں کے درمیان گھسی جاتی تھی اور اسی عرصہ میں اُسکی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بھی جاری تھے۔ کچھ فوراً مکان واپس چلی گئیں اور بعض تو اتنی دہشت زدہ ہوگئی تھیں کہ اس خوف وہراس کے عالم میں ان کے بعض بے تمیز ہمراہیوں نے اُن لبہائے لعلین کے بے دھڑک بوسے بھی لے لئے جن کی فریاد زمین سے آسمان تک جا رہی تھی مگر ان کو خبر تک نہیں ہوئی۔ مردوں میں سے کچھ لوگ خاموشی سے سگار پیتے نیچے چلے گئے اور کچھ مکان کی مالکہ کی تجویز پر عمل کر کے ایک دوسرے کمرہ میں جا کر بند ہوگئے جس کے دریچوں کے پردے وغیرہ گرا دیئے گئے۔ جیسے ہی کہ ہم لوگ کمرہ میں داخل ہوئے شارلٹ نے کرسیاں گھسیٹ کر ایک حلقہ میں ہم لوگوں کو بٹھا دیا اور کچھ کھیل شروع کرنے کی تجویز کی۔ کچھ لوگ منہ کھولے ہوئے اس اُمید میں کھڑے ہوگئے کہ اگر ہار جیت کا کھیل ہوگا تو دیکھنے میں لطف آئے گا اتنے میں شارلٹ نے کہا کہ آؤ گنتی کا کھیل کھیلیں یعنی میں داہنی طرف سے بائیں طرف چکر لگاتی ہوں اور آپ لوگ ایک ایک کر کے جلد جلد اپنا نمبر گنتے جائیں۔ جو صاحب رکیں گے یا غلطی کریں گے اُن کی گوشمالی ہوگی۔ گنتی ہزار تک ہوگی۔ اس تماشہ میں اچھا خاصہ لطف آیا شارلٹ نے ہاتھ اُٹھا کر گردش شروع کی۔ پہلے چکر پر پہلے آدمی نے کہا ایک۔ دوسرے پر دوسرے نے دو۔ اور تیسرے پر تیسرے نے تین کہا اور پھر شارلٹ کی رفتار کچھ تیز ہوگئی

اتنے میں ایک صاحب نے غلطی کی اور وہیں اُن کی گوشمالی ہوئی اِسس پر دوسرا شخص بجائے گننے کے ہنس پڑا۔ اوسکا ہنسنا تھا کہ اُس کی بھی گوشمالی ہوئی۔ اسی طرح یہ قصہ ہوتا رہا میرے حصہ میں بھی دو گوشمالیاں آئیں جو اوروں کے حصہ سے زیادہ سخت تھیں لیکن میں نے اُن سے خاصا لطف اُٹھایا ابھی گنتی ہزار تک نہیں پہونچنے پائی تھی کہ جلسہ میں ایک عام قہقہہ اور گڑبڑی کی کیفیت شروع ہوگئی اور کھیل بھی ختم ہوگیا اب لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ گئے اسلئے کہ طوفان بھی ختم ہوچکا تھا۔ شارلٹ بڑے کمرہ سے واپس جانے لگی تو میں بھی ساتھ ہولیا رستہ میں اُس نے کہا کہ میری سخت گوشمالیوں اور دھپوں سے لوگ خوف و ہراس بھول گئے اول اول میں بھی کچھ خوف زدہ تھی مگر میں نے جلسہ کی تفریح کے لئے جو ہمت کی تو میرا بھی ڈر جاتا رہا۔ بعدازاں ہم لوگ کھڑکی کے پاس گئے گرج کی آواز دور دور سے اب بھی آتی تھی۔ سامنے تمام کھیتوں پر پانی کی ایک ہلکی دھار آسمان سے گر رہی تھی اور ہوا میں ایک نہایت دلپسند اور تازگی بخش خوشبو پھیلی ہوئی تھی سامنے کا دلفریب منظر دیکھنے کے لئے شارلٹ کہنیوں پر اپنا چہرہ ٹیک کر آگے جھکی اور تمام منظر دیکھنے میں مصروف ہوگئی۔ پھر آسمان کی طرف دیکھ کر میری طرف دیکھا اُسوقت اُسکی آنکھیں پُرنم تھیں اور میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر بولی "کلوپ اسٹوک"[1]! میں فوراً کلوپ اسٹوک کی اس غزل کو سمجھ گیا جسکا خیال اُس کے

---

[1] فریڈرک کلوپ اسٹوک (۱۸۰۳-۱۷۲۴ء) اٹھارھویں صدی کا مشہور جرمن شاعر جو جرمن شاعری میں جدید دور کا علم بردار ہے۔ کلوپ اسٹوک سے قبل جرمن ادب زیادہ تر فرانسیسیوں کی نقالی پر منحصر تھا اور شعر و سخن پر آمد کے بجائے آورد کا رنگ غالب تھا۔ شاعر کے لئے بس ردیف و قافیہ، بحر و وزن کا جاننا ضروری تھا اور اسی پر تمام شاعری کا دارومدار سمجھا جاتا تھا۔ کلوپ اسٹوک نے شاعری کو دل کے جذبات کا ترجمان بنا دیا اور اسی لئے اُس کے کلام میں خاصا زور ہے۔ اس کی مشہور نظم مسیح — اول بار ۱۷۴۸ء میں شایع ہوئی جس میں مذہبی رنگ زیادہ نمایاں ہے۔ اُس نے قدیم جرمانی اور نارسی (شمالی یورپ کے قدیم باشندے نارس کہلاتے ہیں) طرز میں نظمیں لکھیں جس نے عوام میں قبول کی سند حاصل کی۔ بلحاظ وزن وہ اکثر نظموں میں قدیم رومی شاعر ہوریس کی پیروی کرتا ہے قدیم جرمانی اور نارسی طرز کی نظمیں لکھ کر اُس نے اپنے زمانہ کے مقررہ اصول کے بند گراں کو جس سے جرمن ادب دبا ہوا تھا کاٹ ڈالا۔ وہ ہمیشہ دل سے آزادی کا حامی رہا اور اس کی آزادی کی یہ روح ادب میں بھی جھلکتی ہے۔ جب انقلاب فرانس شروع ہوا تو اُس نے بنی نوع انسان کی آزادی کے حق میں بہت سی نظمیں لکھیں۔ اپنی ایک نظم میں (بقیہ صفحہ ۹۰ پر)

دل میں اُسوقت تھا۔ میرے دل میں اسکے احساس سے درد پیدا ہوا اور بے اختیار ہو گیا پھر میں اُس کے نرم اور گورے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر جھک گیا اور اسکو اشک شوق کے چند قطروں سے تر کیا۔ جب سر اٹھایا تو اُس کی طرف غور سے دیکھ کر میں نے کہا کہ "اے کلوپ اسٹوک! افسوس تو نے ان آنکھوں میں (شارلٹ کی طرف اشارہ کرکے) اپنے خیالی محبوب کا جلوہ کیوں نہیں تلاش کیا؟ مگر مجھے تیرے نام سننے کی حس کو لوگ اکثر بدتمیزی سے یاد کرتے ہیں کیا ضرورت!"

---

۱۹ جون

مجھے یاد نہیں کہ میں نے اپنی رام کہانی کہاں چھوڑی۔ ہاں اتنا یاد ہے کہ جب میں بستر پر سونے گیا تو دو بجے تھے اور اگر تم اس وقت یہاں ہوتے تو میں تم کو لکھنے کے بجائے تم سے باتیں کرتا اور صبح تک نہ خود سوتا اور نہ تم کو سونے دیتا۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ شاید رقص سے واپس آنے کے بعد کی کیفیت میں نے تم کو نہیں لکھی اور آج تو میرے پاس اتنا وقت بھی نہیں ہے بہر حال اُس روز کی صبح بڑی خوشگوار تھی۔ تمام خطۂ زمین سیراب ہو گیا تھا۔ آفتاب کا طلوع بھی کچھ کم دلچسپ اور دلآویز نہ تھا۔ درختوں کی پتیوں سے پانی قطرہ قطرہ ہو کر ٹپک رہا تھا۔ ہمارے تمام ساتھی سو رہے تھے۔ شارلٹ نے اول مجھ سے پوچھا کہ "کیا آپ کا ارادہ سونے کا نہیں" اور پھر کہنے لگی کہ "میرے سونے کے لئے زیادہ اہتمام نہ کیجیے"۔ میں نے اُس کی طرف نظر جما کر دیکھا اور کہا کہ "جب تک ان آنکھوں میں نیند نہیں میری آنکھوں کو نیند حرام ہے" بہر حال ہم دونوں بڑی دیر تک جاگتے رہے اور باتیں کرتے

جو اُس نے فرانس کی اسٹیٹس جنرل پر لکھی ہے کہتا ہے کہ "میں ساٹھ برس کا بڈھا قبر میں پاؤں لٹکائے موت کے انتظار میں بیٹھا ہوں لیکن اگر اپنے مرنے سے پہلے میں آزادی کی روح کو مسلط دیکھ لیتا تو میں اس دنیا سے خوش خوش جاتا"۔ انقلاب فرانس کی ایک حامی عورت مسمی شارلٹ کارڈے کی موت پر اس نے جو نوحہ لکھا ہے اس کی چند سطروں کا آزاد ترجمہ حسب ذیل ہے۔

"آج یہ کس کی قبر میرے سامنے ہے؟ ۔ یہ قبر راش فوگولڈ کی ہے ۔ اور اس نرم اور بھربھری مٹی کے نیچے ۔ کارڈے سو رہی ہے ۔ میں پھول توڑوں گا۔ اور اپنے ہاتھ سے تجھ پر چڑھاؤنگا ۔ کیونکہ تو نے

بقیہ صفحہ ۲۸ پر

کہتے جب اُس کے کمرہ کے دروازہ تک آئے تو خادمہ نے دروازہ کھولا اور شارلٹ نے اُس سے اپنے والد کی، بچوں کی، غرض سب کی خیریت دریافت کی۔ خادمہ نے کہا کہ سب بخیریت ہیں اور سو رہے ہیں۔

اس کے بعد میں اُسے چھوڑ کر دوسرے روز ملنے کا وعدہ کر کے چلا آیا۔ اس پر وہ راضی ہوگئی اور میں نے بھی اپنا وعدہ پورا کیا۔ آفتاب اور ماہتاب برابر اپنی منور کرنوں سے دنیا کو روشن کرتے ہیں مگر اُس گھڑی سے مجھے ان کی مطلق خبر نہیں ہوتی۔ یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ کب صبح ہوئی اور کب شام۔ آفتاب کب نکلا اور کب غروب ہوا۔ گویا ساری دنیا میری نظروں سے اوجھل ہوگئی ہے۔

۱۲ر جون

میری زندگی کمال مسرت کے ساتھ اِس طرح گزر رہی ہے جیسی کہ خدا اپنے خاص بندوں کو عطا کرتا ہے۔ بعد کو میری قسمت کی کوتاہیاں خواہ کچھ بھی ہوں لیکن مجھے یہ شکایت کرنے کا مطلق مجاز نہ ہوگا کہ میں صہبائے زندگی کے ایک جام دل افروز سے بھی لذت یاب نہیں ہوا۔

تم نے تو والہائم دیکھا ہے۔ میں اب مستقل طور پر یہیں مقیم ہوں۔ شارلٹ کا مکان یہاں سے قریب ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ جب میں وہاں جاتا ہوں تو انسانی زندگی کی تمام مسرتوں سے فیضیاب ہوتا ہوں۔ جب میں نے والہائم کو اپنی سیر و تفریح کا جولانگاہ تجویز کیا تھا تو مجھے کیا خبر تھی کہ جنت جیسی فضا و کیفیت اتنی نزدیک ہے اکثر لمبی لمبی سیریں کرتے کرتے میں نے اس شکارگاہ کے مکان کو کبھی پہاڑی پر سے اور کبھی میدان میں سے دیکھا ہے جو اب میری تمام آرزوؤں اور اُمیدوں کا آماجگہ ہے۔

میرے پیارے ولیلم۔ میں نے اکثر انسان کی اُن خواہشات پر غور کیا ہے جو اُسکو سیر و سفر

اپنے ملک پر اپنی جان قربان کردی"۔

اسی خیال کو ایک جگہ علامہ اقبال یوں ادا کرتے ہیں ؎

سر خاکِ شہیدے برگہائے لالہ می پاشم + کہ خونش با نہالِ ملت ما سازگار آمد

دنی چیزوں کے سراغ لگانے کی طرف لیجاتی ہیں اور پھر اُس کو اپنے پُرانے اور تنگ حلقہ کی طرف واپس بلاکر اور رسم و رواج کی زنجیروں میں جکڑ کر اپنے ماحول سے بیگانہ بنا دیتی ہیں میں اوّل اوّل جب یہاں آیا اور پہاڑی پر سے جب تمام وادی پر نظر ڈالی تو اُس منظر سے بہت متاثر ہوا۔ سامنے جو درختوں کا جھنڈ ہے اس کے سایہ میں بیٹھنا کتنا مسرت بخش ہے اور وہاں سے پہاڑی کی چٹانیں کتنی خوبصورت نظر آتی ہیں! پھر وہاں سے پہاڑیوں اور وادیوں کا وہ خوشگوار سلسلہ! میرے خیال میں اگر کوئی شخص سیر کرتا ہوا ان وادیوں میں گم ہو جائے تو اُس کو بجائے تکلیف کے آرام ہو گا۔ میں ان وادیوں میں چکر لگاتا ہوا آیا مگر جس کی تلاش میں نکلا تھا وہ نہیں ملی۔ میرے عزیز! فاصلہ کی مثال بالکل زمانہ مستقبل کی سی ہے۔ مگر ایک بات اور ہے یعنی ہماری روحوں پر مستقبل کی بے انتہا وسعت کا کچھ نہ کچھ دُھندلا سا عکس ضرور پڑتا ہے لیکن ہمارے فہم و ہوش پر مثل ہماری بصیرت کے بالکل تاریک پردہ پڑا ہوا ہے، تاہم ہماری یہی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی شے ہماری روحوں کو ابدی مسرت کا نغمہ چھیڑ کر بیدار کر دے خواہ اُس میں ہم کو اپنی ہستی ہی سے کیوں نہ ہاتھ دھونا پڑے۔ ہاں تو وہ شخص بھی جس میں سفر کا شوق بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے کبھی نہ کبھی گھر لوٹ کر ضرور آتا ہے اور تب وہ اپنے سادہ جھونپڑے میں، اپنی بیوی کی بغل میں، اپنے بچوں کی محبت میں اور محنت المعیات میں ان تمام خوشیوں اور مسرتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے جن کی تلاش میں وہ دنیا کے صحراؤں اور جنگلوں میں سرگرداں اور پریشان پھرتا رہا۔

صبح کے وقت جب آفتاب اپنی ہلکی ہلکی سنہری کرنوں سے نیند کے ماتوں کو جگاتا ہے تو میں والہائم کے باغ میں ہوتا ہوں اور اپنے کھانے کے لئے مٹر کی پھلیاں توڑ کر کسی درخت کے نیچے بیٹھ کر اس کو چھیلتا جاتا ہوں اور ساتھ ساتھ ہومر کا کلام بھی پڑھتا جاتا ہوں اور جب میں ان چھلی ہوئی پھلیوں کو پکانے کیلئے دیگچی کی تلاش کرتا ہوں، مکھن لاتا ہوں آگ جلاتا ہوں اور آگ کی دیکھ بھال کرتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پینی لوپی[۵] کے ممتاز عاشقوں

۵؎ یونان کے مشہور مگر غیر تاریخی سیاح اوڈیسیوس کی بیوی تھی۔ ہومر اپنی نظم اُوڈیسی میں اوڈیسیوس کے

میں میرا بھی شمار ہے جو اپنے ہاتھوں سے شکار کر کے خود اپنا کھانا تیار کرتے تھے۔ اس وقت دنیا کی قدیم زندگی کا وہ دور جس میں خاندان کے بڑے بوڑھے خاندان کے بادشاہ سمجھے جاتے تھے میری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ آج میں اپنی سادہ زندگی میں بلا کسی تصنع کے اس دورِ قدیم کی زندگی کی پیروی کر سکتا ہوں۔ یہ کتنی خوشی کی بات ہے کہ میرا دل اُن تمام معصومانہ کامیابیوں اور مسرتوں سے لبریز ہے جو ایک کسان کو اپنے دسترخوان پر اپنے ہاتھ سے اُگائے ہوئے پھلوں اور ترکاریوں کو دیکھ کر ہوتی ہے اور جو نہ صرف کھانے کے ذائقہ سے خوش ہوتا ہے بلکہ اُن دنوں کی خوش آیند صبح و شام کی یاد سے اپنے دل کو معمور پاتا ہے جب اُس نے بیج بویا اُس میں پانی دیا اور پھر پروان چڑھتے وقت اُس کی نگہبانی کرتا رہا۔

۲۹ر جون

پرسوں شہر سے جب ڈاکٹر صاحب جج صاحب سے ملنے آئے تو اُس وقت میں شارلٹ کے بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ بعض ایک دوسرے پر جھپٹتے اور کبھی اُچھلتے اور جب میں گدگداتا تو سب شور مچاتے۔ دیکھنے میں ڈاکٹر صاحب متین اور وضع کے پابند آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ بات چیت کرتے وقت اپنے کپڑوں کی شکن اور جھالر درست کرتے جاتے تھے۔ میرا بچوں کے ساتھ کھیلنا اُن کو سخت ناگوار ہوا یہاں تک کہ انھوں نے میرے اس فعل کو انسانیت سے خارج قرار دیا۔ میں اُن کے چہرہ کی کیفیت دیکھ کر ان کا انداز

سفروں کا ذکر کرتا ہے مشہور ہے کہ اوڈیسیوس بیس برس تک سیر و سفر میں مصروف رہا۔ اس عرصہ میں اُس کے شہر والوں نے یہ سمجھ کر کہ وہ مر گیا اس کی خوبصورت بیوی پینی لوپی کو شادی کا پیغام دینا شروع کیا اور جوں جوں دن زیادہ ہوتا جاتا تھا پیغام دینے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ پیغام دینے والوں میں شہر کے بڑے بڑے بہادر سپاہی تھے جو اپنی زندگی سیر و شکار میں بزمِ قدرت کا رکن بن کر گذارتے تھے۔ بالآخر پینی لوپی نے ان جھگڑوں سے تنگ آکر ایک ترکیب سوچی اُس نے ایک کپڑا بننا شروع کیا اور شرطیہ قرار دی کہ جب وہ کپڑا ختم ہو جائیگا تو وہ شادی کر لے گی مگر جو کپڑا وہ دن کو بنتی رات کو اُسے کھول ڈالتی جس سے اس کی شادی برابر ٹلتی رہی۔ بالآخر وہ دن آگیا جب اوڈیسیوس بخیر و خوبی گھر واپس آگیا اور پینی لوپی کو ہجوم عشاق سے نجات مل گئی۔

سمجھ گیا مگر بچوں کے ساتھ بدستور کھیلتا رہا اور اُن کی عاقلانہ گفتگو پر خاموشی اختیار کئے بچوں کی تاش کے پتوں کی عمارت جو گرتی جاتی تھی بناتا جاتا تھا۔ سنا ہے کہ جانے کے بعد انھوں نے لوگوں سے کہا کہ بچے تو اول ہی سے خراب تھے مگر اب ورتھر ان کو بالکل ستیاناس کر رہا ہے۔

میرے پیارے دوست۔ جب میں بچوں کے اُن اوصاف اور نیکیوں پر غور کرتا ہوں جو ایک دن بڑھ کر اُن کو آدمی بنا دیں گی تو اسوقت بچوں سے زیادہ میرا دل کسی چیز میں نہیں لگتا یا جب میں بچوں کی ضد میں اُن کی آیندہ سیرت کی استقامت، مضبوطی اور شرافت کی دھندلی تصویر دیکھتا ہوں یا ان کی تلون مزاجی کو دیکھتا ہوں جو ان کی آیندہ زندگی کے رنج وغم سے اُن کو بآسانی نکال لے جائے گی اور ساتھ ہی اُن کے سادگی اور بھولے پن پر غور کرتا ہوں تو مجھے اُس معلم انسانیت کا یہ زرین قول فوراً یاد آجاتا ہے کہ" اگر تم اُن کی طرح نہ ہوئے تو......"۔ ہاں تو یہ بچے جو کسی طرح ہم سے کم نہیں بلکہ ہمارے برابر ہیں ہمارے لئے نمونہ ہونے چاہئیں حالانکہ ہم اُن سے غلاموں کا سا برتاؤ کرتے ہیں اور اُن کی مرضی پر اُن کو اختیار نہیں دیتے۔ تو کیا اُس کے یہ معنی ہوئے کہ ہماری بھی کوئی مرضی نہیں! آخر اُن بچوں پر ہمارا یہ مالکانہ حق کہاں سے آیا؟ کیا ہم اُن پر اس لئے حکمرانی کرتے ہیں کہ ہم زیادہ معمر اور تجربہ کار ہیں۔ اے خدائے بزرگ و برتر! تو اپنے تخت جلال سے چھوٹے اور بڑے دونوں بچوں کو دیکھتا ہے۔ اور تیرے بیٹے نے مدت ہوئی دنیا کو بتادیا کہ تو کن سے خوش ہوتا ہے، آیا چھوٹے یا بڑے بچوں سے مگر یہ لوگ نہ تو اُن کو مانتے ہیں اور نہ اُن کا پیغام سنتے ہیں۔ مگر یہ بھی ایک قصۂ پارینہ ہو چکا ہے۔ لوگ اپنے بچوں کو بس اپنے ہی رنگ میں رنگتے ہیں۔ اچھا۔ دلہلم رخصت۔ میں اس مضمون پر اب زیادہ خامہ فرسائی نہ کرونگا۔

یکم جولائی

شارلٹ چند یوم کے لئے شہر میں ایک عورت کے یہاں عیادت کیلئے گئی ہے جو قریب المرگ ہے ڈاکٹروں نے اُس سے مایوس العلاج ہو کر جواب دیدیا ہے۔ اُس عورت کی خواہش

تھی کہ موت سے قبل اُس کی آنکھیں شارلٹ کے دیدار سے منور ہو جائیں۔ واقعی بیماروں کی تسلی تشفی کرنے میں جو ید طولیٰ شارلٹ کو حاصل ہے اُسکا تھوڑا سا اثر میرے دل پر بھی پڑتا ہے جو اُس کی جدائی سے بیقرار ہے یعنی میرے زخم دل کے لئے وہ تنہا مرہم ہے۔

پچھلے ہفتہ میں اس کے ساتھ قصبہ س کے پادری سے ملنے گیا تھا۔ قصبہ پہاڑیوں کے درمیاں یہاں سے تین میل پر واقع ہے۔ ہم لوگ چار بجے وہاں پہونچے۔ سب مل ملاکر ہم لوگ تین آدمی تھے یعنی شارلٹ کی چھوٹی بہن بھی ساتھ تھی۔ جب ہم لوگ پادری کے مکان کی چہار دیواری کے اندر پہونچے تو بڈھے پادری صاحب کو دیکھا کہ وہ اخروٹ کے دو درختوں کے نیچے بنچ پر بیٹھے ہیں۔ شارلٹ کو دیکھتے ہی پادری صاحب اپنا بڑھاپا اور ساتھ ہی اپنا عصا بھول گئے اور بڑی گرمجوشی سے استقبال کے لئے بڑھے۔ شارلٹ یہ دیکھ کر خود دوڑ پڑی اور جلدی سے پادری صاحب کے پاس پہنچ گئی اُن کو بٹھایا اور خود بھی اُن کے پاس بیٹھ گئی اور اپنے باپ کی طرف سے سلام اور کچھ پیغام کہا۔ پھر اُس پادری کے چھوٹے مگر بدصورت اور گندے بچوں کے ساتھ کھیلنے لگی جو اس بڑھاپے میں اُس کی آنکھوں کے نور اور دل کا سرور تھے۔ ولہلم! کاش تم شارلٹ کی اس توجہ کو دیکھتے جو اُس نے بڈھے پادری کے ساتھ برتی۔ اسکا اتنا خیال مدنظر تھا کہ کبھی اس کے بہرہ پن کی وجہ سے زور سے بولتی اور کبھی اُس کے اُن بچوں اور لڑکوں کا ذکر کرتی جن کے ابھی دنیا میں کھیلنے اور کودنے کے دن تھے مگر اجل کے بے رحم اور عالمگیر ہاتھوں نے اُن کو دنیائے جاودانی میں پہنچا دیا۔ پھر کارلسباڈ کے قدرتی اور مفید چشموں کا ذکر چھیڑ کر کہتی کہ ابکی گرمی میں وہاں جانے کا قصد رکھتی ہوں اور آخر میں اُس کی صحت کے متعلق راے زنی کرکے کہتی کہ ما شاء اللہ اب آپ کی صحت بہ نسبت پہلے کے بہتر ہے۔

شارلٹ اور پادری صاحب کی گفتگو کے دوران میں میں پادری صاحب کی نیک دل میم صاحبہ سے باتیں کرتا رہا۔ پادری صاحب بہت خوش و خرم نظر آتے تھے جب میں نے اُس کے اخروٹ کے درختوں کی خوبصورتی اور آرام دہ سایہ کی تعریف کی تو انھوں نے

درختوں کی تاریخ بتانی شروع کی اور کہنے لگے کہ "یہ تو نہیں معلوم کہ بڑے درخت کو کس نے لگایا ہے کوئی کہتا ہے کہ فلاں پادری نے لگایا ہے کوئی کہتا ہے دوسرے نے لگایا لیکن پیچھے والا چھوٹا درخت تو بالکل میری بیوی کا ہم عمر ہے اور آئندہ اکتوبر میں ٹھیک پچاس برس کا ہو جائے گا۔ میرے سسر نے صبح کو یہ درخت لگایا اور شام کو میری بیوی پیدا ہوئی۔ مجھ سے قبل میرا سسر یہاں رہتا تھا اور وہ ان درختوں کا بڑا شایق تھا۔ مجھے بھی ان سے کافی محبت ہوگئی ہے آج سے ستائیس برس قبل جب میں یہاں بطور طالبعلم آیا تھا تو اُس وقت اس درخت کے نیچے میں نے اپنی موجودہ بیوی کو ایک لٹھے پر بیٹھے کچھ کاڑھتے اور پھول بناتے دیکھا تھا"۔ اتنے میں شارلٹ نے پوچھا کہ آپ کی لڑکی کہاں ہے؟ پادری صاحب نے جواب دیا کہ مسٹر اسمتھ کے ساتھ میدان میں گھاس کا گٹھا بنتا دیکھنے گئی ہے۔

قصہ کو پھر سے شروع کر کے اُس نے وہ تمام باتیں بتائیں کہ کس طرح اس نے اپنے آیندہ خسر اور بیوی کی نظروں میں نیک نامی حاصل کی اور کس طرح وہ اوّل پادری کا نائب ہوا اور بعد کو اس کا جانشین۔ ابھی وہ اپنی حکایت ختم نہ کرپایا تھا کہ اس کی لڑکی مسٹر اسمتھ کے ساتھ باغ میں ہوتی ہوئی واپس آئی اور محبت اور پیار سے شارلٹ کو سلام کیا۔ مجھ پر اُس کی شکل وشباہت کا کافی اثر پڑا۔ اسکا چہرہ کچھ سانولا سا ہے۔ جسم کی ساخت بہت اچھی ہے۔ شوخ طبع اور خوش مذاق ایسی ہے کہ ایک آدمی گاؤں وغیرہ کی سیر و تفریح میں تھوڑے دنوں کے لئے اس کے ساتھ اپنا وقت نہایت عمدگی سے گذار سکتا ہے۔ اسکا عاشق جیسا کہ مسٹر اسمتھ معلوم ہوتے ہیں دیکھنے میں اچھا معلوم ہوتا ہے لیکن کم گوئی کا یہانتک پابند ہے کہ شارلٹ کی پیہم کوششوں کے باوجود اُس نے ہم لوگوں کی گفتگو میں کوئی حصّہ نہیں لیا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی تکلیف ہوئی اس لئے کہ مسٹر اسمتھ کی خاموشی کسی نالائقی کی بنا پر نہ تھی بلکہ ان کی طبیعت کی افتاد ہی کچھ ایسی بگڑی ہوئی تھی۔ جب ہم لوگ بعد کو ٹہلنے نکلے تو یہ راز آشکار ہوگیا۔ رستہ میں جب میں پادری صاحب کی لڑکی فریڈریکا کے ساتھ ہنس بول رہا تھا تو اُن کو میرا یہ فعل سخت ناگوار گذرا۔ یوں تو اُن کے چہرہ پر ہر وقت کوئی نہ کوئی فکر کے آثار ضرور رہتے ہیں مگر اس وقت تو صاف طور پر چیں بر جبیں نظر

آتے تھے۔ شارلٹ نے اُن کے تیور دیکھ کر میری آستین کھینچی اور مجھ سے کہا کہ "کیا حرکت کر رہے ہو اور فریڈریکا سے آخر کتنی باتیں کروگے"۔ جب میں لوگوں کو خاص کر جوانی کی بہار میں جو عیش و نشاط کا زمانہ ہے ایک دوسرے کو ایذا پہونچاتے دیکھتا ہوں یا اپنی مسرتوں کے چند دنوں کو بے کار جھگڑوں میں بے دردی سے ضایع کرتے اور اُن غلطیوں پر اس وقت پچھتاتے دیکھتا ہوں جب تدبیر کا دروازہ بند ہو چکتا ہے تو مجھے اس سے زیادہ شاید ہی کسی اور چیز سے صدمہ اور رنج ہوتا ہو۔ رستہ بھر یہی خیال میرے دماغ میں چکر لگاتا رہا اور ہم لوگ شام کو جب سیر سے لوٹ کر پادری کے مکان پر آئے اور میز کے کنارے کھانا کھانے بیٹھے تو ہماری گفتگو کا رخ بدل کر انسانی زندگی کے مصائب و آلام، انبساط و جشن پر آیا۔ اُس وقت پھر میں نے ہر ممکن طریقہ سے کج طبعی اور بدمزاجی کے خلاف جو کچھ مجھ سے ہو سکا کہا اور واضح کر دیا کہ ہم لوگوں کی عام عادت یہ ہے کہ ہم برابر اس امر کی شکایت کرتے رہتے ہیں کہ ہم لوگوں کی زندگی میں ہنسنے اور خوش ہونے کے دن بہت کم ہوتے ہیں حالانکہ ہماری مصیبت اور رنج کی گھڑیاں کاٹے نہیں کٹتیں لیکن اگر ہم اپنی طبیعتوں کو اس انداز پر ڈھال لیں کہ جب خدا کی طرف سے ہم پر کوئی رحمت نازل ہو تو اس کا شکر بھیجیں تو یقیناً مصیبت کے وقت بھی دل میں ایک ایسی طاقت پیدا ہو جائے گی جس سے دل کو بجائے کمزوری کے استقامت ہوگی۔ اس پر پادری صاحب کی بیوی نے کہا کہ "ہم اپنے مزاج پر ہمیشہ قدرت نہیں رکھ سکتے اس کا دارومدار ہماری تندرستی اور جسمانی حالت پر ہے۔ جب جسم صحت کی حالت میں نہیں ہے تو دماغ بھلا کیسے تندرست رہ سکتا ہے"۔ میں نے اس کو تسلیم کرتے ہوئے کہا کہ "بیشک اس قسم کی جسمانی حالت بیماری سے کم نہیں اور اس کے علاج کی ضرورت ہے"۔ شارلٹ یہ سُن کر بول اُٹھی کہ "اچھا پھر آپ ہی کوئی علاج بتائیے" اور پھر کہنے لگی کہ "میرے خیال میں اس کا دارومدار بہت کچھ اپنی ذات پر ہے۔ کم سے کم میرے ساتھ تو یہی معاملہ ہے مثلاً جب میری طبیعت خراب ہوتی ہے تو میں باغ میں جا کر گاتی ہوں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فوراً میری طبیعت رو بہ اصلاح ہو جاتی ہے"۔

میں نے کہا "بس بس بالکل یہی میرا مطلب ہے۔ بدمزاجی کی مثال کاہلی سے دی جا سکتی

ہے۔ کاہلی انسان کی فطرت میں داخل ہے لیکن اگر ایک دفعہ بھی ہم اپنی کاہلی پر غالب آجاتے ہیں تو ہم ہمیشہ مستعد اور خوش باش رہتے ہیں اور حرکت میں جس سے پہلے ہم بھاگتے تھے، خاص الطف ملنے لگتا ہے۔" فریڈریکا میری باتوں کو بڑے غور سے سن رہی تھی لیکن اس نوجوان نے اعتراض کیا کہ "ہم لوگ اپنی طبائع پر قادر نہیں ہیں اور اپنے جذبات پر تو ہم کو کسی طرح قابو مل ہی نہیں سکتا۔" میں نے اُس کو جواب دیا کہ "جناب یہ سوال خراب قسم کے جذبات کا ہے جس سے ہر شخص تو عہدہ برآ ہونا چاہتا ہے۔ مگر کسی کو بھی اس بات کی مطلق خبر نہیں کہ جذبات پر قابو پانے کے لئے ہمارے پاس کون سی طاقت ہے اور اُس کا کیا اثر ہے۔ بیماروں کو دیکھو کس سختی کے ساتھ ڈاکٹروں کی رائے پر صرف اس اُمید پر عمل کرتے ہیں اور کتنی کڑوی دوائیں حلق کے پار اُتار جاتے ہیں کہ اُن کو صحت ہو جائے گی۔" میں نے دوسری طرف پھر کر جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ بڈھا پادری میری باتوں کو بڑے شوق سے سن رہا تھا اس لئے میں نے اپنی آواز ذرا اور بلند کر دی اور اس سے یوں براہ راست مخاطب ہوا کہ "جناب گناہوں کے خلاف اب تک سیکڑوں وعظ بیان کئے جا چکے ہیں۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ آیا کسی نے آج تک بدتمیزی اور بدمزاجی کے خلاف بھی کوئی وعظ کہا ہے۔" اس پر پادری صاحب نے جواب دیا کہ "یہ مسئلہ ان لوگوں کی توجہ کا محتاج ہے جو شہروں میں وعظ کہتے ہیں۔ گاؤں کے دیہاتی بھلا کیا جانیں کہ بدتمیزی اور کج طبعی کیا چیز ہے لیکن اس کے متعلق اگر کبھی کبھی ذکر کر دیا جائے تو وہ میری بیوی، نوکر اور جج صاحب کے لئے مفید ہوگا۔" اس پر ہم سب ہنس پڑے اور پادری صاحب بھی اتنا ہنسے کہ اُن کو کھانسی آنے لگی جس سے ہماری گفتگو کچھ دیر کے لئے ملتوی ہو گئی۔

مسٹر اسمتھ نے پھر اس مضمون زیر بحث کو یوں شروع کیا کہ "آپ لوگوں نے اس بدمزاجی کو ایک جرم قرار دے رکھا ہے جو میری رائے میں نہایت سخت لفظ ہے۔" میں نے جواب دیا کہ "ہرگز نہیں! جو چیز ہمارے لئے اور دوسروں کے لئے مضر ہے وہ یقیناً اس قابل ہے کہ اسکو جرم کہا جائے۔ کیا آپ کے خیال میں یہ کافی نہیں کہ جب ہم میں ایک دوسرے کو خوش کرنے کی صلاحیت نہیں تو اس صورت میں کیا ہم اوروں کو بھی اس مسرت سے بے بہرہ کر دیں جس سے

ہم سب لطف اُٹھانے کی خواہش رکھتے ہیں کیا آپ مجھے کوئی ایسا تند مزاج آدمی بتا سکتے ہیں جو اپنے ہمسایوں کو تکلیف دیئے بغیر اپنی تمام بدمزاجی کا بار صرف اپنے ہی سر رکھتا ہو؟ نہیں کبھی نہیں بتا سکتے! بدمزاجی اور تند خوئی نتیجہ ہے اپنے احساس نالائقی اور بے ہنری کا اور صلہ ہے اپنی بیزاری اور تنگ دلی کا جو حماقت آمیز تکبر اور حسد سے پیدا ہوتی ہے۔ ہم کو لوگوں کی مسرت ایک آنکھ نہیں بھاتی تا آنکہ ان کی مسرت خود ہمارے ہی دست کرم سے نہ ملی ہو۔" شارلٹ نے میری طرف دیکھا اور میری گرمئ کلام اور حرارت تقریر کو سن کر مسکرائی لیکن فریڈریکا کی آنکھوں کو پرنم دیکھ کر میں نے اپنا سلسلۂ تقریر جاری رکھا اور اس طرح گویا ہوا "خدا اس بدبخت پر اپنا قہر نازل کرے جو اپنی تمام قوتوں کو صرف اس لئے استعمال کرتا ہے کہ دوسرے انسان قدرتی خوشیوں اور مسرتوں سے محروم رہیں۔ تمام دنیا کے احسانات اور برکات کبھی بھی ان خوشیوں اور مسرتوں کا معاوضہ نہیں ہو سکتے جن کو ایک ظالم ہاتھ فنا کر دیتا ہے"۔

میرا دل جوش و اثر سے لبریز تھا اور بہت سی پچھلی باتوں کے مٹے ہوئے نقوش دل میں تازہ ہو رہے تھے جس سے میری آنکھیں بھی پرنم ہو گئیں۔ اسی حالت میں میں بول اُٹھا کہ ہم کو روز اپنے دل میں ایسی بات کہنا چاہیئے کہ جس سے ہم دوستوں کی مسرت میں مخل نہ ہوں اور کم سے کم اتنا تو ضرور ہو کہ ان کی خوشیوں میں شریک ہو کر ان کو بڑھائیں لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے یعنی جب اُن کی روحوں میں جذبات نے بے قراری اور غم نے انتہا برپا کر رکھا ہو اور جب مصائب و آلام نے ان کے دلوں کو پارہ پارہ کر دیا ہو تو کیا آپ اسوقت اُن کے زخمی دلوں پر مرہم بھی نہیں لگا سکتے؟ اور جب کسی مہلک بیماری کا غلبہ ایسے شخص پر ہوتا ہے جس کی قبر آپ لوگوں نے اپنی حرکتوں سے قبل از وقت کھود دی ہے اور جب وہ اس نامرادی اور مایوسی کے عالم میں آپ کے سامنے پڑا ہوا اپنی بیمار اور کم بیں آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھتا ہے اور اُسوقت موت کا پسینہ اُس کے ماتھے پر نکل آیا ہو تو آپ سب لوگوں کی حالت اُس کے سامنے ایک مغضوب مجرم کی سی ہوتی ہے۔ آپ اپنے تمام ساز و سامان اور دولت و حشمت کے باوجود اُس کی جان نہیں بچا سکتے۔ شاید آپ اپنے گناہوں کا اُسوقت اقرار کرتے ہیں

جب توبہ کا دروازہ بند ہو چکا ہوتا ہے۔ آپ اس وقت اپنی بدبختی اور کم مائگی کا بڑے جوش وخروش کے ساتھ ماتم کرتے ہیں جب آپ کی ہر ممکن امداد، ہر ممکن کوشش، اُس مریض جاں بسمل اُس بسمل نیم جاں کے لئے ایک لمحہ ایک دقیقہ کا سکون بھی بہم نہیں پہنچا سکتی۔" ان الفاظ کے ادا کرتے وقت بالکل اسی قسم کا ایک منظر جہاں میں پہلے کبھی موجود تھا میری آنکھوں کے سامنے اپنی پوری سختی اور درد کے ساتھ دفعتاً پھرنے لگا۔ اس یاد سے متاثر ہو کر میں نے رومال نکال کر اپنی آنکھوں پر رکھا اور مجمع احباب سے فوراً الگ ہو گیا۔ شارلٹ نے میری یہ حالت دیکھ کر جو مجھ سے گھر جانے کو کہا تو میں اُس کی آواز پر چونک پڑا اور ہوش میں آیا۔ واپسی میں رستہ بھر بڑی نرمی اور محبت سے وہ مجھے سمجھاتی رہی اور کہنے لگی کہ "ہر چیز میں تمھاری پر جوش دلبستگی اور دلچسپی سے تمھاری زندگی پر بُرا اثر پڑے گا اور رشتہ حیات کوتاہ ہو جائے گا۔ آیندہ سے احتیاط لازم ہے۔" میں نے کہا کہ "ہاں اے میری روح! آیندہ سے میں اپنی صحت کی ضرور خبر گیری کروں گا اور زندگی بس تمھارے ہی لئے گذاروں گا۔"

---

۱۵ جولائی

شارلٹ اب تک اپنے قریب المرگ دوست کے ہمراہ ہے اور اب تک ویسی ہی حسین اور روح پرور ہے۔ اس کی ہر بات، ہر ادا دردمندوں کا علاج اور دکھے ہوئے دلوں کا مرہم ہے وہ جہاں کہیں ہوتی ہے وہاں مسرت اور شادمانی کے پھول جھڑتے ہیں۔

کل وہ اپنی چھوٹی بہنوں کے ساتھ باہر گئی تھی۔ مجھے خبر لگی تو میں بھی باہر نکل گیا اور اس سے ملاقات ہوئی۔ ہم لوگ بڑی دیر تک ساتھ ٹہلتے رہے۔ واپسی میں اپنے محبوب چشمہ کے کنارے ذرا دم لینے کے لئے رکے۔ شارلٹ اُس کی نیچی دیوار پر بیٹھ گئی اور ہم لوگ اُس کے گرد جمع ہو گئے۔ میں چاروں طرف دیکھ کر اُن گھڑیوں کو یاد کرنے لگا جو میں نے یہاں آزادی کے ساتھ کسی کی چشم فسوں ساز کا قتیل اور کسی کی زلف گرہ گیر کا شکار ہوئے بغیر گذاری تھیں[1]۔ اسی عالم خیال میں میں نے اُس چشمہ سے خطاب کر کے کہا کہ اے میرے محبوب چشمے! ایک زمانہ تھا

---

[1] بیابان محبت یاد می آرم زمانے را ٭ کہ دل عہد وفا نابستہ دام و لستانے را۔ غالب

کہ میں تیرے پاس آکر تیری ٹھنڈی ہواؤں کا لطف اٹھاتا اور تیری تازگی بخش لہروں سے دل بہلاتا تھا۔ لیکن اے میرے دلنواز چشمے اب مہینوں گذر جاتے ہیں اور مجھ کو ادھر سے گذرنا بھی پڑتا ہے مگر کیا بات ہے کہ تیرے دیدار سے آنکھیں محروم رہتی ہیں۔

میں نے اپنی نظر نیچی کی تو دیکھا کہ شارلٹ کی بہن جین سیڑھیوں پر سے پانی کا گلاس بھر کر لا رہی ہے۔ پھر میں شارلٹ کی طرف جو متوجہ ہوا تو معلوم ہوا کہ میرا دل بے اختیار اُس کی طرف کھنچا جا رہا ہے۔ اتنے میں جین آگئی اور میری بہن نے اُس سے گلاس لینا چاہا مگر جین نے کہا کہ ذرا ٹھہر جاؤ پہلے شارلٹ کو پی لینے دو۔ بچی کے اس محبت بھرے اور سادہ الفاظ نے مجھ پر اتنا اثر کیا کہ میں نے اُس کو گود میں لے کر خوب پیار کیا اس سے وہ بیچاری ڈر گئی اور رونے لگی۔ اس کے رونے پر شارلٹ بولی کہ اُسے رہنے دو اور نہ چھیڑو۔ یہ ایسی ہی رویا کرتی ہے اس فقرہ پر میں کچھ سراسیمہ ہوا پھر شارلٹ اُس کا ہاتھ پکڑ کر سیڑھیوں کے پاس لے گئی اور اُس کو تسلی دے کر کہنے لگی کہ "کوئی بات نہیں ہے۔ یہ پانی ہے منہ دھولو۔ جاؤ" میں کھڑا اون دونوں کی نقل و حرکت دیکھ رہا تھا اور جب میں نے بچی کو اپنے گالوں کو اپنے بھیگے ہاتھوں سے اس خیال میں کہ میری بدصورت ڈاڑھی سے جو گندگی لگ گئی ہے وہ دور ہو جائیگی خوب رگڑ رگڑ کر دھوتے دیکھا گویا زیادہ رگڑنا جیسا کہ شارلٹ کا بھی خیال ہے معمولی دھونے سے بہتر ہے تو واللہ اُسوقت مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں کسی بپتسمہ کی رسم میں نہایت مودبانہ طریقہ پر شریک ہوں۔ اور جب شارلٹ چشمہ کے پاس سے آئی تو میرے جی میں آیا کہ میں اُس کے قدموں پر اُسی طرح گر پڑوں جیسے اگلے زمانہ میں لوگ اپنے کو کسی مشرقی پیغمبر کے قدموں پر ڈال دیتے تھے۔

شام کو میں نے سارا قصہ ایک ایسے آدمی کے سامنے شروع سے آخر تک بیان کیا جو میرے خیال میں صاحب دل تھا کیونکہ وہ سمجھدار تھا۔ مگر میں نے بھی کیا غلطی کی! اس کے خیال میں تو شارلٹ نے سخت غلطی کی یعنی بچوں کو سمجھانے بجھانے کے لئے جھوٹ بات کبھی نہیں کہنا چاہیئے۔ اس لئے کہ اس قسم کی باتوں سے سیکڑوں طرح کی غلطیاں اور

وہم پرستیاں شروع ہوجاتی ہیں جن سے بچوں کو بچانا چاہیئے۔ اتفاق سے اُس وقت میں یہ خیال کرکے کہ ابھی ہفتہ بھر پہلے اس شخص کا بپتسمہ ہوا ہے خاموش ہوگیا تاہم اپنے دعویٰ کی صداقت پر اڑا رہا۔ ہم لوگوں کو بچوں کے ساتھ اس طرح پیش آنا چاہیئے جس طرح خدا ہم لوگوں پر رحم و کرم کی نگاہ رکھتا ہے۔ لیکن ذرا لطف تو دیکھو کہ ہم لوگ معصومانہ فریب کاریوں میں انتہا درجہ مسرور و شادماں ہوتے ہیں۔

۸ر جولائی

انسان بھی کیا بچوں کی طرح ہے کہ صرف ایک التفات نظر کے لئے اتنی آرزوئیں کرتا ہے! آدمی بھی کیا بچہ ہے! ہم سب لوگ والہائم گئے تھے مگر عورتیں گاڑی میں سوار تھیں۔ کچھ دور کے بعد عورتیں گاڑی سے نکل کر اور پا پیادہ ہوکر ٹہلنے لگیں۔ ٹہلتے وقت مجھ کو بار بار شارلٹ کی خوبصورت آنکھوں میں —— میں بیوقوف ہوں اسلئے مجھے معاف کرو! کاش تم ان آنکھوں کو دیکھتے۔ ہاں مختصراً۔ (مگر خود میری آنکھوں میں نیند بھری تھی)، تو جب عورتیں گاڑی میں دوبارہ سوار ہوگئیں تو میں اور نوجوان سلسٹاٹ اور انڈران کھڑکی کے پاس کھڑے ہوکر ان لوگوں سے باتیں کرنے لگے۔ دونوں نوجوان نہایت خوش و خرم معلوم ہوتے تھے۔ گفتگو کے درمیان میں برابر شارلٹ کی ایک نگاہ لطف کا اُمیدوار رہا مگر اُس کی نظر سوائے مجھ پر اور تمام طرف پڑتی تھی۔ اس حالت میں گویا میں بالکل بت بنا صرف اُس کی ایک نگاہ ناز کے شوق میں خواہ وہ غلط انداز ہی کیوں نہ ہو قربان ہوجانے کے لئے کھڑا تھا۔ میرا دل در پردہ اُس سے سیکڑوں بار رخصت ہو رہا تھا۔ مگر آہ! اسکی نظر کا گوشہ دامن التفات تک پہنچتا ہی نہ تھا آخر گاڑی روانہ ہوگئی اور میری نگہ انتظار سے آنسوؤں کے قطرے بے اختیار ٹپک پڑے بہر حال دل کو تسلی دینے کے لئے میں برابر اُس کی گاڑی کی طرف دیکھتا رہا۔ اتنے میں اُسنے کھڑکی کے باہر سر نکالا اور پیچھے مڑکر دیکھنے لگی۔ معلوم نہیں کہ آیا اُس نے میرے ہی خاطر سر نکالا تھا، مگر میرے دوست۔ خواہ کچھ ہی ہو اُس کی یہ بازنگاہی بھی میرے لئے باعث صد تسکین ہے اس لئے کہ میرا دل کہتا ہے کہ اُس نے مجھ ہی کو دیکھنے کے لئے سر نکالا تھا شاید!

اچھا اب رخصت ہوتا ہوں۔ میں بھی کیا بچہ ہوں!

۱۰ر جولائی

جب کسی مجمع میں لوگ میرے سامنے اُس کا ذکر کرتے ہیں یا اُس کے متعلق مجھ سے پوچھتے ہیں کہ وہ مجھے کیسی معلوم ہوتی ہے تو اُس وقت میری حالت بالکل کسی خبطی کی سی ہوتی ہے۔ "وہ مجھے کیسی معلوم ہوتی ہے" اس فقرہ سے تو مجھے ازلی نفرت پیدا ہوگئی ہے۔ خیال تو کرو کہ وہ آدمی بھلا کیسا ہوگا جس نے شارلٹ کو دل تو دے دیا ہو مگر اپنی حسیات کو اُس کے خیال سے آزاد رکھے۔ یاد رکھو اس منزل میں دل و دماغ دو علیحدہ چیزیں نہیں۔ "وہ مجھے کیسی معلوم ہوتی ہے" ابھی تھوڑے دن ہوئے کہ مجھ سے کسی نے پوچھا کہ اوسیان کے بارے میں آپکا کیا خیال ہے۔

۱۱ر جولائی

اہلیہ م بہت بیمار ہیں۔ میں ان کی صحت کے لئے دعا کرتا ہوں اس لئے کہ ان کی ہمدردی کرنے میں شارلٹ بھی میری ہمنوا ہے۔ میں اکثر شارلٹ کو اپنے دوست کے مکان پر دیکھا کرتا ہوں اور آج تو اُس نے مجھ سے ایک عجیب واقعہ بیان کیا۔ یعنی بڈھے م صاحب بہت لالچی اور بخیل ہیں اور اُنھوں نے مدتوں سے اس نیک بخت کو پریشان اور تنگ کر رکھا ہے لیکن انکی تمام حرکتوں کے باوجود وہ کبھی کوئی حرف شکایت زبان پر نہیں لائی۔ کچھ دن ہوئے جب ڈاکٹر نے اُس کی صحت کی طرف سے جواب دے دیا تو اُس نے اپنے شوہر کو بلوایا (شارلٹ بھی اُس وقت موجود تھی) اور کہا کہ آپ سے مجھے کچھ ایسی باتیں کہنی ہیں جس سے میرے انتقال کے بعد ممکن ہے کچھ جھگڑا پیدا ہو۔ آج تک میں آپ کے گھر کا حساب کتاب بڑی کفایت شعاری سے چلاتی تھی لیکن مجھے معاف کیجئے اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ میں نے آپ کو تیس برس تک دھوکا دیا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ متاہلانہ زندگی کی ابتدا میں باورچی خانہ اور دوسری خانگی ضرورتوں کے لئے آپ بہت معمولی رقم دیا کرتے تھے لیکن جب ہم لوگوں کا کاروبار بڑھا اور اُس کے ساتھ ساتھ ہمارا مال و اسباب اور ساز و سامان بھی بڑھا تو میں آپ کو اسی تناسب سے ہفتہ وار خرچ میں اضافہ پر راضی نہیں کر سکی۔ مختصر یہ کہ جب آپ کی ضرورتیں بہت ہوتی تھیں

تو آپ چاہتے تھے کہ صرف سات فلورنؔ ہی میں ہفتہ بھر کی تمام ضروریات پوری ہو جائیں۔ میں آپ سے اتنا خرچ تو بغیر کچھ کہے لے لیتی تھی مگر بعد کو روپیہ کے صندوق میں سے کمی پوری کرلیتی تھی اسواسطے کہ کسی کو خود آپ کی بیوی پر گھر کے بینک سے روپیہ چرانے کا شبہ بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ لیکن میں نے جو کچھ نکالا اُس میں سے کچھ ضائع نہیں کیا اور اپنے خدا کے حضور میں بغیر اس اقرار کے جانے پر رضا مند تھی اگر مجھے اس عورت کا خیال نہ ہوتا جسپر میری موت کے بعد گھر کا سارا بار پڑیگا اور جو آپ کے اس یقین دلانے پر پریشان ہوگی کہ آپ مجکو جو خرچ دیتے تھے وہ کافی تھا۔

میں شارلٹ سے بہت سے ایسے ناقابل فہم طریقوں کے بارے میں باتیں کرتا رہا جن سے آدمی خود اپنی آنکھ پر پٹی باندھ کر اپنے کو بالکل اندھا کرلیتا ہے بھلا بتاؤ کہ ایک آدمی کس طرح اور کہاں تک چشم پوشی کرے جب ۴½ فلورن کی جگہ سات فلورن خرچ کے لئے دے۔ لیکن میں خود ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو بغیر کسی تعجب کے اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ان کے گھر کا خزانہ کسی کرامت کی وجہ سے کبھی خالی نہیں ہوتا۔

۱۲ر جولائی

نہیں میں فریب خوردہ نہیں ہوں۔ مجھے اُس کی سیاہ اور پرکیف آنکھوں کی جنبش سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مخلصانہ طور پر میرا خیال رکھتی ہے اور میرا قلب بھی اس کو محسوس کرنے لگا ہے اور خواہ کچھ ہو میرا دل تو یہ کہتا ہے اور کیا تم سے کہدوں اور تم سے ان نورانی الفاظ کو دہرا دوں کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے ''وہ مجھ سے محبت کرتی ہے'' اس خیال سے خود مجھ کو کتنی لذت ملتی ہے۔ تم چونکہ میری طبیعت کے انداز سے واقف ہو اس لئے تم سے کہتا ہوں کہ جب سے اُس نے مجھ سے محبت کرنی شروع کی ہے میری عزت خود میری آنکھوں میں بہت بڑھ گئی ہے۔ مگر کیا یہ میری خام خیالی ہے یا واقعیت کا احساس؟ اب تک تو میں نے کوئی ایسا آدمی نہیں دیکھا جو شارلٹ کے دل سے میری محبت چھڑا دے لیکن باوجود اس کے جب وہ البرٹ کا ذکر جوش اور محبت کے ساتھ کرتی ہے تو اُسوقت میں ایک ایسے درباری کے مثل معلوم ہوتا ہوں جسکا اعزاز ورتبہ چھین گیا ہو یا پھر میری حالت اس سپاہی کی سی ہوتی ہے جسکی تلوار ضبط ہوگئی ہو

لہ۔ دو شلنگ کا ایک سکہ

۲۶ر جولائی

جب کبھی کھانا کھاتے وقت میز کے نیچے میری ٹانگیں اس کی ٹانگوں سے اتفاقیہ طور پر چھو جاتی ہیں یا میرا ہاتھ اس کے ہاتھ پر پڑ جاتا ہے تو میرے دل میں ایک خاص قسم کی سنسناہٹ معلوم ہوتی ہے اور ہوش و حواس بجا نہیں رہتے۔ اس وقت میں گھبراہٹ میں اپنے پاؤں اس طرح گھسیٹ لیتا ہوں جیسے کوئی آگ سے اپنے پاؤں ہٹائے مگر دل یہی چاہتا ہے کہ اُس کے پاؤں سے پاؤں ملا رہے تو اچھا ہے۔ ہائے اُس کے معصوم اور نادان دل کو کیا معلوم کہ اس کی یہ دوستانہ ادائیں میرے لئے عذاب جان ہو رہی ہیں۔ بعض وقت بات چیت کرتے کرتے جب وہ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیتی ہے اور گفتگو کی روانی کو قائم رکھنے کے لئے مجھ سے قریب تر ہو جاتی ہے جس سے اُس کے نازک اور گلاب ایسے جسم کی مہک میری ناک میں پہنچتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھ پر بجلی گر گئی ہے اور مجھ کو خاک میں ملا گئی ہے۔ لیکن ولہلم، باوجود ہر قسم کے اعتبار اور یقین کے جواس کو مجھ پر ہے اگر میں جسارت کر بیٹھوں! تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو گے۔ مگر نہیں، نہیں میرا دل گناہگار نہیں بلکہ کمزور ہے اور کافی کمزور ہے، اور کیا کمزوری گناہ کا ایک درجہ نہیں؟

اُس کی ہستی میرے لئے مقدس ہے۔ بہر حال میرے دل میں جو کچھ بے قراری پیدا ہوتی ہے وہ صرف اُس کے سامنے مگر حالت یہ ہے کہ میں اُسکی قربت میں ان حسیات کے اظہار سے بالکل عاجز ہوتا ہوں اسوقت گویا میری یہ کیفیت ہوتی ہے کہ میری روح میرے اعصاب جسمانی کے ہر تار سے اُلجھتی ہے۔ وہ پیانو پر ایک قسم کا راگ بڑے ہنر اور خوبی کے ساتھ بجاتی ہے۔ اس راگ کی لے بہت سادہ ہے مگر اس کی نازک اُنگلیوں میں خدا جانے کون سا اثر ہے کہ اس میں روحانی نغمہ بھر جاتا ہے۔ یہی راگ اس کو پسند بھی ہے اور جب وہ اس کو بجاتی ہے تو میرا دل ایک لمحہ میں گویا تمام کلفتوں اور آلائشوں سے دُھل کر پاک صاف ہو جاتا ہے۔ اس وقت میں قدیم زمانہ کے ساحرانہ نغموں کا یقین کرنے لگتا ہوں۔ معلوم نہیں اس کے نغمہ میں اس بلا کا سحر کہاں سے آیا اکثر ایسا ہوا ہے کہ میں خودکشی کے لئے تیار ہوا مگر اس کی ایک راگ سن کر دل کی تمام جلن دور ہو گئی اور پھر میں دوبارہ آزادی سے سانس لینے لگا۔

۱۸ر جولائی

پیارے ولہلم! خیال تو کرو کہ وہ دنیا جس میں محبوب کا غم اور عشق کا محن نہ ہو کیسی بے نور دنیا ہوگی۔[1] بھلا سوچو کہ میجک لالٹین میں اگر روشنی نہ ہو تو وہ کیسی تاریک معلوم ہوگی۔ یہ روشنی جو اس تیرہ خاکدان کو منور رکئے ہوئے ہے، عشق کی روشنی ہے۔ ہمارا تمھارا کام بس یہی ہے کہ اندر کی آگ روشن کر دیں پھر عمدہ اور چمکدار تصویریں خود بخود دیوار پر ظاہر ہوں گی اور اس حالت میں اگر بازیگر عشق ہم کو صرف ایک چلتا پھرتا سا عکس ہی دکھلا دے تب بھی ہم بچوں کی طرح اُس شاندار نمود حیات کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ آج مجھ سے شارلٹ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ میں اپنے چند احباب کے ساتھ مصروف رہا تاہم میں نے اپنا نوکر شارلٹ کے پاس بھیجدیا کہ کم سے کم میں اُس کو دیکھ لوں جس کو شارلٹ نے دیکھا ہے۔ جتنی دیر تک میرا نوکر باہر رہا مجھے بڑی تشویش و پریشانی رہی اور جب آگیا تو پھر مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ وہ نوکر ہے تو میں اُس سے لپٹ جاتا اور اُس کو خوب چومتا لوگ کہتے ہیں کہ بولونا کا پتھر اگر دھوپ میں رکھ دیا جائے تو آفتاب کی کرنوں کو جذب کر لیتا ہے اور اندھیرے میں تھوڑی دیر تک کرنوں کے اثر سے چمکتا ہے۔ بالکل یہی حال میرے نوکر کا اور میرا ہے صرف اس خیال سے کہ شارلٹ کی آنکھیں اس کے چہرہ پر، اُس کے گالوں پر، اور اُس کے کپڑوں پر پڑی ہیں اُس کی ہر چیز میری نگاہ میں یکایک اتنی محبوب ہوگئی کہ دنیا کی تمام چیزیں مجھ کو اس سے الگ نہیں کر سکتیں۔ اُس کی آمد اور موجودگی سے میں کتنا خوش ہوا! اچھا ولہلم۔ میری اس حرکت پر ہنسو مت۔ آخر تمھیں بتاؤ کہ کیا تم اس چیز کو جو دل کو فرحت بخشتی ہے اور مسرور کرتی ہے محض ایک نمود غبار سے تعبیر کروگے۔؟

۱۹ر جولائی

جب صبح کو میں سو کر اُٹھتا ہوں اور آفتاب کی نورانی اور عالم افروز کرنوں کو دیکھ کر خوش ہوتا ہوں تو اُس وقت میرے دل کے اندر یہ تمنا بھی بیدار ہوتی ہے کہ آج میں اس سے ضرور ملونگا۔

---

[1] نے ذوق نگاہے و نہ ہنگامۂ عشقے + اے وائے بشہرے کہ درو فتنہ گرے نیست

اور پھر میرے باغ اُمید میں کسی اور بہار کی ضرورت نہیں رہتی گویا تمام تمنائیں سمٹ کر اسی ایک محور پر آجاتی ہیں۔

۲۰ر جولائی

میں تمہارے اس مشورہ سے اتفاق نہیں کرتا کہ میں سفر کے ساتھ..... چلا جاؤں۔ میں محکومی بالکل پسند نہیں کرتا اور تم تو جانتے ہو کہ وہ دل کا کتنا نا ملائم ہے اور بُری طبیعت رکھتا ہے۔ تمہارا خیال ہے کہ میری والدہ صاحبہ مجھے کہیں برسرکار دیکھنا چاہتی ہیں۔ یقین مانو میں اس خیال پر بے اختیار ہنس پڑا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں برسرکار نہیں ہوں؟ اور کیا میری موجودہ مصروفیت عام کاروبار کی مصروفیت کی سی نہیں ہے؟ ارے بھائی مسور چھیلو تو چھیلنا ہوا اور مٹر کی پھلی چھیلو تو چھیلنا ہوا۔ دنیا کا قاعدہ ہے کہ وہ ایک حماقت سے دوسری حماقت کی طرف جاتی ہے اور خاص کر وہ شخص جو محض دوسروں کی خاطر بغیر اپنی مرضی یا ضرورت کے مال و دولت یا جاہ و منصب یا اسی قسم کے دوسری بے اصل چیزوں کی طرف دوڑتا ہے بڑا ہی بے وقوف اور بے عقل ہے۔

۲۴ر جولائی

تم مجھ سے مصوری میں مصروف رہنے کے لئے اصرار کرتے ہو۔ میں تم سے بتا ہی نہ دوں کہ میں نے اسطرف مصوری میں کچھ کیا ہی نہیں۔ سچ پوچھو تو میں اس طرف جیسا خوش و خرم تھا ویسا شاید ہی کبھی پہلے رہا ہوں گا اور اس سے قبل تو میں مناظر قدرت کی باریکیوں اور سبزہ کی تہ در تہ موشگافیوں سے یک قلم بیگانہ تھا لیکن اب علم کے باوجود میں اُن کے اظہار سے بالکل مجبور ہوں گویا میری گلکاری کی قوت سلب ہوگئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز میری نظر کے سامنے حرکت کر رہی ہے۔ اس لئے میں کسی چیز کا خاکہ تک نہیں پیش کرسکتا لیکن اگر میرے ہاتھ میں بجائے قلم کے موم یا مٹی ہوتی تو شاید میں اُس کی تشکیل تخیل کے مطابق بہتر صورت میں کرسکتا۔ اگر دماغ کی یہی کیفیت کچھ دیر تک اور قائم رہی تو میں کم سے کم گندھے ہوئے آٹے ہی سے شغل کروں گا۔

میں نے تین بار شارلٹ کی مومی تصویر بنانے کی کوشش کی مگر بُری طرح ناکام رہا مجھے اس سے اتنی تکلیف پہنچی ہے کہ بیان نہیں کرسکتا کیونکہ میں پہلے تمثال گری سے اچھا خاصا شوق رکھتا تھا۔ بہرحال اس کے بعد میں نے اُس کے رخ کی یکطرفہ مومی تصویر بنائی اور فی الحال اُسی پر قانع ہوں۔

۲۵ر جولائی

پیاری شارلٹ! میں ہر چیز کا انتظام کردوں گا بس تم مجھے سب چیزیں بتاتی جاؤ لیکن ایک بات تو ضرور کرو یعنی خط کو خشک کرنے کے لئے براے مہربانی اس پر بالو نہ ڈالا کرو اس لئے کہ آج جو جلدی میں میں نے تمہارا خط کھول کر لبوں سے لگایا تو دانت کرکرانے لگا۔

۲۶ر جولائی

میں اکثر تہیہ کرلیتا ہوں کہ شارلٹ سے جلد جلد نہ ملا کروں۔ مگر تم جانتے ہو کہ ایسا ارادہ بھلا کتنے دن چل سکتا ہے۔ شوق کی یہ حالت ہے کہ اُس کے پاس روز جاؤں مگر دل پہ جبر کرکے کہ میں کل ہرگز نہ جاؤں گا شوق کو ٹال دیتا ہوں لیکن جب کل آتا ہے تو خود بخود میرے دل میں اُس کے دیکھنے کا بے اختیار جذبہ پیدا ہوتا ہے اور قبل اس کے کہ میں اُس جذبہ پر کچھ غور کروں میں اپنے کو اُس کے آستانہ پر پاتا ہوں۔ یا تو وہ روز شام کو مجھ سے کہتی ہے کہ "تم تو کل ضرور ہی آؤ گے" اور پھر تمہیں بتاؤ کہ اس جملے کو سن کر کون گھر بیٹھا رہیگا یا پھر مجھ سے کوئی کام بتا دیتی ہے جس کی تعمیل کرکے اُس کے پاس جانا ضروری ہوجاتا ہے، یا پھر موسم اتنا اچھا ہوتا ہے کہ میں والہائم ٹہلتے ٹہلتے جاتا ہوں اور پھر وہاں سے اُسکا مکان صرف ۱½ میل رہ جاتا ہے۔ میں گویا ایک طلسمانہ زندگی بسر کر رہا ہوں اور روز کسی نہ کسی طرح اُس کے پاس پہنچ جاتا ہوں۔ میری دادی ایک مقناطیسی پہاڑ کی اکثر کہانی کہا کرتی تھیں کہ جب اُس کے نزدیک کوئی جہاز آتا تھا تو اس جہاز کا سارا لوہا نکل نکل کر اس پہاڑ سے بے تحاشا جا کر لپٹ جاتا اور [illegible]

۳۰ر جولائی

البرٹ یہاں آیا ہے اس لئے اب میں یہاں سے جاتا ہوں۔ اگر البرٹ دنیا کا بہترین اور شریف ترین انسان ہوتا اور میں ہر لحاظ سے اُس سے کمتر ہوتا تب بھی میں ایسی مکمل ہستی کو ہرگز اُس کے قبضہ میں دیکھنے پر راضی نہ ہوتا۔ قبضہ! خیر یہ تو بہت بڑی چیز ہے۔

البرٹ اس کا منگیتر ہے اور آجکل یہاں موجود ہے۔ وہ اتنا اچھا آدمی ہے کہ اس سے کسی کو بھی شکایت نہیں پیدا ہو سکتی۔ حُسنِ اتفاق سے جب یہ دونوں آپس میں ملے تو میں وہاں موجود نہ تھا۔ ورنہ جیسا کہ تم جانتے ہو میرے دل پر معلوم نہیں کیا کیا گذرتی۔ اور اس کے باوجود وہ میرا کتنا خیال رکھتا ہے کہ اُس نے میری موجودگی میں کبھی شارلٹ کا بوسہ نہیں لیا۔ خدا اُس کو اس کا اجر دے۔ جس عزت کا برتاؤ وہ شارلٹ کے ساتھ کرتا ہے اس سے تو میرے دل میں اُس کی خاصی محبت ہو گئی ہے۔ اکثر وہ میری طرف محبت آمیز التفات کرتا ہے لیکن میرے خیال میں یہ التفات بجائے میرے شارلٹ کی وجہ سے ہے۔ ان معاملات میں عورتیں زیادہ ہوشیار ہوتی ہیں اور ہونا بھی ایسا ہی چاہئے۔ وہ دو رقیبوں کو آپس میں ہمیشہ دوست نہیں رکھ سکتیں اور اگر ایسا کرتی ہیں تو فائدہ بھی اُنھیں کا ہوتا ہے۔ میں البرٹ کی قدر کرتا ہوں اُسکی طبیعت کا سکون میرے مزاج کی شورش سے جس کو میں کبھی نہیں چھپا سکتا، بالکل متضاد ہے۔ اس میں محبت کے جذبات کافی ہیں، اس کے علاوہ شارلٹ کی ہستی پر قابو پا کر اس کو اس نعمتِ غیر مترقبہ کا احساس بھی ہے۔ اس میں کسی قسم کی کج اخلاقی نہیں اور یہی کج اخلاقی ہے جس کو میں ہمیشہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ وہ مجھکو عقلمند سمجھتا ہے اور میرے اور شارلٹ کے درمیان جو کچھ مراسم ہیں یا مجھے اس سے جو کچھ دلچسپی ہے اُس سے البرٹ کے جذبۂ اُلفت میں اور بھی کامرانی ہوتی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ آیا وہ شارلٹ کو رقابت کے جوش میں کبھی چھیڑتا بھی ہے حالانکہ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو کبھی اس قسم کے خیالات و حرکات سے پاک نہ ہوتا۔

خواہ کچھ ہی ہو اب شارلٹ سے میرے تفریحی مراسم ختم ہو گئے۔ خواہ تم اسے حماقت کہو یا میرا والہانہ انداز یا تم اس کو کسی نام سے بھی پکارو جو ہے ظاہر ہے۔ البرٹ کی آمد سے قبل

مجھے ہر اس بات کا علم ہو گیا تھا جو مجھکو اب ہے۔ میں جانتا تھا کہ میں شارلٹ کے سامنے دعویٰ محبت نہیں کر سکتا تھا اور نہ میں نے کیا یعنی اُس حسن دلنواز سے بجائے لطف اُٹھانے کے اُس کو صرف دیکھنا، شیوہ عشق قرار دیا اور اب تو میں بالکل احمق کے مانند ہر چیز اچنبھے سے اس طرح دیکھتا ہوں جیسے کسی نے میری محبوبہ کو مجھ سے چھین کر جدا کر دیا ہو۔ میری حالت اب یہ ہو گئی ہے کہ ہر اُس شخص سے نفرت کرنے لگا ہوں جو مجھے صرف اس لئے توکل وقناعت کی تعلیم دیتا ہے کہ اب کوئی چارہ کار باقی نہیں ہے ایسی حیلہ بازی سے الگ ہی رہوں تو اچھا ہے اور اسی لئے میں اکثر پاس کے جنگلوں میں گھومنے پھرنے نکل جاتا ہوں اور واپس آکر جب کبھی شارلٹ کے پاس البرٹ کو باغ میں بیٹھا دیکھتا ہوں تو میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اسوقت میرا حال کسی خبطی کا سا ہوتا ہے جو سیکڑوں حماقتیں کرتا ہے اور آج تو شارلٹ نے مجھ سے کہہ بھی دیا کہ "تم خدا کے واسطے کل رات کا سا برتاؤ نہ کرنا اسواسطے کہ تمہارے ایسے تند اور خطرناک رویہ سے مجھے دھڑکا ہونے لگتا ہے" اچھا تم سے ایک بات کہتا ہوں یعنی جب البرٹ اُس کے پاس موجود ہوتا ہے تو میں باہر رہتا ہوں لیکن جب میں اُس کو تنہا پاتا ہوں تو خوش ہوتا ہوں۔

۸ اگست

میرے پیارے ولہلم! یقین مانو کہ پچھلی بار جب میں نے اُن لوگوں کے متعلق سخت لہجہ اختیار کیا تھا جو مجھے قسمت پر قانع رہنے کا مشورہ دیتے ہیں، تو میرا روئے سخن ہرگز تمہاری طرف نہیں تھا۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے لئے اس قسم کے خیالات کا اظہار نا ممکن ہے۔ بہرحال تمہارا خیال بالکل صحیح ہے مگر مجھے صرف ایک بات سے اختلاف ہے یعنی دنیا میں ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ایک شخص کو دو چیزوں میں انتخاب کا موقع ملے۔ لمبی ستواں اور چوڑی ناکوں کے درمیان جتنی قسم کی ناک ہوتی ہے بس سمجھو کہ اُتنے ہی قسم کے آرا اور افعال بھی ہوتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری دلیل ضرور قابل قبول ہے۔ مگر میں تمہاری چیستاں سے بچنے کی فکر میں ہوں۔ تمہارا یہی خیال ہے نا کہ یا میں شارلٹ کو حاصل کرنے کی اُمید رکھتا ہوں یا پھر کوئی اُمید

نہیں۔ پہلے طریقہ کے مطابق مجھے اپنے کام میں کوشش کرنا چاہیئے تا آنکہ مطلب حاصل نہ ہو جائے اور دوسرے طریقہ کے مطابق مجھے ایک انسان کی طرح زندگی بسر کرنا چاہیئے اور اس بدبخت جذبہ سے کسی طرح دامن چھڑانا چاہیئے جو مجھے بالکل کمزور کرکے برباد کردے گا میرے عزیز دوست! تمہاری یہ رائے بالکل صحیح ہے اور خوب ہے لیکن کیا تم ایسے بدنصیب شخص کو جو اپنی زندگی کے دن کسی گراں نشین علالت میں کاٹ رہا ہو یہ مشورہ دو گے کہ وہ بجائے گھل گھل کر مرنے کے ایک خنجر سے اپنا کام تمام کرلے؟ کیا تم نہیں دیکھتے کہ بیماری نے اُس مریض کی تمام طاقت اتنی سلب کرلی ہے کہ مرض سے رہائی حاصل کرنے کی ہمت بھی اُس میں نہیں رہی ہے؟ میرے خیال میں تم مجھے اسی قسم سے مشابہ کوئی جواب دو گے کہ" وہ کون ایسا شخص ہے جو اپنے بازو کٹوانے پر تیار نہ ہو جب کہ اسکو یہ معلوم ہو کہ دیر کرنے میں ساری زندگی کا خطرہ ہے"، لیکن مجھے نہیں معلوم کہ آیا میرا یہ خیال صحیح بھی ہے، بہتر تو یہی ہے کہ اس قسم کی تشبیہوں کو الگ کردیا جائے۔

بہت ہو چکا ولہلم۔ بعض وقت تو میں سوچتا ہوں کہ ان تمام جھگڑوں سے چھٹ کر آرزوے شوق سے بالکل ناآشنا ہو جاؤں۔ کاش مجھے کوئی ایسی جگہ معلوم ہوتی جہاں جا کر میں اطمینان سے رہتا۔

اُسی روز شام کو

میرا روزنامچہ جس کو میں نے کئی روز سے چھوڑ رکھا ہے آج میرے سامنے ہے۔ آہ! مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ میں نے کس طرح اپنے کو جان بوجھ کر بند میں جکڑ رکھا ہے۔ اپنی حالت کا صاف اندازہ معلوم ہونے کے باوجود افسوس! میں نے بالکل بچوں کی سی حرکت کی اور اسوقت بھی نتائج صاف نظر آرہے ہیں لیکن میرے دل میں اب بھی احتیاط کا ذرا خیال نہیں!

---

۱۰ اگست

اگر میں احمق نہ ہوتا تو میں اپنی زندگی کے دن یہاں نہایت آرام و مسرت سے گذارتا

ایک قابل آدمی کو آرام سے زندگی گذارنے کے لئے یہاں کے تمام حالات موافق ہیں حالانکہ حالات کی موافقت ایسی کم ہوتی ہے اور مجھے اس کا احساس بھی ہے مگر مسرت اور خوشی صرف دل سے پیدا ہوتی ہے۔ اس حسین اور خوبصورت خاندان میں داخل ہونا اور باپ کا مجھ سے اپنے بچہ کی طرح اور بچوں کا مجھ سے اپنے باپ کی طرح محبت کرنا اور پھر شارلٹ اور البرٹ کی محبت گاہ بننا کتنا مسرت انگیز ہے۔ اور البرٹ کتنا شریف آدمی ہے کہ وہ میری مسرتوں میں کسی قسم کی کج طبعی سے رخنہ نہیں پیدا کرتا اور نہایت محبت سے میری آؤ بھگت کرتا ہے اور شارلٹ کے بعد سب سے زیادہ مجھ ہی کو چاہتا ہے۔ ولہلم! شارلٹ کے متعلق البرٹ سے سیر کے وقت جو باتیں ہوتی ہیں انھیں سُن کر تم خوش ہوگے مگر تمہیں ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہوگا کہ میرے اور اُس کے تعلقات سے بڑھ کر دنیا میں شاید ہی کوئی بے تکی چیز ہو لیکن اس کے باوجود اکثر اس کے خیال سے میرے آنسو نکل آتے ہیں۔

البرٹ اکثر مجھ سے شارلٹ کی ماں کے حالات بیان کرتا ہے کہ کس طرح مرتے وقت اُس نے مکان اور بچوں کو شارلٹ کے سپرد کیا اور خود شارلٹ کو البرٹ کو سونپا۔ اُس کا بیان ہے کہ اس وقت سے شارلٹ میں ایک نئی روح پیدا ہوگئی ہے اور وہ بچوں کی نگرانی میں اپنا وقت ماں کی طرح صرف کرتی ہے۔ گھر کے اُن تمام جھگڑوں کے باوجود شارلٹ کی طبیعت میں وہی خوشی اور مسرت کا احساس باقی ہے۔ میں البرٹ کے ساتھ ٹہلتا ہوں اور راستہ میں پھول توڑ کر ایک عمدہ ہار بنا کر کسی چشمہ کی نذر کر دیتا ہوں اور پھر اُس کی آہستہ روانی کو دیکھتا ہوں۔ شاید میں تم سے یہ کہنا بھول گیا کہ اب البرٹ یہیں رہے گا اس لئے کہ اس کو ایک سرکاری نوکری مل گئی ہے۔ تنخواہ معقول ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ دربار میں اُس کا کافی رسوخ بھی ہے۔ میں نے ایسا پابند اوقات اور منتظم آدمی کم دیکھا ہوگا۔

---

۱۲ راگست

بیشک البرٹ دنیا میں بہترین شخص ہے۔ کل میرا اسکے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ میرے جی میں آیا کہ میں کچھ دن ان پہاڑوں میں بسر کروں جہاں سے میں تمہیں یہ خط

لکھ رہا ہوں اس خیال سے میں البرٹ سے رخصت ہونے گیا۔ جب میں اُس کے کمرہ میں داخل ہوکر ٹہل رہا تھا تو میری آنکھ اُس کے پستول پر پڑی۔ میں نے البرٹ سے کہا کہ "میں سفر پر جا رہا ہوں کیا آپ اپنا پستول کچھ دنوں کے لئے عنایت فرمائیں گے"۔ وہ فوراً راضی ہو گیا اور کہنے لگا کہ "یہ پستول خالی ہے صرف نمائش کے طور پر یہاں لٹکا ہوا ہے۔ بھر لیجئے اور لے جائیے"۔

میں نے ایک پستول اُتارا۔

اس پر وہ یوں بول اُٹھا کہ اپنی انتہائی احتیاط کی وجہ سے ایک دفعہ میں سخت آفت میں مبتلا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اسوقت سے میں ان چیزوں سے بالکل سروکار نہیں رکھتا۔ یہ سُن کر مجھے اسکا قصہ سننے کا شوق پیدا ہوا اور پھر اُس نے اپنا قصہ اسطرح شروع کیا کہ "قریب تین ماہ کے ہوتے ہیں کہ میں ایک گاؤں میں ایک دوست کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ اسوقت میرے پاس ایک پستول خالی تھا اور میں بے خرخشہ سو رہا تھا۔ ایک روز سہ پہر کو جب بارش ہو رہی تھی میرے دل میں بیٹھے بیٹھے نہ جانے کیوں خیال آیا کہ اگر اس مکان پر کوئی حملہ کر دے تو کیا ہوگا۔ پستول کی ضرورت اُسوقت ضرور پڑے گی۔ اور پھر یہ ہوگا یہ ہوگا۔ اس قسم کے خیالات دماغ کو مکان کے حملہ کے متعلق بڑی دیر تک پریشان کرتے رہے۔ اتنے میں میں نے اپنے نوکر کو پستول صاف کرنے اور بھرنے کو دیا۔ نوکر پستول لے کر صاف واف کر کے مکان کی خادمہ سے چہلیں کرنے لگا اور اس کو پستول سے ڈرانے لگا کہ اتنے میں نہ جانے کیسے پستول چھوٹ گیا۔ گھوڑا ابھرا ہوا تھا اور گولی اسطرح چھوٹی کہ اس خادمہ کے داہنے ہاتھ کو توڑ کر نکلی اور اُس کے انگوٹھے کو زخمی کر گئی۔ اس خادمہ کی آہ وزاری اور ڈاکٹر کا سارا خرچ مجھ ہی کو برداشت کرنا پڑا۔ بس اسوقت سے میں اپنا تمام ہتھیار خالی رکھتا ہوں۔ لیکن میرے دوست! آخر اس احتیاط سے فائدہ۔ قدرت کے تمام احتمالات اور امکانی خطرات سے بچنا ناممکن ہے بہر حال ———" ولہلم تم جانتے ہو کہ میں لوگوں کو بس اُسی وقت تک برداشت کر سکتا ہوں جب تک کہ وہ "بہر حال" تک نہیں پہونچتے۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ ہر عالمگیر قانون میں

مستثنیات کا جزو ضروری ہے۔ لیکن وہ اتنا راست گو ہے کہ جب اس کو خیال گذرتا ہے کہ وہ کوئی ایسا لفظ جلدی میں غلط سلط کہہ گیا ہے جس سے عام حالت کا اندازہ ہوتا ہو تو وہ فوراً اُس کو مشروط اور معتدل کر دیتا ہے یا اُس کے اثر کو کم کرنے کے لئے کوئی دوسرا لفظ کہہ دیتا ہے یہانتک کہ آخر میں اُس کی باتوں سے کوئی مطلب ہی نہیں نکلتا۔ اس موقعہ پر البرٹ اپنے مضمون میں اتنا منہمک تھا کہ میں اُس کی بعض باتوں کو بالکل سُن نہ سکا اور بالآخر میں بھی اپنے خیالات کی رو میں گم ہوگیا۔ بعد ازاں جھٹکے کے ساتھ میں نے پستول کی نلی اپنی داہنی آنکھ کے اوپر ماتھے پر رکھی۔ البرٹ یہ دیکھ کر چیخ پڑا۔ اور پستول کی طرف بڑھکر کہنے لگا کہ ارے یہ کیا کرتے ہیں۔

میں نے جواب دیا "بھرا نہیں ہے"

اُس نے پھر بیتابانہ لہجہ میں کہا کہ "اگر بھرا نہیں ہے تو پھر ایسا کرنے سے فائدہ؟ کوئی پاگل ہی ہوگا جو اپنے کو پستول سے مارے گا۔ مجھے تو پستول کے خیال سے تکلیف ہوتی ہے"

میں۔ "کسی فعل پر محض خارجی حیثیت سے رائے زنی کرنا اور اُس کو اچھا اور بُرا یا عاقلانہ اور مجنونانہ ٹھہرانا کہاں تک صحیح ہے؟ آخر اس کے کیا معنی؟ کیا آپ نے کبھی لوگوں کے افعال کے پوشیدہ منشاء کا بھی جائزہ لیا ہے؟ کیا آپ ان اسباب و علل کو سمجھتے ہیں یا سمجھا سکتے ہیں جن سے افعال لازمی طور پر سرزد ہوتے ہیں؟ اگر آپ سمجھ سکتے ہیں تو یقیناً آپ اپنے فیصلہ میں تحمل و بردباری سے کام لیں گے۔"

البرٹ۔ "لیکن اتنا تو آپ بھی تسلیم کریں گے کہ چند افعال خواہ ان کا منشاء کچھ بھی ہو مجرمانہ ہوتے ہیں۔"

میں نے اس کے اس قول کو کندھوں کی جھرجھری کے ساتھ مان لیا۔

میں۔ "مگر میرے عزیز دوست! اس میں بھی چند مستثنیات ہوتے ہیں۔ چوری جرم ہے لیکن کیا وہ شخص سزا کا یا رحم کا مستوجب ہے جو اپنے بال بچوں کو فاقہ کشی اور غربت کی مصیبت سے بچانے کے لئے چوری کرتا ہے؟ کسی کا دل گردہ ہے جو کسی ایسے شوہر کو سنگسار کرنے کیلئے

پہلا پتھر پھینکے جو جائز غم و غصہ کی حالت میں اپنی بے وفا بیوی اور اس کے دغاباز عاشق کو نذر اجل کر چکا ہو، یا پھر اُس کمسن لڑکی کو سنگسار کرے جو اپنے کمزور دل کے ہاتھوں عشق کی بے قراریوں سے مغلوب ہو کر دفعتاً اپنی عصمت کو گلدستۂ طاق نسیاں کر چکی ہو ہمارے قوانین کتنے بھی بے رحم اور ناترس سہی مگر اس قسم کے معاملات میں اُن کو بھی رحم آجاتا ہے اور مجرم اپنی سزا سے بچ جاتا ہے۔

البرٹ۔ "مگر یہ بالکل دوسری چیز ہے اس لئے کہ غم و غصہ کی شدید حالت میں انسان غور و فکر کی تمام حالتوں سے گذر جاتا ہے اور اُس کی کیفیت ایک مخمور و مدہوش اور لایعقل کی سی ہوتی ہے۔"

میں۔ "(مسکرا کر) تو اچھا آپ لوگ جن کو درستی عقل و ثبات ہوش کا دعویٰ ہے شاید اس کو جنون، نشہ یا اسراف سے تعبیر کریں۔ آپ کے ایسے نیک لوگ خاموش اور متین رہتے ہیں۔ آپ مخموروں سے نفرت کرتے ہیں اور مسرفوں سے دور رہتے ہیں اور ان کے قریب سے دنیاداروں کی طرح صاف گذر جاتے ہیں اور منافقوں کی طرح خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ آپ اُن لوگوں میں سے نہیں ہیں۔ میں خود کئی بار مدہوش ہو چکا ہوں اور میرے جذبات اکثر مسرفانہ حد تک پہونچ چکے ہیں مگر میں ان کے اقرار سے بالکل متاسف نہیں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنے اعمال سے کچھ نہ کچھ تجربہ حاصل کیا ہے۔ دنیا میں جتنی عظیم الشان ہستیاں گذری ہیں اور جنہوں نے دنیا میں کارہائے نمایاں کئے ہیں وہ ہمیشہ مدہوشانہ اور مجنونانہ القاب سے یاد کی گئیں ہیں۔ اور اسی طرح نجی کی زندگی میں بھی کسی شخص نے کوئی بڑا کام بغیر جنون اور نشہ کے خطاب سے ملقب ہو کر نہیں کیا۔ پھر اے عقل کے پتلو! تم پر اُف ہے۔"

البرٹ۔ "یہ گویا آپ کے مسرفانہ مزاج کا دوسرا رخ ہے۔ آپ ہمیشہ ایک واقعہ میں مبالغہ کا رنگ بھرتے ہیں اور اُسی میں آپ ہمیشہ غلطی کرتے ہیں اس لئے کہ ہم لوگ ذکر کر رہے تھے خودکشی کا اور آپ نے ذکر چھیڑ دیا بڑے بڑے کارناموں کا حالانکہ خودکشی

کو سوائے ایک کمزوری کے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ مرنا بڑا آسان ہے مگر زندگی کی تمام صعوبتوں اور تکلیفوں کا کمال جوانمردی سے مقابلہ کرنا بڑا مشکل ہے"۔

میں اس گفتگو کو ختم کرنے ہی والا تھا اسلئے کہ مجھے اس قسم کی پوچ اور لچر گفتگو سے زیادہ شاید ہی کوئی چیز تکلیف دہ معلوم ہوتی ہے درآنحالیکہ میں اسوقت اپنے دل کی گہرائی اور خلوص سے باتیں کر رہا تھا۔ اس قسم کے مباحثہ سے اکثر میرے دل کو تکلیف ہوتی ہے اسلئے میں نے اپنے کو سنبھال کر ذرا جوش سے جواب دیا کہ "آپ اس کو کمزوری سے تعبیر کرتے ہیں لیکن آپ بھی اپنے کو ذرا صورت اور سراب کی گرفت سے بچائیے۔ دیکھئے ایک قوم جب مدتوں تک کسی ظالم کی سفاکیوں کا شکار رہ کر ابھرتی ہے اور اپنی گردن سے طوق غلامی کو نکال کر پھینک دیتی ہے تو کیا آپ اس کو بھی کمزوری کہیں گے؟ ایک شخص کے گھر میں آگ لگی ہے آگ کی لپیٹ اور شعلوں کی لپک سے اپنے مکان کو بچانے کے لئے اس میں طاقت کا اتنا جوش آجاتا ہے کہ وہ بھاری سے بھاری بوجھ بڑی آسانی سے اٹھا لیتا ہے۔ حالانکہ یہی بوجھ اس حالت سے قبل لائق التفات بھی نہ تھا اسی طرح ایک اور آدمی کی مثال لیجئے جو اپنی توہین کے انفعالی غصہ سے بہادری کے وہ جوہر دکھاتا ہے کہ ایک نہیں بلکہ چھ چھ آدمیوں کو بھگا دیتا ہے تو کیا یہ لوگ بھی کمزور ہیں؟ میرے نیک دوست اگر مقاومت ہی طاقت کا نام ہے تو پھر اعلیٰ درجہ کی مقاومت کمزوری کیسے ہو جائے گی؟"

اس پر البرٹ نے نظر جما کر میری طرف دیکھا اور کہنے لگا کہ "آپ نے جو مثالیں پیش کی ہیں معاف کیجئے۔ ان کا نفس مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں"۔

میں۔ "ممکن ہے آپ کا خیال صحیح ہو اس لئے کہ اکثر لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ میری تمثیل کا طریقہ ایک حد تک بے معنی ہوتا ہے۔ لیکن کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم لوگ اس مسئلہ کی تحقیق کا رخ دوسری طرف پھیر دیں اور اس طرح دریافت کریں کہ اس شخص کی دماغی حالت کیسی ہوتی ہے جو اپنے کو زندگی کے آلام سے جو اکثر بڑے خوش آیند

معلوم ہوتے ہیں، نجات دلانے کا تہیہ کر چکا ہو۔ اس لئے کہ ہم لوگ اس مسئلہ پر کافی طور سے منطقیانہ بحث نہیں کر سکتے۔

"اچھا سنئے۔ انسانی فطرت کی ایک حد ہوتی ہے اور ایک درجہ تک یہ حد مسرت، درد اور الم کو برداشت کر سکتی ہے لیکن جہاں اس حد سے تجاوز کیا گیا فطرت فوراً جواب دے دیتی ہے لہذا سوال یہ نہیں ہے کہ ایک شخص آیا مضبوط ہے یا کمزور بلکہ یہ کہ وہ اپنی حد کے اندر تمام تکالیف خاطر خواہ برداشت کر سکتا ہے یا نہیں؟ اور ان تکالیف کی دو صورتیں ہوتی ہیں جسمانی اور روحانی اس لئے میرے خیال میں اس شخص کو بزدل کہنا جو خودکشی کرتا ہے اتنا ہی بے معنی اور بیہودہ ہوگا جتنا اُس شخص کو بزدل کہنا جو کسی مہلک بخار میں مبتلا ہو کر جان سے گذر جاتا ہے"

البرٹ۔ "یوں ممکن ہے صحیح ہو مگر یہ بات دیکھنے میں تو بالکل خلاف عقل معلوم ہوتی ہے"

میں۔ "نہیں یہ بات بالکل خلاف عقل نہیں ہے جیسی کہ آپ کو معلوم ہوتی ہے۔ اتنا تو آپ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ جب بدن پر کسی بیماری کا اتنا شدید حملہ ہوتا ہے کہ طاقت گھٹنے لگتی ہے اور فطرت اس کو کسی صورت سے بھی درست نہیں کر سکتی تو ہم لوگ اس بیماری کو مہلک کہتے ہیں اچھا ذرا اس مسئلہ کو آپ دماغ سے تشبیہ دیجئے۔ اگر آپ کسی آدمی کا اس کی فطری مگر تنہا حالت میں مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ خیالات کا اثر کس طرح ہوتا ہے اور تاثرات کس طور پر اپنا قدم جماتے ہیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جوش اور جذبہ اُس کی قوت فکریہ کو کس طرح مختل کر کے اُس کو بربادی اور تباہی کی شہ دیتا ہے۔ ایک صحیح الدماغ آدمی کے لئے ناممکن ہے کہ وہ اس قسم کے لوگوں کی دماغی کیفیت کا حال معلوم کرے اور مشورہ دینا تو اور لاحاصل ہے۔ وہ اپنی عاقلانہ باتوں کو اسے سمجھا بھی نہیں سکتا ٹھیک اسی طرح جیسے کوئی تندرست آدمی کسی بیمار کے پاس رہ کر اپنی طاقت اُس کو نہیں دے سکتا"

البرٹ نے اس گفتگو کو بالکل عامیانہ رنگ میں لیا۔ میں نے بہرحال اُس سے ایک لڑکی کا قصہ بیان کیا جس نے حال میں ڈوب کر جان دی تھی۔ وہ ایک نیک لڑکی تھی جو خانہ داری کے کاموں میں محنت کرتے کرتے بڑھی تھی۔ وہ دنیا کے تمام عیش و عشرت سے بیگانہ تھی البتہ

وہ ہر اتوار کو اپنے حسب حیثیت عمدہ سے عمدہ کپڑے پہن کر اپنے دوست احباب کے ساتھ سیر کو نکلتی یا کبھی کسی تقریب کے موقعہ پر کسی رقص میں شرکت کرتی اور اپنے فرصت کے اوقات اپنے ہمسایوں میں گانوں کے لوگوں کی اچھائیوں اور بُرائیوں پر باتیں کر کے گذار دیتی یہ تمام چیزیں معمولی تھیں مگر ان سے اُس کی کافی دلبستگی رہتی۔ آخر کار اس کی آتش فطرت کو چند نامعلوم اور مبہم خواہشوں نے تیل چھڑک کر بھڑکا دیا۔ لوگوں کی عاشقانہ خوشامدوں نے مندرجہ بالا چیزوں سے اُس کی دلبستگی میں رفتہ رفتہ اضمحلال پیدا کر دیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ ایک نوجوان سے ملی اور اس سے ایک ناقابل اظہار جذبہ کے ماتحت محبت کرنے لگی اور آج وہ اسکی تمام آرزؤں اور اُمیدوں کا مرکز ہے۔ محبت کا یہ اثر ہوا کہ وہ اپنے تمام ماحول سے یکقلم بیگانہ ہوگئی اور اب اُسی کی آنکھوں سے دیکھتی ہے اور اُسی کے کانوں سے سنتی ہے اور ہر وقت اُسی کی طلب میں رہتی ہے۔ وہی اُس کے خیالات کا ملجا و ماویٰ ہے مگر اسکا ذہن اب تک ناتواں اور کمزور کر دینے والے خودنمائی کے سست خیالات سے پاک ہے اور اُسکی محبت کا قدم استقامت کے ساتھ برابر اپنے محبوب کی طرف بڑھ رہا ہے اُس کے دماغ میں بس اُسی کی ہو رہنے کا سودا ہے اور اُس کے دائمی وصال میں وہ اپنی تمام مسرتوں اور خوشیوں کی جستجو کرتی ہے۔ اس عاشق کے وعدوں سے اُسکے باغ اُمید میں بہار آجاتی ہے اور اُس کی محبت اور معانقہ کی گرمجوشی سے اُس کی روح بیخود ہو جاتی ہے۔ اُسوقت وہ گویا اپنی آنے والی مگر پر فریب خوشیوں کی ایک دھندلی سی تصویر دیکھتی ہے اور اس کیفیت کے اثر سے اُس کے جذبات میں انتہا درجہ کا تلاطم برپا ہوتا ہے۔ اس بیخودی اور بیقراری کی حالت میں وہ اپنے دونوں ہاتھ اپنے محبوب کی گردن میں ڈالنے کے لئے بڑھاتی ہے مگر اس کا عاشق اُس سے دفعتاً کنارہ کشی اختیار کر لیتا ہے۔ اس پریشانی اور از خود رفتگی کے عالم میں اُس کی حالت بالکل اُس شخص کے مانند ہوتی ہے جو کسی اونچی چٹان کے کنارے تاریک فضا میں جبکہ اُمید و تسلی کی ذراسی جھلک بھی بالکل مفقود ہو، گرنے کے لئے تیار کھڑا ہو۔ افسوس! آج اُس نوجوان نے اُس سے علیحدگی اختیار کی جو اب تک اُس کی زندگی کی سانس تھا۔ آج اتنی بڑی اور وسیع

دنیا اُس کی آنکھوں کے سامنے بے نور ہوگئی اور ایسے نفوس سے خالی ہوگئی جو اُس کے لئے باعث دلبستگی ہوتے افسوس! اسکا کوئی پرسان حال نہیں۔ آج دنیا اس سے بھاگتی ہے۔ روح کے اس بیتاب اور بے قرار کر دینے والے دردو محن سے مغلوب ہوکر وہ اپنے کو پہاڑ کی چوٹی سے نیچے دریا کی گہرائی میں گرا دیتی ہے تاکہ موت کی آغوش میں اُسکی تکلیفوں کا خاتمہ ہو جائے۔ البرٹ صاحب ذرا سنئے اور غور کیجئے۔ یہی حال ایک کا نہیں بلکہ سیکڑوں ہزاروں کا ہے۔ ذرا مجھ سے کہئے کہ کیا یہ واقعہ جسمانی ناتوانی سے تعلق نہیں رکھتا؟ ظلم تو یہ ہے کہ اس بھول بھلیاں سے نکلنے کے لئے فطرت نے بھی کوئی راستہ نہیں بتایا اور جب اس غریب کی تمام قوتیں جواب دے چکیں تو اُس کے لئے سوائے موت کے اور چارہ ہی کیا تھا؟

"میرے خیال میں تو اُس شخص پر تف ہے جو اس واقعہ کو سکون اور خاموشی سے سنکر کہے کہ کتنی بیوقوف لڑکی تھی جو مر گئی۔ ذرا اور ٹھہر جاتی کہ کچھ وقت گذرنے کے بعد اس کے اثرات کم ہو جاتے اور اُس کی نا اُمیدی کی سختی کچھ نرم پڑ جاتی۔ بہت ممکن تھا کہ اس کو کوئی دوسرا عاشق مل جاتا جس سے اُس کی خاطر خواہ تسلی ہو جاتی۔ اسی طرح ایک بخار کے بیمار کے لئے کہا جا سکتا ہے کہ کتنا بیوقوف تھا جو مر گیا۔ ذرا ٹھہر جاتا کہ تھوڑی سی طاقت آجاتی اور خون کی گرمی ذرا کم ہو جاتی تب وہ بچ جاتا اور اچھا ہو جاتا۔"

البرٹ اس موازنہ کی حقانیت سے برابر اختلاف کرتا رہا اور اُس نے دوسرے اعتراضات بھی پیش کئے۔ منجملہ ان کے کہنے لگا کہ آپ نے ایک معصوم لڑکی کا جو واقعہ مثال میں پیش کیا ہے وہ یہاں بالکل درست نہیں۔

لیکن ولہلم تمھیں بتاؤ کہ ایک تجربہ کار اور عقلمند آدمی ان دلائل سے کس طرح جان بچا سکتا ہے۔ مگر یہ البرٹ کے سمجھ میں آتا ہی نہ تھا۔ پھر میں نے اُس سے کہا کہ "میرے دوست آدمی آخر آدمی ہے اور اُس کے عقل کی پرواز خواہ کتنی بلند کیوں نہ ہو لیکن جب جنون کا جوش ہوتا ہے تو ساری عقل دھری کی دھری رہ جاتی ہے اور آدمی اپنے کو اس وقت فطرت کے تنگ دائرہ میں محدود پاتا ہے۔ اُس وقت کیا اچھا ہوتا ـــــ لیکن ذرا ٹھہرئیے۔ ہم لوگ اسکے متعلق

پھر گفتگو کریں گے"

یہ کہہ کر میں نے اپنے ٹوپی اُٹھائی اور چلا آیا حالانکہ میرا دل اسوقت اثر میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہم لوگ بغیر ایک دوسرے کو قائل کئے ہوئے جدا ہو گئے افسوس! اس دنیا میں ایک آدمی دوسرے آدمی کو کتنا کم سمجھتا ہے۔

---

۱۵ راگست

اس میں کوئی کلام نہیں کہ دنیا میں عشق سے زیادہ ضروری اور کوئی چیز نہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ شارلٹ میری جدائی بغیر آہ سرد کے گوارا نہیں کرتی اور بچوں کی بھی یہی خواہش ہے کہ میں اُن سے کل پھر ملوں۔ آج سہ پہر کو میں شارلٹ کا پیانو درست کرنے گیا تھا مگر نہ کرسکا اس لئے کہ بچے اس پر مصر ہو گئے کہ میں اُن کو کوئی قصہ سناؤں اور شارلٹ نے بھی آخر ان بچوں کی خاطر سے قصہ ہی کی منظوری دیدی۔ میں نے ان بچوں کے ساتھ چائے پی اور وہ مجھ سے ایسے ہی مالوس ہیں جیسے شارلٹ سے۔ مجھے جو بہترین قصہ یاد تھا وہ میں نے سنایا جس میں ایک رانی کے کئی بونے نوکر تھے۔ اس قسم کے قصوں سے میں گویا اپنی مشق بڑھاتا ہوں۔ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ میرے قصے کس طرح ان بچوں کو اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ اگر میں کوئی قصہ فوراً ایجاد کر کے کہتا ہوں اور آگے چل کر اس کا سرا بھول جاتا ہوں تو بچے مجھے فوراً یاد دلا دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میں قصہ کو شروع سے آخر تک اُسی غیر دلچسپ طریقہ سے سناتا ہوں۔ اس سے تو مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی مصنف اپنے مضامین بدلتا ہے خواہ وہ بدلی ہوئی چیز شاعرانہ حیثیت سے کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو تو وہ اپنی تصنیف کو نقصان پہنچاتا ہے۔ پہلا اثر تو فوراً ہی معلوم ہو جاتا ہے۔ ہم لوگوں کی دماغی ساخت کچھ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ ہم بے سروپا باتوں کا فوراً یقین کر لیتے ہیں اور ایک دفعہ جب حافظہ پر اُن کا نقش قائم ہو جاتا ہے تو پھر اُسکے مٹانے والے کو بڑی آفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

---

۱۸ راگست

کیا ہمیشہ ایسا ہی ہوتا آیا ہے کہ ہماری مسرتوں اور خوشیوں کا جو منبع ہے وہی ہماری

نامرادیوں اور مصیبتوں کا سرچشمہ بھی ہے۔ جو جذبہ مناظر قدرت کی طرف سے میرے دل میں محبت پیدا کرکے مجھ کو مسرت اور شادمانی سے بیخود کر دیتا اور بہشت کی تمام نعمتوں کو میرے سامنے پیش کرتا تھا اُس نے آج ایک ناقابل برداشت درد و محن کی صورت اختیار کرلی ہے گویا وہ ایک بھوت ہے جو برابر میرے سر پر سوار ہے اور مجھکو پریشاں کرتا ہے۔ گذشتہ ایام میں جب میں ان چٹانوں سے دریا اُس پار سامنے کے پہاڑوں اور سبزہ زاروں اور پھولوں سے بھری ہوئی وادیوں کو دیکھتا اور بزم قدرت میں کلیوں کو کھلتے اور پھولوں کو ہنستے دیکھتا (پہاڑیاں تو سر سے پانوں تک سبز مخملی لباس میں ملبوس تھیں) یا وادیوں کے پُر پیچ اور خمدار راستوں کی سیر کرتا جن پر خوشنما درخت سایہ کئے کھڑے رہتے تھے اور ترنم ریز نرکل کے درمیان آہستہ بہنے والی ندی کا لطف اُٹھاتا جس پر شام کی ٹھنڈی ہوا سے اُڑتے ہوئے خوبصورت بادلوں کا عکس پڑتا یا جب میں اپنے آس پاس کی جھاڑیوں میں چڑیوں کے نغمے سنتا اور شام کے وقت سورج کی سنہری روشنی میں ہزاروں لاکھوں پردار کیڑوں کو رقص میں مصروف دیکھتا جس کی ڈوبنے والی کرنوں سے بھنبھنانے والے بھنورے اپنی گھاسوں اور پتیوں کی آرامگاہ سے بیدار ہوتے، تو میری توجہ اُس موسیقی کی طرف ہو جاتی جو زمین کے اردگرد دھیمے سروں میں جاری رہتی اور پھر میں اُس خشک چٹان کو دیکھتا جس میں سے جھاڑیوں کو غذا پہنچتی۔ لیکن نیچے اُتر کر جو میدان تھا اُس کی قوت کا سارا دارومدار بلوی زمین پر تھا۔ ہاں تو جب میں ان مناظر کو دیکھتا تو میرے قلب میں ایک جوش کی کیفیت اور ایک نور کی چمک پیدا ہوتی جس سے بزم قدرت کا ذرہ ذرہ منور ہے۔ ان جذبات کی روانی سے میں اپنے کو ایک ایسی بلند سطح پر پاتا جہاں سے خدا کی شان کبریائی اور اس ناپیدا کنار عالم کی خوشنمائی اور بوقلمونی کا تماشا میری روحانی آنکھوں کو صاف نظر آتا۔ اسوقت بڑے بڑے پہاڑوں کی فلک بوس چوٹیاں میرے گرد احاطہ کرتیں، بڑے بڑے غار میرے قدموں کے لئے راستہ بناتے اور پرشور آبشار میرے سامنے سر کے بل غلطاں اور پیچاں نظر آتے۔ موجیں مارنے والے بڑے بڑے دریا میدانوں میں بہتے اور ان کے شور سے دشت وجبل گونج اُٹھتے۔ زمین

کی گہرائی میں مجھے سیکڑوں ہزاروں متحرک قوتوں کا احساس ہوتا جو ہر ساعت، ہر لحظہ بے شمار تعداد میں بڑھتی جاتیں۔ سطح زمین پر آسمان کے نیچے جانداروں کی لاکھوں کروروں قسمیں حرکت کرتیں گویا میرے چاروں طرف ہر چیز بے شمار صورتوں کے ساتھ زندہ نظر آتی مگر افسوس! آدمی کتنا بیوقوف ہے کہ اپنی حفاظت کی خاطر اپنے چھوٹے چھوٹے مکانوں میں گھس جاتا ہے اور اپنی اس پناہ سے بزعم خود اس عالم بسیط پر حکومت کرتا ہے۔ اُس کے تنگ خیال میں ہر چیز کتنی تنگ نظر آتی ہے! لیکن ناقابل گذر پہاڑوں سے، لق و دق صحراؤں سے جو ابتک انسانی قدم کے نقوش سے بالکل پاک ہیں اور سمندروں کے نامعلوم کناروں سے، اس خدائے لایزال کی تسبیح و تحلیل ہر وقت بلند ہوتی رہتی ہے۔ اس دنیائے ہست و بود کا ہر ذرہ جو اس کے حکم سے کتم عدم سے عالم وجود میں آیا ہے اسی کی بارگاہ ازلی کا فیض رسیدہ ہے چڑیوں کی پرواز دیکھ کر کتنی بار میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی ہے کہ کاش! میں اس بحر بیکراں کے کنارے پہنچ جاتا اور اس بارگاہ نا متناہیہ سے مجھے بھی نشاط زندگی کا ایک چھلکتا ہوا جام عطا ہوتا اور میری روح کی قوتیں گو محدود سہی مگر تھوڑی ہی دیر کے لئے اس خالق بے نیاز میں جا کر گم ہو جاتیں جو اپنی ذات سے ہر چیز کو مکمل کرنے والا ہے۔

میرے عزیز دوست! اُن اوقات کا خفیف سا تصور بھی میرے لئے باعث صد تسکین ہے اور اس ناقابل اظہار جوش کی یاد اور اس کا بیان میری روح کو بلند مگر میری موجودہ پریشانیوں کو اور کاہشوں کو دونا کر دیتا ہے۔

بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری آنکھوں کے سامنے سے سارے حجابات اُٹھ گئے اور زندگی کا دائمی منظر نظر آنے کے بجائے قبر کا گڑھا منہ پھیلائے ہوئے اپنے بھیانک انداز میں دکھائی دیتا ہے۔ جب اس عالم آب و گل کی ہر چیز فانی نظر آتی ہے اور زمانہ طوفان کی طرح ہر چیز بہائے لئے جاتا ہے اور ہمارے سفینہ زندگی کا یہ حال ہے کہ یا تو سیلاب میں فنا ہو جائے یا کسی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے تو اس صورت میں کیا ہم کسی چیز کی ہستی کو یقین کے ساتھ تسلیم کر سکتے ہیں۔ ہر ساعت و ہر لحظہ

آپ کی اور آپ کے گرد وپیش کی تمام چیزوں کی تاک میں ہے اور یہی نہیں بلکہ ہر لحہ آپ خود بھی اپنی تباہی کا سامان پیدا کرتے رہتے ہیں۔ آپ سیر و تفریح کے لئے جاتے ہیں مگر اس سیر و تفریح میں ہزاروں معصوم کیڑوں کا خون ہو جاتا ہے۔ صرف آپ کی ایک جنبش قدم سے چیونٹی کی کتنی محنت اکارت جاتی ہے اور اس کی آراستہ و پیراستہ دنیا بدنظمی اور بدترتیبی کا شکار بن جاتی ہے۔ نہیں، نہیں اگر دنیا کی مصیبتیں اور آفتیں یہیں ختم نہیں ہوتیں۔ بلکہ خوفناک طوفان آتے ہیں جو صدہا آبادیوں کو چشم زدن میں بہالے جاتے ہیں۔ دہشت ناک اور مہیب زلزلے آتے ہیں جو شہروں کو دم بھر میں نگل جاتے ہیں لیکن میرا دل ان آفتوں سے اتنا متاثر نہیں ہوتا جتنا کہ اس خیال سے کہ تباہی و بربادی کی قوت خود کارخانۂ قدرت میں پوشیدہ ہے۔ قدرت کی تمام پیدا کردہ چیزوں میں گویا خرابی کی ایک صورت مضمر ہے[1]۔ اس لئے اس دنیا میں جس کو ہوا، مٹی اور متحرک قوتوں نے محدود کر رکھا ہے میں اپنے متفکر اور محزون دل کے ساتھ آوارہ و پریشان پھرتا ہوں۔ یہ عالم میرے لئے گویا ایک دیو عظیم کی حیثیت رکھتا ہے جو ہمیشہ خود اپنے بچوں کو نگل جاتا ہو۔

---

۱۲ اگست

صبح کو جب میں اپنی خستہ خوابی سے بیدار ہوتا ہوں تو اپنے دونوں ہاتھوں کو اُس کی طرف بڑھاتا ہوں مگر افسوس وہ کہاں! رات کو نیند کی حالت میں جب کسی معصومانہ خواب میں میں اُس کو اپنے ساتھ کسی میدان میں دیکھتا ہوں یا اُسکے دستہائے نازنین پر بوسہ دیتا ہوں تو میں اُس کو اپنی چارپائی پر تلاش کرتا ہوں مگر افسوس وہ کہاں! نیند کے قبل دماغ کی پریشان مگر خوش آیند حالت میں جب میں اُسکو اپنے پاس سمجھ کر چھونا چاہتا ہوں اور نہیں پاتا ہوں تو اُس وقت قلب حزیں کے ٹکڑے بے اختیار آنکھوں کی راہ سے پگھل کر بہتے ہیں، اور تمام لذتوں اور ارمانوں سے بیگانگی

---

[1] ہر کہ آمد بجہاں نقش خرابی دارد ۔ در خرابات مپرسید کہ ہشیار کجاست ۔ حافظ

کے عالم میں میں بگڑی اپنی آیندہ محرومیوں اور نامرادیوں پر اشک حسرت بہاتا ہوں۔

۲۲ر اگست

ولہلم! اُف کتنی بڑی بدقسمتی ہے کہ میری روح عمل سرد ہو کر اب کاہلی اور سستی پر قانع ہو گئی ہے۔ میں نہ تو بالکل بیکار رہ سکتا ہوں اور نہ میرا کسی کام میں جی لگتا ہے۔ خیال میں وہ رعنائی بھی نہیں رہی اور اب حسن فطرت کے مشاہدہ کے لئے وہ آنکھ کہاں سے لاؤں کتابیں کاٹے کھاتی ہیں۔ ایک دفعہ بھی جب ہم اپنے آپ کو بے قابو چھوڑ دیتے ہیں تو پھر ہمارا پتہ لگنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اکثر میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی ہے کہ کاش میں کوئی معمولی مزدور ہی کیوں نہ ہوا اور اگر مزدور ہوتا تو صبح کی بیداری کے بعد میرے دل میں یہی ایک آرزو ہوتی یعنی دن بھر کی محنت اور مزدوری کا خیال رہتا۔ جب میں البرٹ کو اس کے بے شمار کاغذات و مسودات میں محو پاتا ہوں تو اکثر اس پر رشک کرتا ہوں اور دل میں کہتا ہوں کہ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو آج کتنا خوش و خرم ہوتا۔ اس خیال سے متاثر ہو کر میں نے بارہا تم کو اور وزیر حکومت کو لکھنے کا ارادہ کیا کہ مجھ کو سفارتخانہ میں کوئی جگہ مل جائے اور تم بھی سمجھتے ہوگے کہ مجھے جگہ مل جاتی اور میں بھی سمجھتا ہوں کہ مل جاتی۔ وزیر مدتوں سے مجھ پر نہایت مہربان ہے اور متعدد بار مجھ سے نوکری کیلئے کہہ چکا ہے۔ ملازمت کیا ہے، بس ایک گھنٹہ کا کام ہے۔ لو اس پر اس گھوڑے کا قصہ یاد آیا جو آزادی سے تنگ آ کر خود لگام لگوانے اور زین کسوانے پر راضی ہوا تھا اور سواری کی نوبت آخر کار یہاں تک پہنچی کہ جان ہی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔ کیا میری انقلاب و تغیر کی یہ خواہش نتیجہ نہیں ہے اس بیقراری کا جو زندگی کے ہر شعبہ میں میرا پیچھا کرتی آئی ہے اور کرے گی؟

۲۸ر اگست

اگر میری بیماریاں علاج پذیر ہیں تو یقیناً اُن کا علاج یہیں ہو سکتا ہے۔ آج میری سالگرہ ہے اور علی الصباح البرٹ نے ایک پولندہ بطور تحفہ بھیجا۔ کھولنے پر اس میں

سے ایک سرخ فیتہ نکلا جس کو شارلٹ اُس روز پہنے ہوئے تھی جب میں اُس سے پہلے پہل ملا تھا اور اُس فیتہ کو میں نے اُس سے کئی بار مانگا بھی تھا۔ اس کے ساتھ ہومر مؤلفہ ٹیسٹائن کی دو جلدیں بھی تھیں اس کتاب کی مجھ کو اکثر ضرورت بھی رہتی ہے اس لئے کہ سیر و تفریح کے وقت ارنسٹائن والا نسخہ لے جانا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ وہ لوگ میرا کتنا خیال کرتے ہیں اور دوستی اور محبت کے ذرا ذرا سے جزیئے پر کیسی نظر رکھتے ہیں اس لئے ان کا تحفہ امیروں اور کبیروں کے بے بہا مگر حقیر تحفوں سے کہیں بہتر ہے۔ میں نے اُس فیتہ کو عالم شوق میں سیکڑوں بار بوسہ دیا اور ہر بار میری مشام جان اُس زمانہ کی ناقابل محو مسرتوں کی یاد سے معطر ہو جاتی ہے بس ولہلم ہماری زندگی یہی ہے۔ میں اپنی قسمت کی شکایت بھی نہیں کرتا اور کروں بھی تو کیا کروں۔ گلہائے زندگی کی بہار بس چندروزہ ہے۔ کتنے خوبصورت اور خوشنما پھول ہیں جو مرجھا جاتے ہیں اور اپنا اثر تک نہیں چھوڑتے اور کتنے ہیں جو پھلتے تک نہیں! اور کتنے ہیں جو پھلتے ہیں اور اُن کے پھل پکتے ہیں! اس بے ثباتی کے باوجود بہرحال پھول ہوتے ہیں اور میرے عزیز دوست! پھر کیا یہ زمانہ کی نیرنگی نہیں ہے کہ جو کلیاں بڑھتی ہیں اور چٹک کر پھول ہوتی ہیں ہم اُن کی خوشبوؤں سے لطف اُٹھائے بغیر اُن کو مرجھا جانے دیتے ہیں؟ اچھا الوداع! موسم گرما کتنا شاندار ہے۔ شارلٹ کے باغ میں اکثر میں پیڑوں پر چڑھتا ہوں اور اونچی اونچی ڈالوں سے شفتالوؤں کو ہلا کر گراتا ہوں۔ وہ نیچے کھڑی ہوتی ہے اور جیسے جیسے وہ گرتے جاتے ہیں انھیں ہاتھ بڑھا کر لیتی جاتی ہے۔

---

۳۰ اگست

میری ہستی بھی کتنی بدقسمت واقع ہوئی ہے۔ مگر میں اپنے کو دھوکا کیوں دوں۔ آخر ان بیہمانہ، بے معنی اور بے پایاں جذبات کا کیا حشر ہوگا؟ میں اگر کچھ کہنا سننا چاہتا ہوں تو بس شارلٹ سے۔ میرے تخیل میں سوائے اُسکے اور کسی کی جگہ نہیں اور گرد و پیش کی تمام چیزیں اگر اُن کا تعلق اس کی ذات سے نہیں ہے تو میرے لئے محض بے کار ہیں۔ میرا

تخیل میرے لئے ایک خواب نما حالت پیدا کر دیتا ہے اور اسی حالت میں میں کئی گھنٹے اُسکی یاد میں اتنی خوشی سے گذارتا ہوں کہ آخر تھک کر اپنا خیال اُسکی طرف سے ہٹالیتا ہوں۔ واللہ معلوم نہیں کہ میرا خانہ خراب دل مجھ سے کیا کیا نہ کروائے۔ جب میں شارلٹ کے ساتھ کئی گھنٹہ بسر کرتا ہوں تو اُس کے حسین چہرہ، بے پناہ غمزہ اور پاک خیالات میں گم ہوجاتا ہوں یہانتک کہ میرا دماغ رفتہ رفتہ اپنے انتہائی ہیجانی کیفیت میں ہوتا ہے۔ پھر اُسوقت میری بصارت میں دھندلاپن، سامعہ میں برہمی اور سانس میں تکلیف پیدا ہو جاتی ہے گویا مجھے کسی قاتل کا سامنا کرنا پڑا ہے پھر میرا دھڑکتا ہوا دل میرے مضطرب اور دردرسیدہ احساس سے تسکین کا طالب ہوتا ہے۔ بسا اوقات میں اپنی ہستی سے بالکل بیگانہ ہوجاتا ہوں۔ اُن لمحات میں اگر کوئی شخص میرے بے قرار دل کو تسلی نہیں دیتا ہے اور شارلٹ مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ میں اُس کے خوبصورت ہاتھ کو تسکین اضطراب کی خاطر اپنے آنسوؤں سے تر کروں تو میں اُس سے علیحدہ ہو کر دیوانہ وار جنگل کی طرف چلا جاتا ہوں اور وہاں اکثر کسی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھتا ہوں یا کسی دشوار گذار جھاڑی میں جانے کی کوشش کرتا ہوں جہاں کانٹے میری خوب تواضع کرتے ہیں۔ اُسوقت البتہ میرے دل کی جلن میں کچھ کمی ضرور ہوتی ہے۔ وہاں اکثر پیاس کی شدت یا خستگی سے زمین پر لیٹ جاتا ہوں یا رات کو جب چاند اپنی ہلکی ہلکی کرنیں ڈالتا ہے تو میں سنسان جنگل میں کسی پیڑ کے سہارے بیٹھ کر اپنے خستہ اور تھکے ہوئے اعضا کو آرام دیتا ہوں اور جب بیٹھے بیٹھے تھک جاتا ہوں تو صبح تک...... کچھ دیر کے لئے سو رہتا ہوں۔ واللہ میرے رنج و مصیبت و اسباب پریشانی کے سامنے کسی زاہد عزلت گزیں کا حجرہ اُس کا بوریہ اور اُس کی کانٹے دار پیٹی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ بلکہ یہ چیزیں عیش و آرام کا سامان معلوم ہوتی ہیں۔ اچھا الوداع۔ شاید ان کلفتوں سے میری نجات کا ذریعہ موت ہی کے آغوش میں ہے

۳ ستمبر

یہاں سے میرا جانا بہت ضروری ہے۔ واللہ تمھارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے میرے

اضطراب کی وجہ دریافت کرنے میں کافی تکلیف اُٹھائی۔گزشتہ دو ہفتے سے میرے دل میں برابر یہ خیال رہا کہ اب اس شوخ ستم پرور کا کبھی نام نہ لوں اور رشتہ وفا کو توڑ کر علیٰحدہ ہو جاؤں۔ مگر..... فی الحال وہ شہر گئی ہوئی ہے اور ایک دوست کے یہاں مقیم ہے اور پھر البرٹ..... ہاں میرا جانا یہاں سے بہت ضروری ہے

۱۰ ستمبر

ولہلم۔کیسی خوفناک رات ہے مگر میرا دل اب ہر اُفتاد کے لئے تیار ہے۔ ہائے اب میں اسے پھر کبھی نہ دیکھ سکوں گا۔کاش تم یہاں ہوتے اور ہم دونوں گلے مل مل کر اتنا روتے کہ آنسوؤں کا دریا بہنے لگتا اور آن آبلہ ہائے دل کو نشتر غم سے چھیڑتے جنکی کھٹک سے دل ہمیشہ بے قرار رہتا ہے۔ ہائے افسوس! میں یہاں تنہا بیٹھا ہوا سسکیاں لے رہا ہوں اور دل کے پریشان ریزوں کو تسکین خاطر کیلئے جمع کر رہا ہوں۔صبح کا انتظار ہے اور طلوع آفتاب کے وقت گھوڑے دروازے پر آ جائیں گے۔وہ کتنی میٹھی نیند سو رہی ہے! اُس کو کیا خبر کہ آج میں نے اسکو بس آخری بار دیکھا ہے میں اب بالکل آزاد ہوں دو گھنٹہ کی ملاقات میں میں نے اپنا جی اتنا تو کڑا کر لیا کہ اپنا رازِ دل اُس پر ظاہر نہیں کیا مگر ولہلم میری اس کی باتیں بھی کیسی دلفریب تھیں!

البرٹ نے وعدہ کیا تھا کہ وہ شام کے کھانے کے بعد شارلٹ کے پاس باغ میں آئے گا۔میں شام کو شاہ بلوط کے اونچے درخت کے نیچے بیٹھا ہوا غروب آفتاب کا سماں دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی کیا منظر تھا جب سورج سامنے کی خوشنما وادی اور خاموش چشمہ کے نیچے آخری بار چلا گیا۔اس جگہ کی سیر اکثر میں شارلٹ کے ساتھ کر چکا ہوں اور غروب آفتاب کا منظر بھی دیکھ چکا ہوں اور آج بھی اسی جگہ ٹہل رہا تھا جو مجھے بہت عزیز تھی شارلٹ سے ملنے کے قبل میں وہاں بیشتر ایک اندرونی جذبہ سے متاثر ہو کر جا چکا ہوں اور ہم دونوں کو اپنی ابتدائی ملاقات میں یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ ہم دونوں اسی جگہ کو پسند کرتے ہیں جو واقعی ایسی دلفریب اور پر فضا ہے کہ کسی مصور کے تخیل میں کافی

رنگینی پیدا کر سکتی ہے۔ شاہ بلوط کے نیچے سے سامنے کا منظر بڑی دور تک صاف معلوم ہوتا ہے لیکن میں یہ سب باتیں اپنے پچھلے خطوں میں لکھ چکا ہوں اور کنارے کے چیڑ کے درختوں کا حال بھی بتا چکا ہوں۔ ان درختوں کے درمیان جو راستہ جاتا ہے وہ دور جا کر اتنا تنگ اور تاریک ہو جاتا ہے کہ آخر میں وہاں ایک قدرتی گوشہ بن گیا ہے جس میں ایک خاموش حجرہ کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ دن کے وقت آفتاب کی روشنی میں جب پہلی بار میں وہاں گیا تھا تو مجھ پر اضمحلال اور دلگیری کی جو عجیب حالت طاری ہوئی تھی وہ مجھے اب تک یاد ہے۔ میرے دل میں اُسوقت نہ جانے کیوں خیال آیا کہ یہ جگہ ایک نہ ایک دن میرے لئے یا مسرت و انبساط یا پھر رنج و محن کا باعث ہوگی۔

آدھ گھنٹہ تک میں اسی اُدھیڑ بن میں پڑا رہا کہ آیا میں اُس طرف جاؤں یا واپس چلا آؤں کہ اتنے میں میں نے ان لوگوں کو چبوترے کی طرف آتے دیکھا اور اُن کو ملنے کے لئے تیزی سے آگے بڑھا اور جیسے ہی میں نے شارلٹ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر بوسہ دیا ویسے ہی میرے بدن پر رعشہ کی کیفیت طاری ہوگئی۔ جوں ہی ہم لوگ چبوترے کے اوپر پہنچے چاند سبزہ پوش پہاڑی کے پیچھے سے نکلا۔ بہت سی باتوں کے متعلق گفتگو چھڑ گئی اور بات چیت کرتے کرتے بغیر کسی ارادہ کے ہم لوگ درختوں کے اُسی تاریک گوشہ کے قریب پہنچ گئے اور شارلٹ اُس میں داخل ہوئی اور جاکر بیٹھ گئی۔ البرٹ اُس کے پاس ہی بیٹھ گیا اور میں بھی وہیں بیٹھ گیا۔ مگر میرے دل کی وحشت نے مجھے زیادہ دیر تک وہاں بیٹھنے نہ دیا۔ میں اُٹھا اور اُٹھ کر اُس کے سامنے آیا اور پھر اِدھر اُدھر ٹہل کر اپنی جگہ پر جاکر بیٹھ گیا۔ میری وحشت اور بیقراری ایسی تھی کہ گویا رگوں میں بجائے خون کے پارہ دوڑ رہا تھا۔ چاند اب اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا اور اپنی روپہلی کرنوں سے میدان اور اُس چیڑ کے جنگل کو منور کر رہا تھا۔ شارلٹ بار بار چاند کی طرف دیکھتی اور ہم لوگوں سے اُسکی نورانی خوبیوں کو بیان کرتی۔ یقیناً منظر بڑا دلفریب اور پر فضا تھا۔ ہمارے گوشہ کی تاریکی نے جمع اضداد کی وجہ سے منظر کو اور بھی چمکا دیا۔ ہم لوگ خاموشی سے چاندنی کا لطف اُٹھا ہی رہے تھے کہ شارلٹ نے یوں گفتگو شروع کی کہ "جب میں چاندنی رات میں سیر کرنے

نکلتی ہوں تو میرے تمام گذشتہ احباب یاد آتے ہیں پھر اُسوقت میرے دل میں موت اور عاقبت کا خیال آنے لگتا ہے" بعدازاں اس کی آواز زیادہ پراثر اور زوردار ہوگئی اور کہنے لگی کہ "ورتھر! یقیناً ہم لوگ دوبارہ زندہ ہونگے مگر کیا اس دوبارہ زندگی میں ہم اپنے پرانے دوستوں سے مل سکیں گے اور اُن کو پہچان بھی سکیں گے؟ آخر تمہارا کیا خیال ہے کچھ تم بھی کہو" یہ سن کر میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہنے لگا کہ "شارلٹ! بیشک ہم لوگ ضرور ملیں گے۔ اس عالم میں اور دوسرے عالم میں بھی ضرور ملیں گے" بس میں اس سے زیادہ اور کچھ نہ کہہ سکا۔ ولہلم معلوم نہیں اُس نے یہ سوال مجھ سے ایسے وقت کیوں کیا جب میرے دل میں یہاں سے جانے کا خیال آرہا تھا۔

شارلٹ نے پھر یوں بات شروع کی کہ "کیا وہ لوگ جو دارالفنا کو چھوڑ کر دارالقرار کی طرف کوچ کر چکے ہیں جانتے ہیں کہ ہم لوگ یہاں کس حال میں ہیں اور کیا ان کو اس کی خبر ہے کہ ہم لوگ کس وقت خوش اور دلشاد رہتے ہیں اور کب ان رفتگان خاک کو محبت سے یاد کرتے ہیں؟ شام کی پھیلتی ہوئی تاریکی میں میری ماں کی روح اکثر آتی ہے اور جب میں اپنے بچوں اور چھوٹی بہنوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہوں جیسے کہ یہ بچے میری ماں کے ساتھ بیٹھتے تھے تو میں متفکر نظروں سے آسمان کیطرف دیکھکر کہتی ہوں کہ اے کاش! میری ماں ملاءاعلیٰ سے دیکھتی کہ میں کس طرح اپنے چھوٹے بھائیوں اور بہنوں کی دیکھ بھال کرنے کے ان وعدوں کو پورا کررہی ہوں جو میں نے اُسکے بستر مرگ کے پاس کھڑے ہو کر کیا تھا۔ ان خیالات میں ڈوب کر اکثر میں بے اختیار ہو کر چیخ پڑتی ہوں اور کہتی ہوں کہ میری اچھی اماں! اگر میں بچوں کی خبر گیری تیری طرح نہیں کر سکتی تو معاف کرنا لیکن جہانتک مجھ سے ہو سکتا ہے اس میں کوتاہی نہیں کرتی اُن کو میں عمدہ عمدہ کپڑے پہناتی ہوں کھانا کھلاتی ہوں اور اس سے بڑھ اُن کو پیار کرتی ہوں اور تعلیم دلواتی ہوں۔ میری پیاری اماں! اگر تم کو آج ہماری محبت آمیز اور خاموش زندگی کا حال معلوم ہو تو بے شک تم اُس خداے رحیم کی نعمتوں کا شکر نہایت عاجزی سے ادا کرو گی جس کی بارگاہ سے تم اپنے آخری لمحات حیات میں صرف ہماری مسرت اور خوشی کے لئے

گڑگڑا کر دعائیں مانگا کرتی تھیں"۔اس طرح شارلٹ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔مگر دلعلا کون ہے جو اسکے شیریں اور پر اثر الفاظ کو دہرا سکے اور کون ہے جو اس کی روح کے پاک جذبات کو سرد اور مردہ الفاظ کا جامہ پہنا سکے!!

البرٹ نے اتنے میں درمیان سے یوں بات کرنی شروع کی "میری پیاری شارلٹ! تم پر ان باتوں کا بڑا اثر پڑتا ہے اور میں جانتا ہوں کہ تمہاری روح اس قسم کے خیالات میں بڑے جوش کے ساتھ ڈوب جاتی ہے مگر میں تم سے ایک بات کہتا ہوں ۔۔۔"

اس پر شارلٹ نے بھی بات کاٹ کر کہا "البرٹ! شاید تم اُن شاموں کو ابھی بھولے نہیں ہو گے جب ہم تینوں ابا جان کی عدم موجودگی میں اس چھوٹی گول میز کے کنارے بیٹھتے تھے اور اُس وقت بچے کھانا کھا کر سو چکے ہوتے تھے۔ تمہارے پاس اکثر کوئی اچھی کتاب ہوتی مگر تم اس کو پڑھتے نہ تھے اس لئے کہ اُس شریف مختی اور خولصورت عورت کی باتیں تمام چیزوں سے بدرجہا بہتر معلوم ہوتیں۔ خدا ہی جانتا ہے کہ میں نے کتنی راتیں روتے روتے اس دعا میں گذاری ہیں کہ خدایا مجھے بھی اُسی کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا کر" یہ سن کر میرے دل میں برداشت کی مطلق تاب نہ رہی اور میں اُٹھ کر اسکے قدموں پر گر پڑا اور اتنا رویا کہ اُس کے پاؤں تر ہو گئے اور پھر چیخ کر کہا کہ شارلٹ! اسوقت تم پر خدا کی رحمت کا اور تمہاری والدہ مرحومہ دونوں کا سایہ ہے۔

شارلٹ۔(میری پیٹھ پر اپنے ہاتھوں کو رکھ کر) "مگر تم تو شاید اس سے واقف تھے اور وہ تمہارے جاننے کے بیشک لائق تھی"۔افسوس! میں اسکی زبان سے اپنی ایسی تعریف سنکر بیہوش کیوں نہ ہو گیا کیونکہ میں نے اپنی تعریف اُس کی زبان سے کبھی سنی ہی نہیں تھی۔

شارلٹ۔"ان باتوں کے باوجود ابھی وہ بہار جوانی سے اچھی طرح پھول چننے نہ پائی تھی کہ دفعتاً باغ زندگی سے چھ ماہ کا ایک چھوٹا بچہ چھوڑ کر کوچ کر گئی۔ اُسکی بیماری بھی ایسی طویل نہ تھی لیکن اس کی روح میں سکون اور استقلال پیدا ہو گیا تھا۔ہاں اگر کبھی ملول ہوتی تو صرف بچوں کے خیال سے اور خاصکر میری چھوٹی بہن کے خیال سے۔جب اسکا وقت قریب آیا تو اُس

نے تمام بچوں کو اپنے پاس بلوایا۔ میں سب کو لے گئی۔ چھوٹے بچے تو یہ بھی نہ سمجھتے تھے کہ کیا ہونے والا ہے۔ بڑے بچے البتہ رنج سے روتے اور جان کھوتے تھے۔ جب ہم سب اُس کے بستر کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے تو اُس نے اپنے کمزور ہاتھوں کو اُٹھا کر ہم لوگوں کی سلامتی کے لئے دعا کی اور پھر سب کو باری باری پیار کر کے واپس کر دیا اور پھر مجھ سے کہنے لگی کہ "دیکھو تمہیں اب ان سب کی ماں ہو۔" میں نے وعدہ کے خیال سے اپنا ہاتھ اُسکے ہاتھ میں دیدیا۔ اس پر وہ بولی کہ "دیکھو تم ہم سے وعدہ تو بہت بڑا کر رہی ہو یعنی ماں جیسی محبت اور حفاظت کا بار اپنے سر لے رہی ہو میں نے تم کو اکثر بچوں کی خاطر آبدیدہ ہوتے دیکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تم میں ماں ایسے دل کی نزاکت موجود ہے لیکن میں جب جانوں کہ تم اپنے بھائیوں اور بہنوں کی اسی طرح ہمیشہ خاطر کرتی رہو اور بیوی کی طرح اپنے باپ کی مطیع اور فرمانبردار بنی رہو۔ اب سارے خاندان کا لے دے کے تمہیں سہارا ہو۔" اس کے بعد اُس نے میرے باپ کو پوچھا جو اُس کے بستر مرگ کی تاب نہ لا کر غم سے نڈھال دوسرے کمرے میں پڑا ہوا تھا۔ مگر البرٹ اور تم تو اُس کمرے میں موجود تھے۔ اُس نے کسی کے پاؤں کی آہٹ سنکر پوچھا تھا کہ کون آرہا ہے اور تم سے کہا بھی تھا کہ دیکھو کون ہے۔ اُس نے بڑے اطمینان خاطر کے ساتھ ہم دونوں کو دیکھا تھا اور اُس کی نظروں میں گویا دعا کے یہ الفاظ پائے جاتے تھے کہ "خدا کرے تم دونوں آپس میں مل جل کر ہنسی خوشی کی زندگی بسر کرو۔"

اس پر البرٹ نے اُس سے گلے مل کر اُسکو بوسہ دیا اور کہنے لگا "بیشک ہم دونوں خوش ہیں اور انشاءاللہ اسی طرح خوش خوش زندگی گذاریں گے۔" البرٹ عام طور پر نہایت متین رہتا ہے مگر اس موقع پر اپنی پریشانی خاطر کو نہ روک سکا اور میری حالت کا تو پوچھنا ہی کیا۔ میرے اضطراب کا اظہار تو لفظوں کی دنیا سے بہت دور واقع ہوا ہے۔

پھر شارلٹ نے مجھ کو یوں مخاطب کیا "ورتھر! ایسی مبارک ہستی کے اُٹھ جانے سے ہم لوگوں کو جو قلق ہوا اُس کا اظہار نا ممکن ہے۔ خدایا! کیا یہ دنیا اسی لئے بنائی گئی ہے کہ ہم اپنی محبوب ترین چیزوں سے جدا کر دیئے جائیں۔ اُس کی جدائی کا صدمہ بچوں سے زیادہ شاید ہی کسی کو ہوا ہو۔ اس کی موت کے مدتوں بعد تک بچے برابر اُس کی یاد میں یہی کہہ کہہ کر روتے اور

سسکتے رہے کہ ہائے کالے ملکوں والے میری پیاری اماں کو اٹھالے گئے۔"
یہ کہہ کر شارلٹ کھڑی ہوگئی اور میں بھی چونک پڑا مگر بیٹھا رہا اور اُسکا ہاتھ تھامے رہا۔ شارلٹ نے کہا کہ اب دیر ہورہی ہے چلنا چاہئے۔ اُس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں سے کھینچنا چاہا مگر میں اسکا ہاتھ بدستور تھامے رہا اور کہا کہ "شارلٹ! ہم دونوں ضرور ملیں گے اور ہر ممکن انقلاب و تغیر کے باوجود یقیناً ایک دوسرے کو پہچان لیں گے اچھا اب میں جارہا ہوں اور اپنی مرضی سے جارہا ہوں اور کیا یہ بھی کہوں کہ ہمیشہ کے لئے جارہا ہوں لیکن اپنے الفاظ کو شاید پورا کرکے نہ دکھا سکوں۔ اچھا شارلٹ الوداع۔ البرٹ الوداع۔ ہم لوگ پھر ملیں گے۔ شارلٹ نے مسکرا کر جواب دیا "اچھا کل ملیں گے۔" کل۔ اُف یہ لفظ کیسا جانگداز ہے۔ جب اُس نے میرے ہاتھ میں سے اپنا ہاتھ کھینچا تو اُسے کیا معلوم تھا کہ میرے دل میں آگ بھڑک رہی تھی۔ وہ دونوں چیڑ کے درختوں والے راستہ سے چلے گئے اور میں چاندنی رات میں کھڑا ہوکر اُن لوگوں کو برابر دیکھتا رہا۔ پھر میں بے اختیار زمین پر گر پڑا اور خوب رویا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُٹھا اور پھر دوڑ کر اُسی چبوترے پر گیا۔ دیکھا تو شارلٹ نیبو کے درختوں کے نیچے پہنچ چکی تھی اور اسکا سفید لباس باغ کے دروازہ کے پاس آخری بار نظر سے اُوجھل ہوگیا۔ میں نے اپنے ہاتھوں کو اس کی طرف بڑھایا مگر وہ کہاں!

باب دوم

۱۰ر اکتوبر

ہم لوگ کل یہاں پہنچے۔ سفیو بیمار ہے اور چند دنوں تک شاید باہر بالکل نہ نکلے۔ اگر وہ ذرا کم بد مزاج اور کم ترشرو ہوتا تو ممکن ہے اس سے نبھ جاتی۔ اب مجھے صاف نظر آ رہا ہے کہ قدرت نے شاید مجھے کسی سخت امتحان کے لئے چن لیا ہے۔ اے دل ہمت کر! اس لئے کہ اعلیٰ اور آزادہ رو آدمی ہر افتاد کو برداشت کر جاتا ہے۔ ایک آزاد دل! میں قلم سے ایسے الفاظ نکلنے پر شرما جاتا ہوں۔ کاش میں ذرا سا اور آزاد دل رکھتا تو دنیا میں مجھ سے زیادہ خوش وخرم آدمی شاید ہی کوئی اور ہوتا لیکن کیا میں اس حالت میں اپنی استعداد اور قوت سے ناامید ہو جاؤں جب میں دیکھتا ہوں کہ مجھ سے نہایت کم قابلیت کے لوگ اپنی قابلیت کی نمائش بڑے اطمینان خاطر کے ساتھ کرتے ہیں۔ اے میرے کارساز! میرے پاس جو کچھ ہے سب تیرا ہی عطیہ ہے۔ پھر تو نے میری بہت سی موجودہ نعمتوں کو کم کر کے کیوں نہ ان کے بدلے میرا دل اطمینان اور اعتماد سے بھر دیا۔

"ذرا صبر کرو۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائیگا میرے دوست بیشک تم ٹھیک کہتے ہو جب سے میں نے لوگوں سے برابر ملنا جلنا شروع کیا ہے اور ان کے اشغال کو دیکھتا ہوں تب سے میں بہت مطمئن ہو گیا ہوں اسواسطے کہ ہم لوگوں کی ساخت فطرت نے کچھ ایسی بنائی ہے کہ ہم ایک دوسرے سے برابر اپنا موازنہ کرتے رہتے ہیں؛ اور ہماری خوشیوں اور مصیبتوں کا دارومدار زیادہ تر گرد وپیش کے حالات اور اشغال پر ہوتا ہے اسلئے تنہائی سے زیادہ خطرناک اور کوئی چیز نہیں۔ تنہائی میں ہمارا خیال جو بہرصورت پرواز کیلئے تیار رہتا ہے، وہم کے پروں پر اڑتا ہے اور ایسی ہستیوں کی تصویر پیش کرتا ہے جن کے سامنے خود ہماری ہستی بالکل حقیر اور پست نظر آتی ہے اور اس عالم میں ہر چیز اپنی اصلیت سے بہت بڑی اور خود ہم سے بہت ارفع اور اعلیٰ معلوم ہوتی ہے۔ دماغ کا یہ فعل بالکل قدرتی ہے اسلئے کہ ہم اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کو بار بار محسوس کرتے ہیں اور چشم تخیل سے دوسروں میں ان اوصاف کو دیکھتے ہیں جو خود ہم میں نہیں ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان لوگوں میں اپنی تمام خوبیاں بھی دیکھتے ہیں اور اسی وسیلہ سے ہم کو ایک شاد و خوش باش اور مکمل انسان کا تصور ہوتا ہے مگر کیسا انسان ہے! یہ انسان صرف ہمارے تخیل میں رہتا ہے لیکن جب باوجود کمزوریوں اور نامرادیوں کے ہم محنت سے کام

کرتے ہیں اور محنت کو برابر جاری رکھتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ گو ہم کو اکثر کشتی کا رُخ بدلنا پڑتا ہے مگر تب بھی ہم اُن لوگوں سے اچھے رہتے ہیں جنکو ہوا اور جوار بھاٹے کی مدد ملی رہتی ہے اور سچ پوچھو تو اس سے بڑھکر خوشی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہم دوسروں کے قدم بقدم چل کر دوڑ میں اُن سے بازی لے جائیں۔

۲۶ر نومبر

میری حالت یہاں زیادہ خوشگوار ہے اور کام میں مشغول رہنے سے بڑا فائدہ معلوم ہوتا ہے لوگوں سے ملنے جلنے اور ان کے اشغال معلوم کرنے سے مختلف قسم کی دلچسپی ہوگئی ہے میں نے کاؤنٹ س سے ملاقات پیدا کرلی ہے اور روز بروز میری نظر میں اُن کی عزت بڑھتی جاتی ہے وہ صاحب فہم و بصیرت ہیں گو انکی نظر اوروں کے مقابلہ میں کافی وسیع ہے مگر وہ اپنے طور طریقہ میں بالکل سرد مہری نہیں برتتے بلکہ لوگوں سے ملتے انسے محبت کرتے اور اُن میں جوش اور سرگرمی پیدا کرتے ہیں۔ ایک موقع پر جب میں اُن کے پاس ایک کام کیلئے گیا تھا تو انھوں نے مجھ سے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔ میرے پہلے ہی جملہ میں اُنھوں نے بھانپ لیا کہ ہم لوگ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور اسی لئے اُنھوں نے میرے ساتھ بالکل دوسرے انداز میں گفتگو شروع کی جس میں وہ اور لوگوں سے بات نہیں کرتے۔ میں اُن کی مخلصانہ اور صادقانہ عنایتوں کا خاطر خواہ شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔ ایسے کار فرما دماغ کی میرے ساتھ ہمدردی یقیناً باعث صد فخر و انبساط ہے۔

۲۴ر دسمبر

جیسا میں ڈرتا تھا سفیر نے بالآخر ویسا کیا یعنی وہ اکثر مجھے بہت پریشان کرتا ہے۔ دنیا میں اُس سے بڑا شاید ہی کوئی بیوقوف ہو جو ذرا سی بات کا اتنا خیال رکھتا ہو۔ وہ ہر کام ایک بڈھی عورت کی طرح یکے بعد دیگرے بڑے قاعدہ کے ساتھ کرتا ہے۔ اُس کو خوش کرنا محال ہے اسلئے کہ وہ اپنے سے بھی کبھی خوش نہیں ہوتا۔ میں اپنا کام قاعدے اور شوق کے ساتھ کرتا ہوں اور جب ختم ہو جاتا ہے تو گھر چلا آتا ہوں لیکن وہ برابر میرے کاغذات پر یہ لکھ کر واپس کر دیتا ہے کہ "بس کافی ہے" مگر ساتھ ہی ساتھ نظر ثانی کی بھی ہدایت ہوتی ہے اسلئے کہ "نظر ثانی سے الفاظ کے بہتر اور صحیح استعمال کرنے کی مشق بڑھتی ہے"۔ اُس وقت پھر مجھے صبر کی تاب نہیں رہتی اور میں زندگی سے بیزار ہو جاتا ہوں۔ اس کی بھی کیا ہدایت ہے کہ نہ تو کوئی حرف عطف اور نہ کوئی لفظ متعلق فعل چھوٹنے پائے۔ میں جملہ میں جن الفاظ کے

اُلٹے پھیر کو پسند کرتا ہوں بس اسی سے وہ خفا ہوتا ہے اور اگر میرے وقفوں کی موسیقی سرکاری اصطلاح سے نہیں ملتی تو وہ میرا مطلب بھی نہیں سمجھ سکتا یقیناً ایسے شخص سے واسطہ رکھنا بڑی بدقسمتی ہے ۔

اس بددلی اور بے لطفی کا بدل مجھے صرف کاؤنٹس کی ملاقات میں ملتا ہے۔ کئی روز ہوئے اُس نے مجھ سے کہا کہ میں خود سفیر کے لیت ولعل اور تاخیر سے ناراض ہوں ۔ اس کے ایسے لوگ اپنے لئے تو خیر، مگر دوسروں کے لئے بھی سیکڑوں دقتیں پیدا کرتے ہیں مگر کیا کیا جائے مجبوری ہے اور یہ مجبوری بالکل اسی طرح کی ہے جیسی ایک سیاح کو اونچے پہاڑ کی چڑھائی میں پیش آتی ہے یعنی اگر وہاں پہاڑ نہ ہوتا تو راستہ بالکل سیدھا اور خوشگوار ہوتا مگر چونکہ پہاڑ ہے اسلئے اُس سے گریز ناممکن ہے۔ کاؤنٹس کی مجھ پر مہربانیوں کا علم اس بڈھے سفیر کو بھی ہے اور اس سے وہ اور چڑتا ہے اور اُسکو جب کبھی موقع ملتا ہے مجھے سنا کر کاؤنٹ کی بُرائی کرتا ہے۔ میں قدرتاً کاؤنٹ کی طرف سے جواب دیتا ہوں جس سے معاملہ اور نازک ہو جاتا ہے ۔اسی سلسلہ میں کل اُس نے مجھے ایک مُکا بھی رسید کیا اور کہنے لگا کہ کاؤنٹ تو دنیا دار آدمی ہے اور کاروبار میں بھی ایسا ہی اچھا ہے!! اُس کا طرز اچھا اور اُس کی تحریر میں روانی بھی پائی جاتی ہے مگر غیرمعمولی فراست اور ذکاوت والوں کی طرح اُس کی قابلیت گہری نہیں ہے۔ یہ کہہ کر وہ میری طرف اس انداز سے دیکھنے لگا کہ آیا مجھ کو اُس کی ضرب سے کچھ چوٹ آئی یا نہیں۔ مگر اُس کی اس نظر کا خاطر خواہ اثر نہیں ہوا۔ اس قسم کے افعال اور اقوال والے آدمیوں سے مجھے سخت نفرت ہے ۔تاہم میں برابر اپنی جگہ اڑا رہا اور اسی جوش اور سرگرمی سے اسکا جواب دیتا رہا۔ میں نے کہا کہ اگر صرف تحصیل علم اور سیرت کے پہلو پر نظر ڈالی جائے تو اس لحاظ سے بھی کاؤنٹ کی ہستی قابل قدر ہے۔ میں تو آج تک کسی ایسے شخص سے نہیں ملا جس کا دماغ ایسی معلومات کا خزانہ اور ایسی وسیع لیاقت کا گنجینہ ہو۔ اس کی تو عجیب حالت ہے۔ وہ ایک طرف تو بیشمار علوم وفنون میں مہارت رکھتا ہے اور دوسری طرف روزمرہ کے کاموں میں ذرا ذرا سی جزئیات میں عملی طور پر دلچسپی لیتا ہے مگر یہ میری ساری گفتگو اُس پیر فرتوت کے سمجھ میں بالکل نہ آئی اور

میں اُسے سلام کرکے چلا آیا کہ کہیں اُس کی دوسری احمقانہ باتوں سے مجھے سخت غصہ نہ آجائے لیکن ان تمام باتوں کے تم ہی ذمہ دار ہو تم ہی، وہ شخص ہو جس نے مجھے عمل کی خوبیوں پر لکھ لکھ کر اس حلقہ میں اپنی گردن ڈالنے پر مجبور کیا۔ ایک آدمی جو ترکاری کی کاشت کرکے اپنی پیداوار کو بازار کے دن شہر میں لے جاکر بیچتا ہے، اگر مجھ سے کم مفید کام کرتا ہے تو بھائی مجھے موجودہ محنت اور مشقت کی حالت میں دس برس اور رہنے دو۔

اف یہ خوش آیند سوحان روح! اس چیز سے تو مجھے ناقابل برداشت تکلیف ہوتی ہے کہ یہاں سوسائٹی میں مجھکو احمق اور بیوقوف لوگوں سے کام پڑا ہے۔ ان کے اقتدار اور منصب کی لالچ بھی کیا چیز ہے اور اس کے انتظار میں سبقت لیجانے کے لئے وہ کتنی جانفشانیاں کرتے اور مشقت اُٹھاتے ہیں! ان کی خواہشات کی اس عریانی میں کتنے ناگفتہ بہ اور بے شعور جذبات پوشیدہ ہیں۔ مثلاً ہم لوگوں کی سوسائٹی میں ایک عورت ہے جو ہمیشہ اپنے خاندان اور اپنی جائداد کے حالات سناتی ہے۔ کوئی غیر آدمی اسکو پہلی بار دیکھ کر پاگل سمجھے گا مگر اس بیچاری کا سر دولت اور منصب کی نمود و نمائش سے پھر گیا ہے۔ دراصل وہ اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز ہے کیونکہ وہ اسی اطراف کے مجسٹریٹ کے ایک منشی کی لڑکی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح لوگ اپنے کو اتنا ذلیل و خوار کر لیتے ہیں۔ روز بروز مجھ پر یہ حقیقت عیاں ہوتی جاتی ہے کہ دوسروں کو اپنے معیار پر جانچنا کتنی بڑی نادانی ہے اور میں تو خود اپنے دل کے ہاتھوں اتنا تنگ اور پریشان حال ہوں کہ میں لوگوں کو اپنے اپنے راستہ پر جانے دینے کیلئے بالکل تیار ہوں بشرطیکہ یہی حق وہ مجھے بھی دیں۔ مجھے جس چیز سے زیادہ تکلیف ہوتی ہے وہ منصب اور اقتدار کا امتیاز ہے جو ظالمانہ حد تک پہنچ گیا ہے میں اس امر سے بخوبی واقف ہوں کہ لوگوں کی حالتوں میں امتیاز اور فرق ناگزیر ہے اور اس خیال سے مجھ کو جو فوائد پہنچتے ہیں اُن کو بھی جانتا ہوں مگر میں ان امتیازات کو کبھی اس حد تک نہیں جانے دوں گا جس سے اس گنبد نیلگوں کے نیچے میرے تھوڑے بہت آرام میں خلل پڑے۔

ابھی حال میں میری ملاقات مس ب سے ہوئی ہے جو بہت دلپسند لڑکی ہے اور جس نے اپنی سادہ فطرت کو مصنوعی زندگی بسر کرنے کے باوجود برقرار رکھا ہے۔ ہم دونوں پہلی ہی بار گفتگو کرکے

یکساں طور پر خوش ہوئے۔ اور رخصت ہوتے وقت میں نے اُس سے پھر ملنے کا خیال ظاہر کیا اس پروہ اتنے منت و خلوص سے راضی ہوگئی کہ میں اُس آنے والی گھڑی کا بڑی بے صبری سے انتظار کرنے لگا۔ وہ یہاں کی مستقل رہنے والی نہیں ہے مگر یہاں اپنی چچی کے ساتھ رہتی ہے۔ اس کی چچی کی صورت بڑی مکروہ ہے۔ میں اس سے بڑی دیر تک باتیں کرتا رہا اور آدھ گھنٹہ کے بعد مجھے معلوم ہوا جیسا کہ اُسکی بھتیجی نے بعد کو اقرار کیا کہ اسکی چچی ایک معمولی جائداد کی مالکہ ہے مگر عقل و فہم اسکی گرہ میں اس سے بھی کم ہے اور اسکو اپنے آبا و اجداد کے حسب و نسب کے تصور میں، اپنی شرافت کے ناز میں اور اپنے اونچے اور بلند مکان سے مزدوروں اور غریبوں کو نفرت سے دیکھنے میں جو لطف و آرام ملتا ہے وہ کسی اور چیز میں نہیں ملتا۔ بیشک وہ اپنی جوانی میں حسین رہی ہوگی اور شاید اپنے عنفوان شباب میں اُس نے اپنی کج ادائیوں اور غمزوں سے بہتیرے نوجوانوں کا دل بھی گھائل کیا ہوگا مگر اپنی پختگی سن و سال میں خود ایک بڈھے سپاہی کے طلسم وفا کی اسیر ہوگئی جو اسکی نگہداشت کی خاطر اور آزادی کے بدلے اسکی ادھیڑ عمر میں اسکے ساتھ رہنے پر راضی ہوگیا۔ وہ بیچارہ سپاہی بھی مرگیا اور وہ اب بیوہ ہے اور اپنی "آہنی" زندگی تنہائی اور عزلت میں گذارتی ہے اور صرف اپنی خوبصورت بھتیجی کو پیار کرنے کے لئے اپنے گوشہ سے باہر نکلتی ہے۔

---

۸ جنوری ۱۸۳۸ء

انسان بھی کیا چیز ہے! اس کے سارے خیالات صورت و رسامان، تزک اور احتشام کے تصور میں پریشاں رہتے ہیں۔ وہ مدتوں آگے بڑھنے کے لئے صرف ایک جنبش قدم پر ہر طرح کی جسمانی اور دماغی کوششوں میں مصروف رہتا ہے اور ہمیشہ صف میں ایک نمایاں جگہ کی فکر میں مشغول رہتا ہے۔ یہی نہیں کہ ایسے لوگ کسی دوسرے کام میں مشغول ہو جائیں بلکہ یہ لوگ ضروری کام کو چھوڑ کر معمولی کام کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ اُن کو خاصی تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے۔ گذشتہ ہفتہ برف پر چلنے والی گاڑی کے معاملہ میں آگے اور پیچھے کا ایک ایسا ناگوار سوال اُٹھا جس سے ہمارا سارا لطف کرکرا ہوگیا۔ لیکن یہ احمق کیا جانیں کہ بزرگی اور عظمت کے میدان میں بازی لیجانے کا معرکہ یہاں گرم نہیں ہوتا اسلئے کہ جو شخص یہاں سیر ہوتا ہے اُس کے حصہ میں شاید ہی لطف و تفریح کا پورا حصہ آتا ہو کتنے بادشاہ ہیں جن پر وزرا حکومت کرتے ہیں اور کتنے وزرا ہیں جن پر اُن کے منشیان کارفرمائی کرتے ہیں! اچھا بتاؤ

ان معاملات میں کون اصلی سردار اور کارفرما ہوا۔ میرے خیال میں تو وہی جو دوسروں کے نقطہ نظر کو سمجھ سکے اور اس بات کی کافی مہارت اور قوت رکھتا ہو کہ اپنے بڑوں کی قوت اور اثر کو اپنے مقصد کی کاربراری میں استعمال کرے۔

۲۰ر جنوری

میری پیاری شارلٹ! میں تمہیں یہ خط ایک ایسے مقام کے دیہاتی سرائے کے ایک کمرہ سے لکھ رہا ہوں جہاں میں نے ایک سخت طوفان سے بھاگ کر پناہ لی ہے۔ میرے سارے زمانہ قیام مقام د میں جہاں میں بالکل غیروں میں رہتا تھا اور بے شک وہ لوگ میرے دل سے بیگانہ تھے مجھے تمہیں خط لکھنے کا کسی وقت ذرا بھی خیال نہیں آیا۔ لیکن اس کاشانۂ قدرت اور اس گوشۂ عزلت میں جب میرے دروازوں کے شیشوں پر شدید ژالہ باری ہو رہی ہے تم گویا میرے پاس ہو۔ جیسے ہی میں یہاں داخل ہوا تمہاری صورت میری آنکھوں کے سامنے آ گئی اور تمہاری یاد پھر تازہ ہو گئی۔ میری پیاری شارلٹ! تمہاری یاد کتنی پاک ہے۔ خدایا! میری اور تیری اُن پہلی اور مسرت بخش صحبتوں کو پھر تازہ کر دے۔ کیا اچھا ہوتا اگر اس اضطراب اور پریشانی میں تم مجھے دیکھتیں۔ میرے تمام احساسات جواب دے چکے ہیں اور میرے دل میں کبھی مسرت کا جوش نہیں اُٹھتا کسی گھڑی مجھے راحت اور آرام نہیں ملتا۔ ہر نقش آرزو میرے سامنے باطل اور دنیا کی تمام دلفریبیاں میرے سامنے بے اثر ہیں گویا میں ایک کٹھ پتلی کے تماشہ کے سامنے کھڑا ہوا کٹھ پتلی کی حرکتیں دیکھ رہا ہوں اور میرے دل میں خیال ہوتا ہے کہ یہ تماشہ گاہ کہیں سراب نظر تو نہیں۔ ہاں ان کٹھ پتلیوں کو دیکھ کر جی ضرور بہل جاتا ہے یا یوں کہو کہ میں بھی انھیں میں سے ایک پتلی ہوں لیکن جب میں اپنے کسی ہمسایہ کا ہاتھ پکڑتا ہوں اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہاتھ قدرتی اور اصلی نہیں تب میں خوف سے اپنا ہاتھ کھینچ لیتا ہوں۔ روز شام کو میں سوچتا ہوں کہ کل سویرے طلوع آفتاب کا تماشہ ضرور دیکھوں گا اور اس سے لطف اُٹھاؤں گا۔ لیکن باوجود ارادہ کے صبح کے وقت بستر پر پڑا رہتا ہوں۔ اسی طرح دن کو یہ ارادہ کرتا ہوں کہ رات کو چاندنی میں پھروں گا مگر جب رات ہوتی ہے تو گھر میں بیٹھ رہتا ہوں۔ مجھے بالکل خبر نہیں کہ پھر آخر میں کیوں اُٹھتا ہوں اور کیوں سوتا ہوں۔ وہ خمیر جس سے میری تعمیر ہوئی ہے اب بالکل بیکار ہو گیا اور فطرت کی وہ دلبستگی

جس سے میں اندھیری راتوں میں خوش رہتا اور صبح سویرے اُٹھ کر ٹہلتا تھا اب غائب ہو گئی ہے اب میرے لئے یہاں ایک ہی دلچسپ چیز ہے اور وہ مس ب کی ذات ہے۔ میری پیاری شارلٹ! اگر کوئی تمہارا مثل ہو سکتا ہے تو وہ مس ب ہیں مگر تم شاید کہو کہ یہ کیسا شخص ہے جو اب تعریفوں کے پل باندھنا سیکھ گیا ہے۔ لیکن یہ ایک طرح صحیح بھی ہے۔ حال میں میری طبیعت میرے افکار کے باوجود ایسی اچھی ہو گئی کہ میں اسکو روک نہ سکتا تھا۔ میری طبیعت میں کچھ مذاق بھی ہے اور یہاں کی عورتیں مجھ سے کہتی ہیں کہ خوشامدانہ باتوں کو مجھ سے زیادہ کوئی نہیں سمجھتا اور تم اس میں شاید جھوٹ کا اضافہ بھی کرو اسلئے کہ خوشامد اور جھوٹ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اب ذرا مس ب کا بھی تھوڑا سا حال سنو۔ فطرت نے اس کی روح میں کافی تازگی عطا کی ہے جو اُس کی نیلی آنکھوں سے نمایاں ہے مگر اپنی حیثیت سے وہ سخت نالاں ہے کیونکہ اسکی کوئی آرزو پوری نہیں ہوتی اور اب تو وہ فیشن کی مصنوعی زندگی سے علحدگی اختیار کرنے کو خوشی سے تیار ہے اور تمہاری اہلیت اور قابلیت کی دل سے قائل ہے۔ وہ تم سے محبت کرتی ہے اور تمہارے متعلق باتوں میں اسکو کافی لطف آتا ہے۔

اے کاش میں اسوقت تمہارے چھوٹے کمرے میں تمہارے قدموں کے پاس بیٹھا ہوتا اور بچے میرے گرد کھیلتے ہوتے اور اگر وہ شرارت کرتے تو میں اُن کو بھوت پریت کے دلچسپ قصے سنا کر اپنے پاس خاموش بٹھا لیتا۔ اُسوقت آفتاب اپنی نارنجی نقاب ڈالے ہوئے بڑے آب و تاب کے ساتھ غروب ہو رہا ہے اور اُس کی آخری کرنیں تمام در و دیوار میدان اور جنگل پر چمک رہی ہیں جو برف سے بالکل سفید ہیں۔ طوفان بھی ختم ہو گیا ہے اور میں بھی اب اپنے تاریک گوشہ کی راہ لیتا ہوں۔ کیا البرٹ اس وقت تمہارے پاس موجود ہے؟ اور وہ تمہارا آخر کون لگتا ہے؟ خدا میرے اس سوال کو معاف کرے۔

۸ر فروری

پچھلے ہفتہ میں موسم بہت خراب تھا لیکن میرے لئے یہ بھی ایک رحمت ہے کیونکہ جب سے میں یہاں ہوں شاید ہی کوئی اچھا دن ہو جب لوگوں کی بیجا آمد و رفت سے باہر جانے کی کوئی نہ کوئی

زحمت درپیش نہ ہوئی ہو۔ بارش کی تیز دھار، گہریا طوفان میں میں اپنے کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ گھر کا حال باہر سے یقیناً بہتر ہے مگر پھر باہر کی بھی کیفیت کسی حد تک گھر سے اچھی ہے۔ ان سب خیالات کے ہجوم کی وجہ سے آخر کار میں قناعت کر کے گھر ہی میں بیٹھا رہتا ہوں۔ صبح کو جب آفتاب اپنی نورانی کرنوں سے عالم کو منور کرتا ہے تو میرے منہ سے ضرور یہ فقرہ نکلتا ہے کہ آج کا دن کیسا خوشگوار ہے اور قدرت کا یہ عطیہ کیسا دلفریب ہے مگر لوگ اسکو یقیناً خراب کر دیں گے اور نہ صرف لوگ خراب کرتے ہیں بلکہ ایسی چیزوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں مثلاً صحت، شہرت، مسرت، تفریح یہ تمام چیزیں اُن کے لئے بے معنی ہیں اور ان تمام خرابیوں کی جڑ اُن کی جہالت، نادانی اور کمزوری ہے جو بقول اُنہیں کے اُن کی نیک نیتی پر مبنی ہے۔ کاش میں اُن سے التجا کر سکتا کہ خدارا اپنے ہاتھ سے اپنے پاؤں میں کلہاڑی مت مارو۔

---

۱۷ فروری

سفیر کے ساتھ میرا رہنا اب مشکل ہی معلوم ہوتا ہے۔ اُسکی حالت اب برداشت سے باہر ہوتی جاتی ہے۔ وہ اس مضحکہ خیز طریقہ سے کام کرنے لگا ہے کہ میں اکثر اسکو ٹوکنے پر مجبور ہو جاتا ہوں اور خود اپنی رائے سے کام کرتا ہوں جس کو وہ محض بیکار سمجھتا ہے۔ حال میں اُس نے دربار میں میری شکایت کی تھی جس پر وزیر نے مجھ کو تنبیہ بھی کی۔ تنبیہ نہایت شائستہ تھی مگر تھی تو آخر تنبیہ اسوجہ سے میں استعفا دینے پر بالکل تیار تھا کہ اسی ضمن میں اُسکا ایک خط آگیا جس کے شریفانہ انداز اور بلند خیالی سے مرعوب ہو کر میں اپنے ارادہ سے باز آیا۔ اس خط میں اُس نے میرے تیز احساس کو کم کرنے کی کوشش اور میری محنت، سرگرمی، جوش اور کام میں میرے انتہائی انہماک کی تعریف کی تھی جو میری جوانی کی قوتوں کا نتیجہ تھا۔ اس جوانا ہمتی کو وہ بجائے مٹانے کے کم کرنا چاہتا تھا تاکہ اسکا بہتر طریقہ سے استعمال ہو سکے۔ ان سب باتوں کی وجہ سے آیندہ ہفتہ تک میں خاموش ہو گیا ہوں اور اب میری اندرونی پرخاش بھی موقوف ہو گئی ہے۔ قناعت اور دماغی سکون کتنی بیش قیمت چیزیں ہیں۔ میرے دوست! کاش ان انمول جواہرات کی بے ثباتی ذرا اور کم ہوتی۔

۲۰ر فروری

میرے دوستو! خدا تم کو اچھا رکھے اور وہ خوشی عطا کرے جس سے اُس نے مجھے محروم کر رکھا ہے۔

البرٹ صاحب! میں آپ کی فریب دہی کا شکر گذار ہوں۔ آپ کی شادی کے مقررہ روز میں آپ کی شادی کی خبر کا انتظار کرتا رہا اور اُس دن میرے جی میں آیا کہ شارلٹ کے رخ کی یکطرفہ تصویر دیوار سے اُتار کر دوسرے کاغذات کے ساتھ دفن کر دوں۔ شارلٹ کی شادی آپ کے ساتھ ہو بھی گئی مگر وہ تصویر اب تک آویزاں ہے۔ اچھا اُسے لٹکی رہنے دو اور آخر وہ کیوں نہ لٹکی رہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میرا شمار اب بھی آپ ہی لوگوں کے ساتھیوں میں ہے اور شارلٹ کے دل میں اب بھی میرے لئے جگہ محفوظ ہے۔ مگر وہ جگہ درجہ دوم کی جگہ ہے تو پھر میں اُسی جگہ پر قائم کیوں نہ رہوں۔ البرٹ! اگر وہ خدانخواستہ مجھے بھول گئی تو میں بالکل پاگل ہو جاؤنگا اور اس خیال سے تو مجھے گویا شعلۂ دوزخ کی لپک محسوس ہوتی ہے۔ الوداع البرٹ۔ میرے جنت کے فرشتے الوداع۔ شارلٹ الوداع۔

۱۵ر مارچ

ابھی ابھی ایک سخت ناگوار اور تکلیف دہ واقعہ پیش آیا ہے جس سے میں اس جگہ کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ میرے صبر کا پیمانہ اب بالکل لبریز ہو گیا ہے اور بس موت —— یہ چیز لاعلاج ہے اور اس کے ذمہ دار صرف تمہیں ہو جس نے مجھ کو اس جگہ پر کام کرنے کے لئے مجبور کیا جسکے لئے میں بالکل موزوں نہ تھا۔ بہر حال مجھے اب ایک طرح کا اطمینان ہو گیا ہے اور تم بھی مطمئن ہو گے۔ تم اس واقعہ کو میری بیقرار اور سیماب آسا طبیعت پر محمول نہ کرو۔ میں تمھارے پاس اس واقعہ کو صاف اور سیدھے سادے رنگ میں لکھ کر بھیجتا ہوں جیسے کوئی واقعہ نگار لکھتا۔

مقام و کا کاونٹ مجھ سے محبت کرتا ہے اور میری عزت کرتا ہے۔ یہ بات عام طور پر سب کو معلوم ہے سیکڑوں بار اس کے بارے میں تم کو لکھ چکا ہوں۔ کل میں نے اسکے یہاں کھانا کھایا اور کل ہی کے دن شام کو اُس کے یہاں رواج کے مطابق اُمراو رؤسا کے جمع ہونے کا دن تھا مجھے اس اجتماع کا بالکل خیال نہ تھا اور یہ بات بھی میرے ذہن سے اُتر گئی کہ ہم ایسے معمولی لوگوں کو اُمرا کے ایسے مجمع میں کہاں بار مل سکتا ہے۔ بہر حال میں نے کاؤنٹ کے ساتھ کھانا کھایا اور کھانے

کے بعد ہم لوگ پاس والے بڑے کمرہ میں چلے گئے اور وہاں بڑی دیر تک ٹہل ٹہل کر باتیں کرتے
رہے اتنے میں کرنل ب آگئے اور وہ بھی گفتگو میں شریک ہوگئے۔ ہم سب لوگ باتیں کر رہے
تھے کہ اجتماع کا وقت آگیا۔ خدا گواہ ہے کہ اسوقت میرے دل میں کوئی خیال نہ تھا کہ اتنے میں
لیڈی س مع اپنے شریف شوہر اور اپنی بیوقوف مگر ساز باز کرنے والی لڑکی کے جسکی کمر پتلی اور
گردن چوڑی تھی داخل ہوئیں اور ایک حقارت آمیز نظر ڈالکر مغرورانہ انداز سے میرے پاس سے گذریں
چونکہ میں اس قسم کے تمام لوگوں سے سخت نفرت کرتا ہوں اسلئے میں فوراً ہی جانے پر تیار ہوگیا
اور اسکا منتظر رہا کہ کاؤنٹ ان لوگوں کی بکواس سے ذرا الگ ہو تو میں اُس سے رخصت ہو کر چلا آؤں۔ اتنے
میں مس ب بھی داخل ہوئیں۔ میں جب اُس سے ملتا ہوں تو مجھے ایک قسم کی دلی راحت ملتی ہے
اسلئے میں ذرا رک گیا اور اسکی کرسی کی پشت پر جھک کر اُس سے باتیں کرنے لگا۔ باتیں کرنے میں
اتنا مشغول تھا کہ مجھے اسکا بالکل پتہ نہیں چلا کہ وہ کچھ گھبرائی سی ہے اور اسی حالت میں اُس نے
اپنی پرانی بے تکلفی سے جواب دینا بھی بند کر دیا۔ اس کے اس رویہ سے مجھے بڑا تعجب ہوا اور میں اپنے
دل میں کہنے لگا کہ خدایا! کیا یہ بھی اوروں کی طرح ہوگئی۔ باوجود اس کے کہ مجھے اس کی اس چال
سے تکلیف ہوئی اور میرے جی میں بھی آیا کہ میں وہاں سے چلا آؤں مگر میں وہاں ٹھہرا رہا اور اس کے اس
نازیبا رویہ کی تاویلیں کرتا رہا اور اس امید میں رہا کہ وہ شاید دوستانہ طریقہ سے مجھے پہچان لے۔ اتنے میں
اس مجمع کے بقیہ لوگ بھی پہنچ گئے۔ اس میں بیرن ف تھا جو اپنے اس زرق برق لباس میں ملبوس
تھا جو پہلی بار فرانسس اوّل کی تخت نشینی کے وقت پہنا گیا تھا۔ چانسلر ن بھی مع اپنی بیوی کے
موجود تھا۔ ان میں مسٹر الف بھی تھے جو بدسلیقگی اور بدتمیزی سے کپڑا پہنے ہوئے تھے۔ اُن کی پرانی وضع کی
کوٹ تازہ مرمت کا پتہ دیتی تھی اور یہ چیز تو انکی تمام بدتمیزیوں سے بازی لے گئی۔ میں نے اپنے چند
ملاقاتیوں سے باتیں کیں مگر ان لوگوں نے بہت مختصر سا جواب دیا۔ اس اثنا میں میں برابر مس ب
کی طرف متوجہ رہا اور کمرہ کے دوسرے کونے میں عورتوں میں جو سرگوشیاں ہو رہی تھیں اُن کو
بالکل نہ دیکھ سکا اور وہ سرگوشیاں بڑھ کر مردوں میں یہاں تک پہنچ گئیں کہ آخر لیڈی س نے
کاؤنٹ کو بڑی تندہی سے مخاطب کیا (مس ب نے ان تمام واقعات کی تفصیل بعد کو مجھے بتائی)

جس پر کاؤنٹ میرے پاس آیا اور مجھے دریچہ کے پاس لیجاکر کہنے لگا کہ آپ شاید ہم لوگوں کے مضحکہ انگیز رواج سے واقف ہوں گے۔ آپ کی موجودگی سے یہ لوگ ناخوش ہوتے ہیں مگر میں کسی طرح بھی....."

میں نے بات کاٹ کر کہا کہ "میں جناب سے معافی مانگتا ہوں۔ مجھے واقعی اسکا پہلے سے خیال رکھنا چاہیئے تھا مجھے اُمید ہے کہ آپ میری اس معمولی عدم توجہی کو معاف کر دینگے۔ میں تو یہاں سے جانے والا تھا مگر میری بدقسمتی کہ میں رک گیا" یہ کہکر میں مسکرایا اور چلنے کے لئے جھک کر آداب بجالایا چلتے وقت اُس نے مجھ سے اسطرح ہاتھ ملایا جس سے ہر قسم کا پہلو نکلتا تھا۔ اس معزز مجمع سے میں نکلکر جلدی سے باہر آیا اور گاڑی میں بیٹھ کر ھم کے مکان پر گیا۔ شام کا وقت تھا۔ راستہ میں پہاڑی کی چوٹی کے پیچھے ڈوبنے والے سورج کا نظارہ بھی کیا دلچسپ تھا۔ پھر میں نے ہومر کے اُس خوبصورت حصہ کو پڑھا جس میں مہمان نواز گلہ بانوں کے یولیسیز (اوڈیلیوس) کی دعوت کرنے کا حال ہے یہ حصہ واقعی بہت خوب تھا۔ رات کو کھانا کھانے گھر آیا۔ کمرہ میں جو دیکھا تو بہت کم لوگ تھے اور جو تھے وہ میز کے ایک کونے کی چادر اُلٹ کر جوئے کھیل رہے تھے۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ مسٹر الف چلے آرہے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی ٹوپی رکھی اور جیسے ہی اُن کی نظر مجھ پر پڑی لپک کر وہ میرے پاس آئے اور آہستہ سے اس ناگوار واقعہ کا ذکر کرنے لگے۔ میں نے چونک کر کہا "میرے ساتھ!" پھر اُنھوں نے کہا کہ کاونٹ نے آپ کو اس جلسہ سے چلے آنے پر مجبور کیا۔ میں نے کہا کہ "ہاں شیطان ہی ہو جو اس جلسہ میں پھر جائے میں تو وہاں سے نکلکر بہت خوش ہوا۔ میں خوش ہوں کہ آپ اس واقعہ کو معمولی خیال کرتے ہیں۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ لوگ اس کے متعلق بہت چہ میگوئیاں کررہے ہوں گے۔ اس سے مجھے سخت تکلیف ہوئی اسواسطے کہ میرے دل میں برابر یہ خیال آتا رہا کہ ہر شخص جو وہاں بیٹھا تھا اور میری طرف دیکھ رہا تھا اس واقعہ پر کیا غور کر رہا ہوگا۔ بس اسی خیال سے تو میرا دل سخت پریشان ہوگیا۔ اور جب میں دیکھتا ہوں کہ تقریباً ہر محفل ہر جلسہ میں میرے ہی حال زار کا ذکر کرکے میرے دشمن اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہیں اور یہ کہکر طعنہ دیتے ہیں کہ بڑے بڑوں کا سر نیچا اور کہتے ہیں کہ جو لوگ، تعلقات، مراسم اور اس قسم کی "احمقانہ" انفرادیوں سے نفرت کرتے ہیں اُن کا یہی حال ہوتا ہے تو اُسوقت جی یہی چاہتا ہے کہ میں اپنے سینہ میں ایک خنجر

چھولوں۔ تم ہمت و استقلال کے متعلق جو چاہو کہو لیکن خدارا مجھے وہ ہستی دکھاؤ جو احمقوں اور بیوقوفوں کی ہنسی صبر کے ساتھ اس حالت میں برداشت کر سکے جبکہ اُن کو اس پر تھوڑی سی فوقیت کسی نہ کسی وجہ سے حاصل ہو گئی ہو۔ ہاں جب اُن لوگوں کی حماقتیں بے بنیاد ہوتی ہیں تو اُن کو بغیر کسی شکایت کے برداشت کیا جا سکتا ہے

---

۱۶ / مئی

ہر چیز نے گویا میرے خلاف سازش کر رکھی ہے۔ آج ٹہلتے ٹہلتے میں مس ب سے ملا اور اسکے ساتھ ہولیا اور جب ہم دونوں ٹہلتے ٹہلتے اُس کے دوستوں سے کچھ دور ہو گئے تو میں نے اُس سے اسکے بدلے ہوئے رویہ پر گفتگو شروع کی۔ اس نے جوش میں آکر جواب دیا کہ ”ورتھر! تم تو میرے دل کا حال جانتے ہو۔ پھر تم کس طرح اس واقعہ کی غلط ترجمانی کرتے ہو۔ جیسے ہی تم کمرے میں داخل ہوئے اُسوقت میں نے کیا کیا آفتیں نہیں برداشت کیں۔ میں یہ سب جانتی تھی اور بار ہا تم سے کہتے کہتے رک گئی۔ میں جانتی تھی کہ خاندان س اور خاندان ٹ کی عورتیں مع اپنے شوہروں کے بجائے تمہارے ساتھ رہنے کے واپس چلا جانا پسند کریں گی اور میں یہ بھی جانتی تھی کہ کاؤنٹ اس معاملہ میں ان سے کوئی خاص تعارض نہ کرے گا۔ اور اب تو اتنی سی بات کا اتنا افسانہ بن گیا ہے۔“ ریڈلین نے کل مجھ سے جو کچھ کہا تھا اسکو میں بڑی تکلیف اور درد کے ساتھ محسوس کرنے لگا اور اسی حالت میں اپنے جذبات کو چھپا کر میں نے اُس سے پوچھا کہ یہ واقعہ آخر افسانہ کیسے بن گیا۔

”اُف! اس کی وجہ سے مجھے اب تک کتنی تکلیفیں اٹھانی پڑی ہیں“ اس اچھی لڑکی کی زبان سے یہ فقرہ اچھی طرح نہیں نکلا تھا کہ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ میں بھی اس نظارہ کی تاب نہ لا سکا اور میرے جی میں آیا کہ اپنے کو اُس کے قدموں پر ڈال دوں پھر میں نے اُس سے پوچھا کہ اس سے تمہارا کیا مطلب ہے۔ اس درمیان میں اس کی آنکھوں سے برابر آنسو بہتے رہے اور میری حالت بھی کسی مجنون کی سی ہو گئی۔ اتنے میں اُس نے اپنے آنسوؤں کو چھپائے بغیر پونچھا اور کہنے لگی کہ ”تم تو میری چچی کو جانتے ہو وہ بھی وہاں موجود تھی اور تم جانتے ہو کہ وہ کس رنگ

میں اس واقعہ کو لیتی ہے ؟ کل رات اور آج صبح میں تمہارے اور اپنے تعلقات پر ایک لکچر اور تمکو بھلا بُرا کہتے ہوئے سننے پر اس طرح مجبور کی گئی کہ میں تمہارے جواب میں نہ تو کچھ کہہ سکتی تھی اور نہ کچھ کہنے کی ہمت کر سکتی تھی۔"

اس کی زبان سے جتنے الفاظ نکلے اس نے میرے دل پر گویا تیر و نشتر کا کام کیا۔ اُس کو کیا معلوم کہ اگر وہ ان باتوں کو مجھ سے پوشیدہ رکھتی تو میرے اوپر کتنا احسان کرتی۔ علاوہ بریں اُس نے مجھے اِن تمام بیہودگیوں اور بدتمیزیوں سے بھی آگاہ کر دیا ہے جو اب "شرافت" کے نام سے کی جائیں گی اور جن کی وجہ سے بدنہاد اور بدطینت لوگ مجھ کو نیچا دکھائیں گے اور میرے وقار کو صدمہ پہنچے اور دوسروں کے ساتھ میرے سرد مہری کے برتاؤ پر جن کا میں اکثر ملزم ٹھہرایا جاتا ہوں، خوشیاں منائیں گے۔ ولہلم۔ ان سب باتوں کو اس کی زبان سے نہایت مخلصانہ اور ہمدردانہ انداز میں سنکر میرے بدن میں غم و غصہ کی اہر دوڑ گئی اور اسوقت بھی مجھ پر وہی ہیجانی کیفیت طاری ہے۔ کیا اچھا ہوتا اگر کوئی شخص اس واقعہ پر مجھے ملامت کرتا تو میں فوراً اپنا غصہ اُتارنے کے لئے اسکی جان ہی لے لیتا اور تب کہیں اُس کے خون کے نظارہ سے میرے غصّہ کے کم ہونے کا امکان ہوتا۔ سیکڑوں بار میں نے خنجر اس نیت سے ہاتھ میں لیا ہے تاکہ اپنے دردرسیدہ دل کی کسک کو کم کروں۔ علم طبیعات کے ماہرین کہتے ہیں کہ عمدہ گھوڑوں کی ایک نسل ایسی بھی ہوتی ہے کہ جب وہ دوڑتے دوڑتے تھک جاتے ہیں تو وہ اپنے دانتوں سے کسی رگ میں خود ہی فصد کھول لیتے ہیں تاکہ سانس آرام و سکون کے ساتھ لے سکیں۔ مجھے بھی اپنی فصد کھولنے کا اکثر خیال ہوتا ہے تاکہ میں اس رنج و مصیبت کی بندشوں سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو جاؤں۔

۲۴ر مارچ

میں نے دربار میں اپنا استعفا داخل کر دیا ہے اور مجھے اُمید ہے کہ منظور بھی ہو جائے گا مجھے اُمید ہے کہ تم مجھے معاف کرو گے کیونکہ اس باب میں میں نے تم سے پہلے کوئی مشورہ نہیں لیا۔ میرے لئے اب اس جگہ سے چلا جانا ازبس ضروری ہوگیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم مجھے یہاں مقیم رہنے کی ترغیب دو گے اور اس لئے ـــــــ یہ خبر میری والدہ صاحبہ کو ذرا نرمی کے ساتھ سنانا

میں یہاں جب اپنے لئے کچھ نہیں کر سکتا تو اس حالت میں اوروں کے لئے بھلا کیا کر سکتا ہوں۔ اس خبر سے والدہ صاحبہ کو ضرور تکلیف ہوگی کہ میں نے اپنی پرانی طرز زندگی کو بالکل ہی کیوں بدل دیا۔ حالانکہ اُس پر اگر میں قائم رہتا تو ترقی کر کے اوّل پریوی کونسلر اور پھر وزیر کے درجہ تک پہونچتا اور اب بجائے آگے بڑھنے کے بار بار پیچھے مڑکر دیکھنا پڑے گا۔ تم جس پیرایہ میں چاہو بحث کرو اور میرے یہاں رہنے کے جتنے وجوہ ممکن ہو سکتے ہیں اُن پہ زور دو مگر اب تو میں یہاں سے جاتا ہوں اور بس اتنا کافی ہے۔ لیکن تم میرے پتہ سے ناواقف نہ رہو اسلئے میں تمکو بتاتا ہوں کہ پرنس —— آجکل یہیں ہیں۔ وہ مجھ سے ملکر بہت خوش ہوئے اور میرے استعفا کا ارادہ سنکر انھوں نے مجھکو اپنے دیہاتی مکان میں آنے اور اپنے ساتھ موسم بہار گذارنے کی دعوت دی ہے۔ اب میں بالکل خود مختار ہوں اور چونکہ ہم دونوں سوائے ایک معاملہ کے سب پر متفق ہیں اس واسطے میرا ارادہ ہے کہ میں اُن کے ساتھ کچھ دنوں قسمت آزمائی کروں۔

---

۱۹ اپریل

تمہارے دونوں خطوں کا شکریہ۔ جواب میں دیر ہوئی اور اس خط کو بھی میں نے اس انتظار میں روک رکھا تھا کہ جب دربار سے جواب آجائے تو بھیجوں۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں میری والدہ وزیر کے پاس اس قسم کی کوئی درخواست نہ بھیجدیں جس سے میرے استعفا میں خلل پڑے لیکن میری استدعا قبول ہوگئی اور میرا استعفا منظور ہوگیا۔ میں یہ نہ بتاؤں گا کہ کتنی مجبوریوں کے ساتھ میرا استعفا منظور ہوا اور نہ یہ بتاؤں گا کہ وزیر نے اس پر کیا لکھا اس لئے کہ تم پھر اپنی وہی پرانی آہ و زاری شروع کردوگے۔ ولیعہد بہادر نے میرے پاس ایک تحفہ قیمتی پچیس ڈوکٹ[1] بھیجا ہے اور اُس کے اس اخلاق سے متاثر ہوکر تو میں رو دیا۔ اچھا مجھے اب ان روپیوں کی ضرورت نہیں رہی بلکہ میں نے والدہ صاحبہ سے مانگا تھا۔

---

۵ مئی

میں کل یہاں سے چلا جاؤں گا اور چونکہ میرا وطن سڑک سے صرف چھ میل کے فاصلہ پر ہے

---

[1] سونے کا ایک سکہ جو تقریباً ۹ شلنگ کے برابر تھا اور پہلے یورپ میں چلتا تھا۔

اس لئے میں وہاں ایک بار اور جاکر اپنے بچپن کے خواب آسا واقعات کی یاد تازہ کرنا چاہتا ہوں میں اُسی دروازہ سے داخل ہوں گا جس سے میں اپنی والدہ کے ساتھ اپنے والد کے انتقال کے قبل جایا کرتا تھا۔ اب والدہ نے یہ مسرت بخش کنج چھوڑ کر معلوم نہیں کیوں تمہارے غم زدہ شہر میں سکونت اختیار کی ہے۔ اچھا میرے دوست الوداع۔ تم میرے آیندہ حالات سنو گے۔

---

۹ رمئی

میں اپنے وطن میں ٹھیک ایک جوش سے معمور زائر کی حیثیت سے گیا تھا اور میرا دل اسوقت بہت سے غیر متوقع جذبات سے لبریز تھا۔ شاہ بلوط کے بڑے درخت کے قریب جو قصبہ سے پون میل کے فاصلہ پر ہے میں گاڑی سے اُتر گیا اور گاڑی کو پہلے ہی بھیج کر خود پیدل چلنے لگا تاکہ بچپن کی بہت سی خوشیوں سے اپنے دل کو پھر سے معمور کروں۔ شاہ بلوط کے نیچے جب پہنچا تو میں کھڑا ہو گیا۔ یہ درخت کسی زمانہ میں میری سیر و تفریح کی حد اور جولانگاہ تھا۔ آف! اب کتنی تبدیلیاں ہو گئی ہیں۔ اس معصومانہ مسرت کے عالم میں میں ایک ایسی نامعلوم دنیا کا مشتاق رہتا تھا جہاں اپنی آرزوؤں اور اُمیدوں کے مطابق ہر قسم کی تفریح و انبساط کا سامان مل سکے اور میرے دوست! اب حالت یہ ہے کہ میں اس خراب آباد سے واپسی پر کتنی نامرادیاں اور ناکامیاں اپنے ساتھ لایا ہوں بچپن میں میں ان پہاڑوں کو کتنے شوق سے دیکھتا تھا جو میرے سامنے دور تک چلے گئے ہیں اور کتنی بار وہ میری دلی تمناؤں کا مرکز رہ چکے ہیں۔ میں یہاں گھنٹوں بیٹھ کر ان کے نظارہ سے لطف اُٹھاتا اور اُن کے درختوں کے سایہ میں پھرنے کی آرزوئیں کرتا اور اکثر ان کی وادیوں میں جو دور سے کتنی دلفریب معلوم ہوتی ہیں گم ہو جانے کی تمنا کرتا۔ جب میری سیر و تفریح کا وقت یا میری چھٹیاں ختم ہو جاتیں تو میں اس خوبصورت خطہ کو بڑی مجبوری کے ساتھ خیر باد کہتا۔ میں قصبہ کے قریب گیا اور اُن پرانے باغوں اور چمنوں کو پہچان گیا جس میں لوگ گرمی کے زمانہ میں رہتے ہیں۔ جو نئے باغات بعد کو بنے تھے وہ مجھے پسند نہیں آئے اور نہ اُن کی تبدیلی میرے دل کو بھائی۔ جوں ہی میں قصبہ میں داخل ہوا میرے تمام پرانے جذبات عود کر آئے۔ میرے دوست! میرے اُسوقت کے محسوسات بڑے دلفریب اور خوش آیند

تھے مگر میں اسوقت ان کی تفصیل میں پڑنا نہیں چاہتا کیونکہ ان کا لطف بیان کرنے سے غائب ہو جائے گا۔ میرا خیال تھا کہ اپنے پرانے مکان کے قریب بازار میں جاکر رہوں لیکن وہاں داخل ہوتے ہی میں نے دیکھا کہ وہ اسکول کا کمرہ جہاں وہ اچھی بڈھی اُستانی ہم لوگوں کو پڑھایا کرتی تھی اب دوکان میں تبدیل ہوگیا ہے۔ وہ کمرہ دیکھتے ہی مجھ کو فوراً وہ وقت یاد آگیا جب میں زبردستی پکڑ دھکڑ کر پہلے پہل پڑھنے کے لئے بٹھایا گیا تھا اور میری روحی تکلیف آنسوؤں کے ذریعہ ظاہر ہوئی تھی۔ ہر ہر قدم پر کوئی نہ کوئی خاص اثر کی ایسی یاد تازہ ہوتی تھی کہ اماکن مقدسہ میں بھی کسی زائر کو اتنے مقامات کا احساس نہ ہوتا ہوگا حالانکہ وہاں کا چپہ چپہ کتنی پراثر یاد سے لبریز معلوم ہوتا ہے اور اس حالت میں اُس زائر کی روح بھی شاید میرے جیسے جذبات شوق سے مملو نہ ہو اس سلسلہ میں ایک واقعہ مثال کے لئے کافی ہوگا۔ میں ایک چشمہ کے کنارے کنارے چل کر ایک کھیت کے پاس آیا جہاں میں پہلے ٹہلا کرتا تھا اور اس جگہ کھڑا ہوگیا جہاں میں اپنے ہمجولیوں کے ساتھ پانی پر بطخیں بناکر تیرایا کرتا تھا۔ ساتھ اپنے بچپن کی یہ بات بھی یاد آئی کہ میں کتنے مستفسرانہ شوق سے اس چشمہ کے بہاؤ کو دیکھتا اور ملک کے اُن حصوں کے متعلق رومانی خیالات قائم کرتا جن میں سے یہ چشمہ بہتا ہوا آگے نکل جاتا ہے۔ اسی حالت میں تھوڑی دیر کے بعد میرے تخیل کی حد ختم ہو جاتی مگر پانی اپنی اسی رفتار سے برابر بہتا چلا جاتا کیونکہ میرا تخیل نامعلوم فاصلہ کے خیال سے منتشر اور پریشان ہو جاتا۔ میرے عزیز دوست۔ میرے آبا واجداد کے خیالات بھی بالکل اسی طرح مسرور اور مقید رہے ہونگے اور اُن کی شاعری اور اُن کے جذبات بھی کمسنی کی خوشبو سے مہکتے ہوں گے۔ یولیسیز جب اس بحر بیکراں اور اس عالم ناپیدا کنار کا ذکر کرتا ہے تو اس کے توصیفی الفاظ بالکل صحیح موثر، قدرتی اور رازدار معلوم ہوتے ہیں معلوم نہیں اس قول میں کونسی کام کی بات پوشیدہ ہے جسکو میں نے اسکول میں اپنے ہم مکتبوں کے ساتھ پڑھا ہے کہ دنیا گول ہے حالانکہ انسان کو خوش رہنے کے لئے بس تھوڑی سی زمین کی ضرورت ہے اور اس کی آخری آرامگاہ کے لئے تو اس سے بھی کم کی ضرورت ہے۔؟

میں آجکل شاہزادہ کے ساتھ اس کے شکاری مکان میں مقیم ہوں۔ واقعی وہ ایسا

شخص ہے جس کے ساتھ آدمی ہنسی خوشی کے ساتھ زندگی گذار سکتا ہے۔ وہ ایماندار ہے اور تصنع سے خالی تاہم اُس کے ساتھیوں میں چند اشخاص ایسے بھی ہیں جن کو میں بالکل نہیں سمجھ سکا نہ تو وہ بیہودے اور بدطینت ہیں اور نہ دیکھنے میں بھلے اور ایماندار ہی معلوم ہوتے ہیں۔ بعض وقت گمان گذرتا ہے کہ وہ لوگ بالکل بھلے مانس ہیں لیکن تب بھی میں اُن کو قابل اعتبار نہیں سمجھ سکتا اکثر مجھے شاہزادہ کی اُن باتوں کے اظہار سے سخت تکلیف ہوتی ہے جن کو اُس نے یا تو کہیں سنی ہیں یا پڑھی ہیں اور جنکو وہ بالکل اسی طرح بیان کرتا ہے جس طرح دوسروں نے اُس سے کہا ہے۔ وہ میری فہم وبصیرت اور قابلیت کا بہ نسبت میرے دل کے زیادہ مداح ہے حالانکہ میں صرف اپنے دل کا دیوانہ ہوں اور سچ پوچھو تو میری کل کائنات یہی ہے۔ ہماری قوت، ہماری مسرت اور ہماری نکبت ان سب چیزوں کا سرچشمہ بس یہی دل ہے۔ میری جیسی علم و دانش تو بہر حال سبھی حاصل کر سکتے ہیں مگر میرا دل تو بس میرا ہی دل ہے۔

---

۲۵ مئی

میرے دماغ میں چند افکار تھے خیال تھا کہ جب وہ بروے کار آجائیں گے تو اُن سے تمہیں آگاہ کرونگا لیکن اب چونکہ وہ ناکام رہے اسلئے تمہیں بتا دینے میں کوئی ہرج نہیں میں فوج میں داخل ہونا چاہتا تھا اور مدتوں سے اس کا شوق بھی تھا۔ شاہزادہ کے ساتھ یہاں آنے کا میرا مقصد خاص یہی تھا اس لئے کہ وہ ——— میں جنرل ہے۔ ایک روز کی سیر میں میں نے اپنا خیال اُس سے ظاہر کیا مگر اس نے اُسے ناپسند کیا۔ درحقیقت اسکی باتوں کو نہ سننا اور اسکے مضبوط دلائل کو نہ ماننا کسی مجنوں ہی کا کام ہوگا۔

---

۱۱ جون

تم خواہ جو چاہو کہو میں اب یہاں نہیں رہ سکتا اور میں اب یہاں کیوں رہوں؟ میں اب تنگ آگیا ہوں۔ حالانکہ شاہزادہ مجھ پر بہت مہربان ہے مگر مجھے یہاں آرام نہیں ملتا۔ مجھ میں اور اس میں کوئی بات ملتی جلتی نہیں ہے۔ وہ صاحب فہم ضرور ہے مگر بہت معمولی قسم کا اسکی باتوں میں مجھے بس اتنی تفریح کا سامان ملتا ہے جتنا میں کسی اچھی لکھی ہوئی کتاب کے

پڑھنے سے حاصل کر سکتا۔ میں زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ یہاں اور رہوں گا اور بعد ازاں اپنے سفر پر چل کھڑا ہوں گا۔ جو تصویریں میں نے یہاں بنائی ہیں وہ میری تمام تصویروں میں بہترین ہیں۔ شاہزادہ کو بھی فنون لطیفہ سے ذوق ہے لیکن اگر وہ اصول و قواعد کی پابندی چھوڑ دے تو اُسکے دماغ میں ترقی کی کافی گنجائش پیدا ہو جائے۔ جب میں اپنے روشن تخیل کی مدد سے فطرت اور فنون لطیفہ کی تفسیر کرتا ہوں، اور اسوقت وہ اپنی عالمانہ رائے پیش کر کے ماہرین فنون لطیفہ کے اصطلاحی الفاظ اناپ شناپ طریقہ پر استعمال کرتا ہے، تو میرے صبر کا پیمانہ اکثر چھلک پڑتا ہے۔

۱۶ر جولائی

اس دنیا میں میں نے پھر راہ پیمائی اور سرگردانی اختیار کی ہے اور بالکل زائر ہو گیا ہوں لیکن تمہیں کہو کہ آخر تم کیا ہو؟

۱۸ر جولائی

یہاں سے اب میں کہاں جاؤنگا؟ میں تم پر یہ راز ظاہر کروں گا۔ میں یہاں دو ہفتہ اور رہنے پر مجبور ہو گیا ہوں اور اس کے بعد میں سوچتا ہوں کہ علاقہ —— کی کانوں کی سیر کرنا میرے لئے بہتر ہوگا۔ لیکن ان سب باتوں سے میں اپنے کو واقعتاً فریب دے رہا ہوں ورنہ اصلیت یہ ہے کہ شارلٹ کی صحبت سے ایک بار اور لطف اُٹھانے کی خواہش ہے اور بس[1]۔ میں اپنے دل کے اس ایما پر مسکراتا ہوں اور اُس کے حکم کی تعمیل کرتا ہوں۔

۱۹ر جولائی

نہیں! نہیں! اب تک ٹھیک ہے۔ سب ٹھیک ہے۔ میں اور اس کا شوہر! —— اے میرے خالق! اے مجھے زندگی کی نعمت سے مالا مال کرنے والے! اگر تو میری قسمت میں یہ خوشی لکھ دیتا تو میں تمام عمر تیری عبادت میں گذارتا لیکن اب میں کوئی شکوہ شکایت نہیں کرونگا میرے ان آنسوؤں کو معاف کر اور میری بیکار خواہشات سے درگذر۔ وہ اور میری بیوی!

---

[1] پھر مجھے پھلا رہیں دیکھو + دل خانہ خراب کی باتیں۔

اف! اس احسن المخلوقات کو سینہ سے لگانے کا خیال! — پیارے ولیلم۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ البرٹ اپنے بازوؤں کو اس کی نازک کمر میں خم کرتا ہے تو میرا سارا جسم تھر تھرا اُٹھتا ہے۔ اور کیا میں تم سے کہہ دوں اور کیوں نہ کہوں کہ وہ بہ نسبت البرٹ کے میرے ساتھ رہکر زیادہ خوش ہوتی۔ البرٹ ایسا آدمی نہیں ہے جو اُس کے دل کی تمام خواہشوں کو پوری کر سکے کیونکہ وہ عشق کی راہ عقل سے طے کرنا چاہتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ چاہتا ہے کہ — مگر ان دونوں کے قالب میں ایک جان نہیں۔ میرے پیارے دوست! بارہا کسی دلچسپ کتاب کا کوئی صفحہ پڑھتے وقت اور سیکڑوں دوسری باتوں میں جب میرا اور شارلٹ کا دل مل جاتا یا جب کسی خیالی افسانہ میں کسی شخص کے متعلق ہم دونوں کے جذبات کا اظہار ہوتا تو میں محسوس کرتا کہ خالق نے ہم دونوں کو ایک دوسرے کے لئے پیدا کیا ہے۔ مگر ولیلم اس کو کیا کیا جائے کہ البرٹ اُس سے بہت محبت کرتا ہے اور پھر کونسا ایسا ثمرہ ہے جو ایسی محبت کا مستحق نہیں۔ میرے کام میں ایک ناگزیر ملاقات سے خلل پڑ گیا ہے۔ میرے آنسو تھم گئے ہیں اور میری خاطر بھی اب جمع ہے۔ میرے عزیز ترین دوست! اچھا الوداع۔

۱۴؍ اگست

دنیا میں میں ہی تنہا بدقسمت اور مصیبت زدہ نہیں ہوں۔ کون ہے جس کی اُمیدوں کا خون نہیں ہوتا اور کون ہے جس کی خواہشات پر پانی نہیں پھرتا! نیبو کے پیڑ کے نیچے میں اپنی اچھی اُوستانی بڑھیا سے مل آیا ہوں۔ اسکا سب سے بڑا لڑکا مجھے دیکھتے ہی میری طرف دوڑا اور اُس کی خوشی کی چیخ سن کر اُس کی ماں بھی نکل آئی جس کے چہرہ پر رنج وغم کے آثار نمایاں تھے۔ اسکا پہلا فقرہ تھا کہ "افسوس میرا چھوٹا جان چل بسا" جان اسکا سب سے چھوٹا بچہ تھا۔ میں یہ خبر سن کر خاموش رہا۔ پھر اُس نے کہا کہ "میرا شوہر حال میں سوئٹزرلینڈ سے خالی ہاتھ واپس آیا ہے اور اگر کچھ مخیر اور نیک لوگوں نے اسکی امداد نہ کی ہوتی تو وہ بیچارہ بھیک مانگ کر کہیں گھر پہنچتا۔ راستہ میں وہ بخار میں مبتلا بھی ہو گیا تھا" اس واقعہ کو سنکر میں خاموش رہا پھر اُس کے چھوٹے لڑکے کو کچھ نکال کر دے دیا بعد ازاں اُس کی

نے مجھے پھلوں کی دعوت دی جس پر میں راضی ہوگیا۔ پھلوں سے فراغت پاکر میں افسردگی کی حالت میں اُٹھا اور چلا آیا۔

---

۲۱ اگست

میرے محسوسات میں برابر تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ بعض وقت تو مجھے مستقبل بہت شاندار اور مسرت آمیز نظر آتا ہے لیکن یہ کیفیت صرف ایک لمحہ تک رہتی ہے۔ جب میں اپنے خیال میں غرق ہو جاتا ہوں تو اُسوقت میں اپنے دل میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر البرٹ مرجائے تو وہ ―― ہو جائیگی اور میں ―― ہو جاؤنگا! اور اس خبط میں میں حیران و سرگرداں ایک اونچی چٹان پر پہنچ جاتا ہوں جس کے کناروں کو دیکھکر وحشت ہوتی ہے۔

جب میں اس دروازہ سے گذرتا ہوں یا اُس رستہ پر چلتا ہوں جس سے میں پہلی بار شارلٹ کے پاس گیا تھا تو میرا دل اپنی موجودہ بدلی ہوئی حالت کو دیکھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اُف، ہر چیز کتنی بدلگئی ہے۔ اب نہ تو میرا دل ویسا رہا اور نہ اب وہ جذبات رہے۔ میرے محسوسات بالکل ایسے مردہ شاہزادے کے سے ہوگئے ہیں جس کی روح اپنے عیش و عشرت کے زمانہ کے بنائے ہوئے اُس خوشنما و آراستہ محل کو دیکھنے آئی ہو جس کو اُس نے مرتے وقت بصد حسرت و یاس اپنے لڑکے کے لئے چھوڑ دیا ہو اور جواب اتنی خراب و خستہ حالت میں پڑا ہو کہ اُس کی ساری شان و شوکت غائب ہوگئی ہو اور اُس کے بڑے بڑے کمرے اور بام و در بے مکیں ہوں۔

---

۳ ستمبر

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کسی دوسرے سے کیسے محبت کر سکتی ہے اور کس طرح محبت کرنے کی ہمت کر سکتی ہے درآنحالیکہ اس دنیا میں مجھے اس سے زیادہ عزیز اور کوئی چیز نہیں اور اس چتر نیلگوں کے نیچے تو میری سب سے بڑی دولت اگر ہے تو وہی ہے۔

---

۴ ستمبر

شاید یہ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے قدرت اب اُس کی بہار کو خزاں سے بدل رہی ہے اسلئے مجھ پر بھی خزاں کا جادو چل رہا ہے اور میرے چاروں طرف خزاں کا رنگ چھا رہا ہے۔ میرے

شجر زندگی کی پتیاں بھی مرجھا کر پیلی پڑ گئی ہیں اور آس پاس کے درخت بھی اپنے پتوں سے خالی ہوگئے ہیں۔ میں نے یہاں آنے کے بعد تم کو ایک کسان کے لڑکے کی بابت لکھا تھا۔ کیا وہ تمہیں یاد ہے؟ والہانہ میں میں نے اُس کے متعلق دریافت کرایا۔ معلوم ہوا کہ وہ برخاست ہوگیا اور اب لوگ اُس سے پرہیز کرتے ہیں۔ کل جب میں پاس کے ایک گاؤں میں جا رہا تھا تو اُس سے سڑک پر ملاقات ہوئی اور میں اُس سے باتیں کرنے لگا۔ اُس نے اپنا سارا قصہ کہہ سنایا۔ اس کا قصہ بہت دلچسپ ہے اور جب میں اس قصہ کو تم سے کہوں گا تو تم خود ہی سمجھ لوگے۔ لیکن میں تمہیں کاہے کو تکلیف دوں! اپنا رنج و غم اپنے ہی تک کیوں نہ محدود رکھوں اور تمہیں فضول کیوں اس بات کا موقعہ دوں کہ تم مجھ پر الزام لگاؤ اور میری ذات کو قابل رحم سمجھو۔ خیر اچھا سنو۔ میرے قسمت کا ایک جزو یہ بھی ہے۔

میرے سوالات کا جواب اوّل اوّل اُس کسان کے لڑکے نے دبی ہوئی غمگین آواز میں دیا۔ جس سے میں نے اُس کو بودا سمجھا لیکن جوں جوں بات چیت بڑھتی جاتی تھی وہ بھی زیادہ بے تکلفی سے باتیں کرتا جاتا تھا اور آخر میں تو اُس نے اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا اقرار کیا اور اپنی بدبختی پر پشیمان ہوا۔ میرے دوست! کاش میں اُس کے الفاظ کو پورے طور پر دہرا سکتا۔ اُس نے مجھ سے اپنے گذشتہ زندگی کے واقعات اس لطف و مسرت سے بیان کیا کہ میری واپسی کے بعد بھی اسکا اس پر اثر باقی رہا اور اُسکا جذبۂ عشق و محبت اتنا تیز ہوگیا کہ وہ اپنے تمام افعال و اقوال اور اپنے مستقبل سے بالکل بیگانہ ہوگیا۔ اس حالت میں نہ تو وہ کھا سکتا تھا نہ پی سکتا تھا اور نہ سو سکتا تھا۔ ہر وقت اس کو ایک حبس دم کی کیفیت بےچین کئے رہتی۔ وہ بڑوں کے تمام احکام کی خلاف ورزی کرتا اور تمام اوامر کو بھول جاتا۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس پر کوئی جن سوار ہے۔ اسی دوران میں ایک روز ایسا ہوا کہ اُس کی محبوبہ اپنے کوٹھے پر چڑھی۔ اُس کو جب معلوم ہوا تو اُس کے پیچھے پیچھے وہ بھی گیا یا یوں سمجھو کہ اس کی طرف راغب ہوا۔ چونکہ اُس کی محبوبہ نے اُس کی تمام التجاؤں اور منتوں کو سنی ان سنی کردیا تھا اس لئے اُس نے مجبوراً جبر سے کام لیا۔ لیکن اس حالت میں اُس کو مطلق خبر نہیں کہ کیا واقعہ پیش آیا مگر اُس نے خدا کو گواہ بنا کر اتنا ضرور کہا کہ میرا ارادہ

اس کی طرف سے اچھا تھا اور میری اس سے زیادہ کوئی خواہش نہیں تھی کہ وہ مجھ سے شادی کرلے اور پھر ہم دونوں ہنسی خوشی زندگی گذاریں۔" جب وہ اپنی داستان بیان کرتے کرتے اس مقام پر پہنچا تو ذرا ہچکچانے لگا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ باتیں ایسی ہیں جن کو ظاہر کرنے کی اس میں ہمت نہیں مگر اُس نے آخر کار پریشانی کے ساتھ اقرار کیا کہ "میری محبوبہ نے مجھکو اپنے غم دل کی داستان کہنے کا تھوڑا سا موقع ضرور دیا اور برائے نام آزادی بھی دیدی تھی۔" اپنے اس قصہ کو وہ دو تین بار درمیان سے کاٹ چکا تھا اور مجھ کو اس بات کا پورا یقین دلا چکا تھا کہ اوسکو بدنام کرنے کا وہ ذرا سا بھی خیال اپنے دل میں نہیں رکھتا کیونکہ اب بھی بدستور سابق وہ اُس سے مخلصانہ طور پر محبت کرتا ہے۔ پھر اُس نے کہا کہ یہ قصہ اس سے قبل میں نے کسی اور سے نہیں کہا اور آپ سے صرف اس لئے کہتا ہوں کہ آپ کو یقین ہو جائے کہ میں بالکل آوارہ و بدمعاش نہیں ہوں۔ میرے دوست! یہاں میں اپنا پرانا راگ جس کو تم جانتے ہو کہ میں برابر الاپا کرتا ہوں، پھر الاپونگا۔ اگر میں اُس شخص کی حالت اچھی طرح لکھ سکتا جیسا کہ وہ میرے سامنے کھڑا تھا یا کھڑا ہے، کاش میں اس کی پوری تصویر کھینچ سکتا تو تم اُس سے ہمدردی کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ لیکن جو کچھ لکھ رہا ہوں اتنا ہی کافی ہے۔ تم چونکہ میری بدقسمتی کی داستان جانتے ہو اور میری طبیعت سے بھی خوب واقف ہو اس لئے تم آسانی سے سمجھ سکتے ہو کہ ہر بدقسمت آدمی سے مجھے کتنا انس ہو جاتا ہے لیکن اس شخص کے ساتھ تو خاص نادرسے ہے جس کا میں نے ابھی واقعہ بیان کیا ہے۔

یہ خط دہرانے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میں اپنے قصہ کا خاتمہ لکھنا بھول گیا۔ لیکن یہ کمی آسانی سے پوری ہو سکتی ہے۔ وہ محبوبہ اپنے بھائی کے ایما سے اس عاشق جانباز کی طرف سے بے پروائی برتنے لگی اور اسکا بھائی تو اُس سے بہت دنوں سے نفرت کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ اُس کو گھر سے نکال دے اس لئے کہ وہ ڈرتا تھا کہ اگر اُس کی بہن نے دوسری شادی کی تو خود اُس کے لڑکے جائداد سے محروم ہو جائیں گے کیونکہ اس کی بہن لاولد ہے۔ بہرحال وہ نوکر نکال دیا گیا اور اس سارے معاملہ سے اتنی رسوائی و بدنامی ہوئی کہ اگر وہ چاہتی بھی تو اُس

نوکر کو واپس نہیں بلا سکتی تھی۔ اب اُس نے دوسرا نوکر رکھ لیا ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ اس نوکر سے بھی اس کا بھائی اسی طرح ناراض ہے کیونکہ اس سے بھی وہ شادی کرنا چاہتی ہے لیکن میرے اطلاع دینے والے کا بیان ہے کہ وہ نوکر خود ایسی مصیبت کے بعد زندہ رہنے کیلئے تیار نہیں۔

اس قصہ میں نہ تو حاشیہ آرائی کی گئی ہے اور نہ نمک مرچ لگائی گئی ہے البتہ میں نے سوسائٹی کے عمدہ اور مروجہ الفاظ میں اس قصہ کو بیان کرکے اسکا زور کم کر دیا ہے۔ محبت کی یہ داستاں اُلفت کا یہ کارنامہ اور عشق کی یہ پائداری کوئی شاعرانہ سحر طرازی نہیں بلکہ یہ بالکل حقیقی چیز ہے اس کا اثر اپنے اصلی اور صاف رنگ میں صرف اُنھیں لوگوں میں پایا جاتا ہے جنکو ہم غیر تعلیم یافتہ اور وحشی کہتے ہیں۔ ذرا ہم لوگوں کو تو دیکھو کہ ہم لوگ اپنے کو تعلیم یافتہ کہتے ہیں مگر لطف یہ ہے کہ گمراہ نہیں کہتے! میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ اس قصے کو غور سے پڑھو۔ آج میری طبیعت میں سکون ہے اسواسطے کہ میں آج یہ قصہ لکھتا رہا اور تم خود میری تحریر سے اندازہ کر سکتے ہو کہ میں روز کی طرح آج پریشان خاطر نہیں ہوں۔ ولیلم! اس قصہ کو پڑھو اور بار بار پڑھو۔ یہی تمہارے دوست کی بھی کہانی ہے۔ میری حالت بھی بالکل اس قصہ کی طرح رہی ہے اور رہے گی۔ لیکن میں اس غریب اور بدبخت سے اپنا مقابلہ کرتے ہوئے ہچکچاتا ہوں کیونکہ اسکی جرأت اور عزم کا آدھا حصہ بھی مجھ میں نہیں۔

---

۵ ستمبر

شارلٹ نے اپنے شوہر کو اس قصبہ میں ایک خط بھیجا تھا جہاں وہ کسی کام کی وجہ سے رکا ہوا تھا۔ وہ خط اسطرح شروع ہوا تھا "میری جان سے زیادہ عزیز! جتنی جلدی ممکن ہو چلے آؤ۔ میں سیکڑوں بیقرار آرزوؤں اور ہزاروں بیتاب تمناؤں کے ساتھ تمہاری منتظر ہوں"

اسی روز ایک صاحب البرٹ کا یہ پیغام لائے کہ چند وجوہ کی بنا پر وہ ابھی واپس نہیں آسکتا اسلئے شارلٹ کا خط بھیجا نہیں گیا اور اسی روز شام کو میرے ہاتھ لگا۔ میں اُسے پڑھکر مسکرا دیا جب شارلٹ نے مجھ سے مسکرانے کی وجہ دریافت کی تو میں بول اُٹھا کہ "تخیل بھی فطرت کا کیسا عجیب عطیہ ہے۔ میں تو خط دیکھ ایک لمحہ تک یہی سوچتا رہا کہ یہ خط مجھ ہی کو لکھا گیا ہے"

اس پر وہ کچھ ناراض سی ہوئی اور میں خاموش ہو رہا۔

۶ر ستمبر

شارلٹ کے ساتھ پہلی بار جس نیلی کوٹ کو پہن کر میں نے رقص کیا تھا اُس کی جدائی مجھ پر بہت شاق گذری لیکن اب میں اس کو پہن بھی نہیں سکتا۔ البتہ میں نے اب ایک نئی کوٹ بالکل اُسی طرح کی سلوائی ہے جسکا کالر اور آستین بالکل اُسی کے مشابہ ہیں۔ نئی واسکٹ اور پتلون بھی ویسا ہی ہے لیکن اس نئی کوٹ سے نہ معلوم میرے اوپر پہلی کوٹ کا سا اثر نہیں پڑتا۔ ممکن ہے آیندہ چلکر میں اس کوٹ کو زیادہ پسند کرنے لگوں۔

۱۲ر ستمبر

شارلٹ کئی روز سے موجود نہیں تھی وہ البرٹ سے ملنے گئی تھی۔ آج اُسکی آمد پر میں اُس سے ملنے گیا وہ میرے استقبال کے لئے کھڑی ہوگئی اور میں نے بھی اس کے ہاتھ کو بڑے شوق سے بوسہ دیا۔ اتنے میں جزیرہ کنیری کا ایک طوطا جو آئینہ کے اوپر بیٹھا تھا وہاں سے اُڑ کر شارلٹ کے کاندھے پر بیٹھ گیا۔ شارلٹ نے اسکو کاندھے پر سے اُتار کر ہاتھ پر بٹھایا اور بولی کہ "لو یہ ایک نیا ساتھی ہے۔ ایک صاحب نے بچوں کے واسطے تحفتاً بھیجا ہے۔ ذرا دیکھو تو کتنا پیارا ہے۔ جب میں اس کو کھلاتی ہوں تو وہ اپنے پروں کو پھڑ پھڑاتا ہے اور خوب چگتا ہے اور مجھے بوسہ بھی دیتا ہے ذرا دیکھو.....!۔

یہ کہہ کر وہ اس طوطے کو اپنے چہرہ تک لے گئی یہاں تک کہ اُس نے اپنی خوشنما چونچ سے شارلٹ کے دونوں لبوں کو اتنے شوق سے دبایا کہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کو بھی لطف آرہا ہے۔ اس طوطے کو میری طرف بڑھا کر اُس نے کہا کہ یہ تم کو بھی اسی طرح بوسہ دیگا۔ یہ کہنا تھا کہ اُس کی چونچ اُس کے نازک لبوں سے میرے لبوں تک بڑھی اور اس وقت کا احساس نہ پوچھو! گویا یہ احساس کسی آنے والی خوشی کا پیش خیمہ معلوم ہوتا تھا۔

میں نے کہا کہ صرف ایک بوسہ سے اُس کی بھلا کیا سیری ہوگی۔ اس کو خوراک کی ضرورت ہے اور اس قسم کے بے معنی پیار سے اُس بیچارہ کا کیا پیٹ بھرے گا! اس پر شارلٹ بولی "نہیں

نہیں ؟ وہ میرے منہ میں سے کھاتا ہے" اور یہ کہہ کر اُس نے اپنی زبان نکالی جس پر کچھ دانے نظر آتے تھے۔ پھر وہ بڑے ناز و انداز سے اس طرح مسکرائی جیسے کوئی کسی معصوم ہستی کے دامن محبت کی ہوا پاکر مسکراتا ہو۔ یہ منظر دیکھ کر میں نے اپنا رخ پھیر لیا کیونکہ میرے سامنے اس کو ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہیئے تھا اور نہ اس قسم کی معصومانہ اداؤں اور مسرتوں کا جلوہ دکھاکر میرے تخیل کو چھیڑنا چاہیئے تھا اور نہ میرے دل کو اُس نیند سے جگانا چاہیئے تھا جس میں وہ زندگی کی بے قدری اور بے وقعتی کا خواب دیکھ رہا تھا مگر سوال یہ ہے کہ آخر اُسکو کیوں نہ ایسا کرنا چاہیئے تھا، اسلئے کہ وہ خوب جانتی ہے کہ میں اُس سے کتنی محبت کرتا ہوں۔

---

۱۵ ار ستمبر

والہلم! اس خیال سے مجھے سخت تکلیف ہوتی ہے کہ دنیا میں ایسے آدمی بھی ہیں جو ان چند چیزوں کی قدر نہیں کر سکتے جن میں واقعی زندگی کی قیمت پوشیدہ ہے۔ تم کو مقام س کے اخروٹ کے درخت یاد ہوں گے جس کے نیچے میں شارلٹ کے ساتھ اسوقت بیٹھا کرتا تھا۔ جب میں بڈھے پادری سے ملنے جاتا۔ وہ درخت کتنے شاندار تھے اور اُن کے نظارہ سے میرا دل بارہا مسرور ہوا۔ وہ درخت اپنی پھیلی ہوئی شاخوں سمیت پادری کے مکان کے صحن کی زینت تھے اور دل کو کتنی تازگی بخشتے تھے۔ اُن کے دیکھنے سے اُس بڈھے پادری کی یاد آتی جس نے اسکو سالہا سال قبل اُگایا تھا۔ قصبہ کا اسکول ماسٹر بھی اُس پادری کا نام اکثر لیتا ہے جسکو اُس نے اپنے دادا سے سنا۔ وہ پادری واقعی ایک اچھا آدمی رہا ہوگا اور پرانے درختوں کے نیچے میں اکثر اسکی یاد احترام کے ساتھ تازہ کرتا ہوں۔ کل اسکول ماسٹر نے آنکھوں میں آنسو بھر کر مجھے اطلاع دی کہ وہ درخت کاٹ دیئے گئے ہیں اور جڑ سے کاٹ دیئے گئے ہیں۔ مجھے یہ سنکر اتنا طیش آیا کہ اگر اُس حالت میں مجھے وہ بدبخت شخص ملتا جس نے اس پر پہلی ضرب ماری ہے تو میں اُسکو منہ ہی ڈالتا لیکن اب کیا کروں سوائے صبر کے کوئی چارہ نہیں۔ اگر میرے مکان کے سامنے ایسے درخت ہوتے اور اُن میں سے ایک پرانا ہو کر خشک ہو جاتا تو میں اُس کی جدائی میں دل کھول کر روتا۔ ہاں اگر کچھ تسلی ہے تو فقط اتنی بات سے ہے اور یہ چیز شاید خیال ہوتی ہے،

کہ سارا قصبہ ان درختوں کی جدائی پر غمگین ہے اور میرے خیال میں پادری صاحب کی بیوی کو جلد قصبہ والوں کی طرف سے ہر قسم کے تحفہ تحائف بند ہو جانے کی شکل میں معلوم ہو جائیگا کہ اُس نے یہ حرکت کرکے قصبہ والوں کے دلوں پر رنج و غم کا کتنا زبردست آرا چلایا ہے۔ یہ سارے کرتوت اُسی پادری کی بیوی کے ہیں جو آجکل یہاں پادری ہے۔ وہ درختوں کا لگانے والا بیچارہ بڈھا پادری تو مدت ہوئی اس عالم فانی کو خیرباد کہہ چکا۔ یہ پادری کی بیوی طول قد اور نزار جسم رکھتی اور دنیا والوں سے بے پروائی برتنے میں بالکل حق بجانب ہے اسلئے کہ دنیا والے بھی اُس کو کب خیال میں لاتے ہیں۔ اس پر اس احمق کو تو دیکھو کہ وہ اپنے کو بڑی عالم فاضل سمجھتی ہے اور مذہبی کتابوں پر جرح کرتی ہے اور عیسائیت کی اخلاقی و عقلی اصلاح کی جو ہوا چلی ہے اُس میں خواہ مخواہ بھی ٹانگ اڑاتی ہے اور جب لاواٹر[1] کے جوش و خروش کا ذکر ہوتا ہے تو اُس پر برہم ہوتی ہے۔ اُس کی صحت خراب ہو چکی ہے اس لئے اسکو دنیا کی بات میں لطف نہیں آتا۔ یقیناً ایسا ہی شخص میرے درختوں کو کاٹ سکتا تھا اور میں تو اس کو کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ ذرا اس کے بے معنی وجوہ کو تو سنو۔ وہ کہتی ہے کہ پتیوں کے گرنے سے سامنے کی ساری جگہ گندی اور نم ہو جاتی تھی۔ شاخوں سے روشنی رکتی تھی اور جب اخروٹ پکتے تھے تو لڑکے اُن پر ڈھیلا مارتے تھے اور اس تمام شور و شغب سے اُسکے اعصاب پر بُرا اثر پڑتا تھا جس سے اُس کے دماغ کی یکسوئی میں اس وقت خلل پڑتا جب وہ کینی کوٹ، سیملر، اور مائیکیلس کے مابین موازنہ کرتی۔ قصبہ کے سارے لوگ خاصکر بوڑھے اُس کی اس حرکت سے بہت ناخوش ہیں۔ میں نے پوچھا کہ جب لوگ اتنا ناخوش ہیں تو پھر اُس کو کاٹنے ہی کیوں دیا گیا۔ اس پر لوگ بولے کہ ہم گاؤں کے غریب کسان گرجا کے منیجر کے حکم پر کیا چون و چرا کر سکتے تھے۔ لیکن ایک چیز خوب ہوئی یعنی گرجا کے منیجر اور پادری (جس نے سوچا تھا کہ اپنی بیوی کی تلون مزاجی سے فائدہ اُٹھائے) دونوں نے طے کیا تھا کہ درخت کی لکڑی آپس میں بانٹ لیں گے مگر حکومت کے محکمہ مال کو اسکی خبر لگ گئی

---

[1] جان لاواٹر (۱۷۴۱ – ۱۸۰۱) شہر زیورچ میں پادری تھا اور آخر عمر تک عیسائی مذہب پر کتابیں لکھتا رہا۔ بڑا پرجوش مقرر اور صاحب قلم تھا اس کے بعض مضامین سے مذہبی حلقوں میں ایک تہلکہ پڑ گیا تھا۔ مذہب کے ساتھ ساتھ علم قیافہ کا بڑا ماہر تھا۔ اور اس سلسلہ میں اُسکی جو تصنیف ہے اس میں ایک باب گوئٹے کا لکھا ہوا ہے جس سے پتہ چلتا ہے

اور اُس نے اس زمین کے متعلق جس پر یہ دونوں درخت کھڑے تھے اپنا پرانا دعویٰ پھر تازہ کیا اور اُن درختوں کو نیلام کر دیا۔ وہ درخت اب تک اُسی جگہ پڑے ہوئے ہیں۔ اگر میں بادشاہ ہوتا تو میں ان سبھوں کی خوب خبر لیتا۔ یعنی پادری۔ منیجر اور محکمہ مال کی۔ کیا میں نے بادشاہ کا لفظ اپنے لئے استعمال کیا ہے لیکن اگر میں بادشاہ ہوتا تو مجھے گانوں کے درختوں کا خیال بھی نہ ہوتا۔

---

۱۰ اکتوبر

بس میری ساری خوشی اسکی سیاہ اور رسیلی آنکھوں کو دیکھنے میں ہے۔ مگر مجھے جس بات سے تکلیف ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ البرٹ اتنا خوش نہیں ہے جتنا — کہ اسکو خیال تھا — یا جتنا میں خوش ہوتا — اگر — مجھے آخر ان وقفوں سے کیا مطلب! مگر میں یہاں کچھ لکھ بھی تو نہیں سکتا اور شاید میں یہاں کافی کھل کر لکھ گیا ہوں۔

---

۱۲ اکتوبر

میرے دل میں اب بجائے ہومر کے اوسیان نے جگہ لے لی ہے۔ دنیائے شاعری کا وہ نامور شخص مجھے اپنی سحر طراز شاعری سے معلوم نہیں کس کس عالم کی سیر کراتا ہے۔ دشوار گذار جنگلوں میں پھرنا جہاں سخت طوفانی ہوائیں چل رہی ہوں اور جہاں چاند کی دھیمی روشنی میں ہم کو اپنے آباؤ اجداد کی روحیں نظر آتی ہوں یا پہاڑ کی چوٹیوں سے پانی کی موسلا دھار بارش میں غاروں سے بلند ہونے والے نالوں کو سننا یا دوشیزہ کے اُس نوحہ و ماتم پر کان دھرنا جسکو اپنے بہادر اور جانباز عاشق کی سبزپوش قبر پر کرتے کرتے وہ دنیا سے کوچ کر گئی ہو، یہ سب نیرنگیاں اوسیان ہی میں ملتی ہیں۔ جب میں اُس سفید بالوں والے مغنی سے ملتا ہوں تو وہ وادی میں گھوم گھوم کر اپنے آباؤ اجداد کے نقش قدم تلاش کرتا ہے لیکن افسوس اُسکو بجائے نقش قدم کے ان کی خاک کا ڈھیر ملتا ہے۔ پرشور سمندر کی موجوں کے نیچے ڈوبنے والے زرد چاند کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے سے اُس کو اگلے زمانہ کا خیال آتا جب خطرہ کی آمد لوگوں کو بہادر بنا دیتی تھی۔ اور چاند کی وہ روشنی بھی کیسی پرکیف ہوتی جو اُس کشتی پر پڑتی جو مال غنیمت سے لدی ہوئی

کہ گوئٹے لاواٹر کا بڑا دوست تھا۔ اُسکو تصوف سے بھی دلچسپی تھی اور اس مضمون پر اس کی تصانیف ہیں۔

فتح کی خوشی میں لہروں پر اُچھلتی ہوئی چلی آتی تھی۔ جب میں اُس کے چہرہ پر تفکر اور حزن کے شدید آثار پاتا ہوں یا میں اُس کی شان و شوکت کو واماندہ اور خستہ ہو کر فنا ہوتے اُسوقت دیکھتا ہوں جب وہ اپنی معشوقہ کے ساتھ عنقریب اختلاط کرنے کی اُمید میں ایک نوائے سینہ تاب سے اپنے عشق کی حرارت کو تازہ کرنا چاہتا ہے اور پھر سرد مٹی اور لمبی گھاسوں پر نظر ڈال کر جو بہت جلد اس کو زمین میں چھپا دینگی چیخ کر کہتا ہے کہ مسافر آئیگا، وہ آئیگا جس نے میرا حسن دیکھا ہے اور پھر پوچھے گا کہ مغنی کہاں ہے؟ فنگل کا وہ نامور فرزند کہاں ہے؟ مگر بجائے مجھکو پانے کے وہ میری خاک پر چلے گا، مجھکو تلاش کرے گا اور نہ پائیگا، تو میرے دوست! یہ سب دیکھ کر میرا جی یہی چاہتا ہے کہ کاش ایک سچے بہادر اور شریف سپاہی کی طرح میں اپنی تلوار کھینچ سکتا اور شاہزادہ کو زندہ موت کی طوالت اور دردناک خستگی سے نجات دلاتا اور خود اپنی روح اس جلیل القدر ہستی کی پیروی کے لئے آزاد کرتا جسکو میرے ہاتھوں نے مصیبت سے چھڑایا ہے۔

---

۱۹ اکتوبر

افسوس! خالی —— میرا سینہ مجھے خالی معلوم ہوتا ہے بعض وقت میں سوچتا ہوں کہ اگر ایک بار بس صرف ایک بار میں اُس کو سینہ سے لگا لیتا تو یہ ہیبتناک خلا بھر جاتا۔

---

۲۶ اکتوبر

ہاں ولہلم! مجھے یقین ہے اور روز بروز میرا یقین پختہ ہوتا جاتا ہے کہ ہستی خواہ کسی کی بھی ہو بالکل بے سود ہے۔ ابھی ابھی شارلٹ کی ایک دوست اُس سے ملنے آئی تھی میں اسوقت پاس والے کمرہ میں چلا گیا اور ایک کتاب اُٹھا کر پڑھنے لگا۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ پڑھنے میں میری طبیعت بالکل نہیں لگتی تھی میں نے لکھنا شروع کردیا۔ میں دونوں کی گفتگو سنتا جاتا تھا۔ دونوں معمولی معمولی چیزوں کے متعلق گفتگو کرتی رہیں۔ زیادہ مضمون قصبہ سے متعلق تھا۔ یعنی ایک کی شادی ہو رہی ہے دوسرا بیمار ہے اور بہت بیمار ہے، تیسرے کو خشک کھانسی آتی ہے اور اُسکا چہرہ روز بروز دبلا ہوتا جاتا ہے اور اکثر دورہ بھی ہوتا ہے۔ شارلٹ بولی کہ "ہاں ن بھی بہت بیمار ہے" اس پر اس عورت نے کہا کہ "اب تو اُسکے بازو بھی سوج آئے ہیں" یہ باتیں سنکر میرا

تیز پروازِ تخیل مجھے فوراً بیماروں کی چارپائیوں کی طرف لے گیا جہاں میں ان ناتوانوں کو درد اور کرب کی حالت میں موت سے کشتی لڑتے دیکھتا رہا۔ مگر ولہلم، یہ عورتیں ان سب باتوں کا ایسی سادہ دلی سے ذکر کرتی ہیں جیسے کوئی کسی اجنبی کی موت کا حال بیان کرے۔ جب میں اس کمرہ کے چاروں طرف جہاں میں اسوقت بیٹھا ہوا ہوں، دیکھتا ہوں اور سامنے شارلٹ کے کپڑے البرٹ کی تحریریں اور سارا اثاث البیت یعنی قلمدان تک جس کو میں اسوقت استعمال کر رہا ہوں، دیکھتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ میرا اس خاندان سے کیا تعلق ہے، تو میرے دوست! یقین مانو میں ان چیزوں کی خوشی اور مسرت کو (اگر ان چیزوں کا خوش ہونا ممکن ہے)، بڑھاتا ہوں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا دل بغیر ان سب چیزوں کے حرکت نہیں کرسکتا لیکن اسکے باوجود مان لو اگر میں مر جاؤں یا ان چیزوں کے درمیان سے ہٹا دیا جاؤں تو وہ کیا میری جدائی محسوس کرینگے اور آخر کب تک میری عدم موجودگی کا خیال کرینگے، آخر کب تک؟ ہاں انسان کی ناتوانی اور بیکسی کا یہی حال ہے کہ جہاں اُس کو اپنی ہستی کا سب سے زیادہ احساس ہوتا ہے یا جہاں وہ سب سے قوی اور استوار اثر ڈالتا ہے خواہ وہ اُس کے معشوقہ کے دل اور حافظہ ہی پر کیوں نہو، وہاں اسکو فنا کا جام پینا پڑتا ہے اور جلدی پینا پڑتا ہے۔

---

۲۰ اکتوبر

کاش میں اپنے سینہ کو چیر کر دکھا سکتا کہ ہم لوگ ایک دوسرے کے جذبات پر بالکل اثر نہیں ڈال سکتے۔ اگر مجھ میں فطری طور پر عشق و محبت، عیش و عشرت، انبساط و مسرت کے جذبات حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں ہے تو کوئی شخص ان چیزوں کو مجھ میں پیوست نہیں کرسکتا اور اسی طرح یہ بالکل ممکن ہے کہ میرا دل محبت و رافت کے پرتو سے چمکتا ہو مگر میں اس حرارت کو کسی ایسے شخص کے اندر نہیں داخل کرسکتا جس کو فطرت نے اس سے محروم کر رکھا ہو۔

---

۲۷ اکتوبر بوقت شام

میں اتنی چیزوں کا مالک ہوں لیکن اُس کے عشق نے مجھ پر سب چیزیں حرام کر رکھی ہیں۔ میرے پاس بہت کچھ ہے لیکن بغیر اُس کے کیا ہے! کچھ نہیں!

۳۰ اکتوبر

سیکڑوں دفعہ میں اُسے سینہ سے لگاتے لگاتے رہ گیا۔اُف! میری حالت کتنی دردناک ہے کہ میں ایسی خوبصورت ہستی کو اپنے سامنے بار بار گذرتے دیکھتا ہوں مگر اُسے چھو نہیں سکتا حالانکہ چھونا انسان کی جبلت میں بڑی حد تک سرایت کئے ہوئے ہے۔کیا بچے ہر اس چیز کو نہیں چھوتے جس کو وہ دیکھتے ہیں۔— لیکن میں!

---

۳ نومبر

خدا گواہ ہے کہ میں کتنی بار رات کو بستر پر لیٹ کر خیال نہیں بلکہ یہ اُمید کرتا ہوں کہ اب میں دوبارہ بیدار نہ ہوں لیکن صبح کو جب آنکھ کھلتی ہے تو وہی زمین، وہی آسمان، وہی سورج اور وہی جہان دیکھتا ہوں اور پھر اسی بدبختی کی دنیا میں آجاتا ہوں۔اگر میں وہمی ہوتا تو اپنی بیزار اور طبیعت کا سارا الزام موسم کی خرابی یا کسی کی ملاقات یا پھر کسی ذاتی ناکامی پر رکھتا اور نب درد و کرب کا یہ ناقابل برداشت بوجھ صرف میری ذات پر نہ پڑتا۔لیکن افسوس! میں اُس چیز کو اب رنج کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کیونکہ اپنی تمام مصیبتوں اور آفتوں کا ذمہ دار تنہا میں ہی ہوں۔اس حقیقت کو کون جھٹلا سکتا ہے کہ میرا ہی سینہ آج میرے تمام درد و الم کا خزینہ ہے حالانکہ یہی کبھی میری تمام خوشیوں اور مسرتوں کا گنجینہ تھا۔کیا میں وہی نہیں ہوں جو کبھی ہنسیوں سے کھیلتا اور خوشیوں سے دو چار ہوتا اور جس کے قدم کے نیچے بہشت تھی اور جسکا دل اتنا وسیع تھا کہ ساری دنیا اس میں سما سکتی تھی۔لیکن آج یہ مردہ ہے۔کوئی جذبہ اس میں روح نہیں پھونک سکتا۔میری آنکھوں کا دوآبہ بھی بالکل خشک ہے۔سسکیوں سے میرے احساس کی آبیاری اور شادابی کا دور ختم ہو گیا۔میری آہیں اب دماغ کو بالکل سوختہ نہیں کرتیں۔سچ تو یہ ہے کہ میں بڑی تکلیف میں مبتلا ہو گیا ہوں کیونکہ میری زندگی کا لطف چلا گیا۔وہ متحرک اور مقدس قوت جو میرے لئے دنیائیں تعمیر کیا کرتی تھی اب بالکل سرد ہو گئی ہے۔جب میں اپنی کھڑکی سے دور کی پہاڑیاں اور صبح کے وقت سورج کو کہر میں سے نکلتے اور تاریک اور خاموش عالم کو منور کرتے دیکھتا ہوں یا چشمہ کو نرکل

کے درمیان سے جس کی پتیاں جھڑ گئی ہیں آہستہ آہستہ بہتے دیکھتا ہوں یا جب قدرت کی نیرنگیاں اپنے تمام خوبصورت مناظر میرے سامنے پیش کرتی ہیں مگر اس کی دلفریبیاں میرے بجھے ہوئے دل سے شوق اور اضطراب کے آنسوؤں کا ایک قطرہ بھی نہیں نکال سکتیں تو اُسوقت مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میں گویا ایک سخت دل، بےحس اور بےشرم مجرم ہوں جو فطرت کی عدالت کے سامنے کھڑا ہوا ہے۔اس حالت میں اکثر میں زمین پر جھک کر خدا سے آنسوؤں کے لئے بالکل اسی طرح دعائیں مانگتا ہوں جسطرح ایک نااُمید کسان کسی گرم ملک میں اپنی جلی ہوئی کھیتی کے لئے باران رحمت کی خاطر دعائیں مانگتا ہے۔ میرے خیال میں خدا ہماری الحاح و زاری کے بنا پر نہ تو پانی برساتا ہے اور نہ دھوپ کرتا ہے۔ پچھلے دلوں کے خیال سے مجھے بہت پریشانی رہا کرتی ہے کہ آخر میں اسوقت کیوں اتنا خوش قسمت تھا؟ بات یہ تھی کہ اس وقت میں خدا کی رحمت کا انتظار صبر کے ساتھ کرتا اور اُسکی نعمتوں کا صدق دل سے شکریہ ادا کرتا تھا۔

۸ر نومبر

شارلٹ میری زیادتیوں کی اصلاح بڑی محبت سے کرتی ہے۔ حال میں میں نے معمول سے زائد شراب پینا شروع کر دیا ہے۔ اس پر اُس نے مجھ سے کہا کہ "دیکھو شراب زیادہ نہ پیو۔ بلکہ شارلٹ کا خیال کرو"۔ جواباً میں نے کہا کہ "تمہارا خیال! ایسی نصیحت کی ضرورت ہی کیا تھی کیا میں تمہارا ہمیشہ خیال نہیں کرتا اور سچ پوچھو تو میرے خیالات خود میرے نہیں ہوتے بلکہ تم خود میری زبان بنکر بولتی ہو۔ آج ہی صبح میں اس جگہ بیٹھا تھا جہاں چند روز پیشتر تم گاڑی سے اُتری تھیں"۔ یہ سنکر اُس نے گفتگو کا مضمون فوراً بدل دیا تاکہ میں اسپر زیادہ بات چیت نہ کروں۔ میرے عزیز دوست! میری قوت عمل بالکل سرد ہوگئی ہے اور میری حالت یہ ہے کہ میں ہر طرح اُس کے فرمان کا تابع ہوں۔ می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست۔

۱۵ر نومبر

ولہلم! میں تمہاری دلی ہمدردی اور تمہاری عمدہ نصیحتوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں مگر تم سے درخواست بھی کرتا ہوں کہ خدا کے واسطے خاموش رہو اور مجھے میری مصیبتوں پر چھوڑ دو

اپنی سیہ بختی اور شوریدگی کے باوجود مجھ میں برداشت کی کافی قوت ہے تم جانتے ہو کہ میں مذہب کا قائل ہوں۔ میرے خیال میں مذہب ہی ایسی چیز ہے جو کمزور کو قوت، ناتواں کو توانائی بخشی اور مصیبت زدہ کو تسلی دیتی ہے مگر کیا مذہب ہر شخص پہ برابر برابر اپنا اثر ڈالتا ہے؟ اگر اس عالم کی وسعت دپہنائی پہ غور کرو تو تم کو معلوم ہو گا کہ سیکڑوں ایسے ہیں جن کے لئے مذہب کا نام بے معنی ہے خواہ ان کے سامنے تبلیغ کی جائے یا نہ کیجائے۔ جب یہ حالت ہے تو کیا مذہب میرے لئے بھی ضروری ہے؟ کیا عیسٰی مسیح کا یہ قول نہیں ہے کہ وہ لوگ مسیحی ہیں جنکو خدا نے میرے سپرد کر دیا ہے؟ تو کیا اس قول کے مطابق میں بھی انھیں کے سپرد کیا گیا ہوں؟ لیکن اس میں آخر کیا ہرج ہے اگر خدا مجھے بجائے عیسٰی مسیح کے سپرد کر دینے کے اپنے پاس ہی رکھ لے اور میرا دل بھی بعض وقت یہی کہتا ہے۔ دیکھو میرے مطلب کو کہیں غلط سلط نہ سمجھ لینا اور میرے بے ضرر الفاظ سے کہیں مضحکہ نہ اخذ کر لینا میں اسوقت اپنا پورا دل نکال کر تمہارے سامنے رکھ رہا ہوں ورنہ میرے لئے خاموشی اور سکوت زیادہ اچھا تھا لیکن میرے خیال میں مجھ کو ایک ایسے مضمون سے کنارہ کشی نہیں اختیار کرنا چاہئے جس سے لوگ اتنے ہی بے خبر ہیں جتنا کہ میں۔ انسان کی تقدیر آخر کیا ہے؟ بس اپنی مصیبت اور تکلیف کا پیمانہ پُر کرنا اور اپنی قسمت کئے ہوئے تلخ جام کو حلق کے نیچے اُتار جانا یہی اُس کی قسمت ہے اور اگر انسان کی صورت میں خدا نے اس جام کو تلخ بنایا ہے تو میں احمقانہ وقار کے ساتھ اسکو شیریں کہنے والا کون ہوتا ہوں۔ جب میری ہستی کا سارا نظام فنا و بقا کی آویزش کے وقت لرزہ براندام ہوگا اور جب گذشتہ زمانہ کی برق آسایا دستقبل کی تاریک خلیج کو منور کرے گی اور جب میرے سامنے کی ہر چیز ہلاک اور ساری دنیا ناپید ہوگی تو میں اُس پُر خطر لمحہ کے وقت پیچھے ہٹکر اپنے کو کیوں شرمندہ و خجل کروں۔ کیا یہ آواز کہ "اے میرے خدا۔ اے میرے خدا! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا" ایسی عاجز اور ناقص ہستی کی نہیں ہے جس پر بے حد ظلم توڑا گیا ہو اور جو ناگزیر طور پر قعر ہلاکت میں گرنے والی ہو اور اپنی بے مائگی اور بے بضاعتی پر کراہ رہی ہو۔ پھر ان الفاظ کو دہرانے سے میں کیوں شرمندہ ہوں اور اس اُمید پہ کیوں نہ خوف کھاؤں جس میں ان لوگوں تک کے لئے خطرہ تھا جنہوں نے آسمان و زمین کو پوشاک کی طرح استعمال کیا۔

۲۱ نومبر

اس کو نہ تو اسکا احساس ہے اور نہ علم کہ وہ ایک ایسا زہر تیار کر رہی ہے جو ہم دونوں کو فنا کر دے گا۔ اور مجھے دیکھو کہ میں اس زہر کے پیالہ کو جو مجھے تباہ کرنے والا ہے، کس شوق سے پی رہا ہوں۔ اسکی لگاوٹ کی نظروں کا جس سے وہ اکثر — اکثر۔ نہیں، نہیں بلکہ بعض وقت مجھ کو دیکھتی ہے اور اُس کے حسن خلق کا جس سے وہ میرے بے اختیار جذبات کے اظہار کو سنتی ہے اور میری مصیبت پر ہمدردی کرتی ہے آخر کیا مطلب ہے؟ کل جب میں اُس سے رخصت ہو رہا تھا تو اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ "پیارے ورتھر الوداع"۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے مجھے پیارے ورتھر کے الفاظ سے خطاب کیا اور اسکی یہ آواز میرے دل کی گہرائیوں تک اتر گئی اور میں نے اُس کو سیکڑوں بار دہرایا اور کل رات کو سوتے وقت تو مختلف چیزوں کا خیال کرتے کرتے میں یکبارگی کہہ پڑا "اے پیارے ورتھر الوداع"۔ جب میں ذرا ہوش میں آیا تو میں اپنی حرکت پر خوب ہنسا۔

---

۲۲ نومبر

میں اب اُسے نہیں چھوڑ سکتا کیونکہ وہ بالکل میری معلوم ہوتی ہے مگر یہ بھی نہیں چاہتا کہ وہ مجھے دیدی جائے اسلئے کہ وہ دوسرے کی ملکیت ہے۔ اس طرح میں اپنے درد کی کیفیت کو خوشی سے مبدل کرتا ہوں اور اگر میرے پاس وقت ہوتا تو میں اس قسم کے کتنے متضاد خیالات کو شعر کا جامہ پہناتا۔

---

۲۴ نومبر

وہ میری مصیبتوں سے آگاہ معلوم ہوتی ہے۔ اور آج تو اُس کی نگاہ میری روح میں پیوست ہو گئی۔ میں جب گیا تو وہ تنہا تھی اور خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ میرے جاتے ہی مجھے غور سے دیکھنے لگی لیکن مجھے اس کے چہرہ میں اسوقت نہ تو حسن کی وہ اگلی سی لطافت اور نہ وہ غیر معمولی قابلیت کا جلوہ نظر آیا۔ یہ سب چیزیں گویا اب اس سے رخصت ہو چکی ہیں۔ مگر اس کی ایک چیز نے تو مجھے مار ڈالا اور وہ اس کی ہمدردانہ اور حیمانہ نگاہ تھی۔ کاش اسوقت اُس کے قدموں پر نثار ہونے کے بجائے میں اس کو اپنے پہلو میں لے لیتا اور اُس کی نگاہوں کا جواب، ہزاروں بوسوں سے دیتا۔ طبیعت کو بہلانے کے لئے اُس نے پیانو بجانا اور نرم اور میٹھی آواز سے خوشگوار سروں کے ساتھ گانا شروع کیا

اُس کے لب آج سے قبل شاید ہی اتنے شیریں آواز رہے ہوں گے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے لب صرف اس لئے کھلتے تھے کہ پیالوں سے جو لاہوتی نغمہ نکلے اُسے جذب کر کے ادا کریں۔ اُف۔ میری موقعت کی بیقراری کا کون اندازہ کر سکتا ہے؟ میں تو آپے سے باہر تھا اور جھک کر میں نے یہ عہد کیا کہ میں ان خوبصورت اور شیریں لبوں کی عفت کو جنکی حفاظت فرشتے کرتے ہیں، اپنے بوسہ سے کبھی داغدار نہ کروں گا۔ میرے دوست! مگر اس کے باوجود میری تمنا ہے کہ ــــ لیکن میرے دل کو شک اور تذبذب نے گھیر رکھا ہے۔ کاش میں مسرت کا ایک جام پی کر اپنے تمام گناہوں کے کفارہ کی خاطر اس عالم کو خیرباد کہتا! لیکن کون سے گناہوں کی خاطر؟

۲۶ر نومبر

اکثر میں اپنے دل سے پوچھتا ہوں کہ اے دل! آخر تو ہی تنہا مصیبت کا مارا اور غمگین کیوں ہے حالانکہ خدا کی اور مخلوق بھی ہیں جو خوش ہیں اور تیری طرح تو کسی پر بھی غم کا ایسا پہاڑ نہیں ٹوٹا۔ بعد ازاں میں ایک قدیم شاعر کے دیوان کا ایک حصہ پڑھکر اپنے دل کے سوز و گداز کو کم کرتا ہوں۔ اُف، مجھے کتنی چیزیں برداشت کرنی ہیں۔ کیا دنیا میں میرے پہلے بھی آدمی اسی طرح تم رسیدہ ہوتے تھے؟

۳۰ر نومبر

میں اب پہلا سا نہیں ہو سکتا۔ جہاں جہاں میں جاتا ہوں وہاں کوئی نہ کوئی بات ہو جاتی ہے جس سے طبیعت بدمزہ ہو جاتی ہے اور آج ہی کا واقعہ دیکھو! افسوس! ہماری تقدیر! افسوس! انسان کی فطرت!! چونکہ بھوک نہیں تھی اسلئے کھانے کے وقت میں دریا کی طرف سیر کو نکل گیا۔ ہر چیز تاریک اور غمزدہ نظر آتی تھی مگر پہاڑ سے نم اور ٹھنڈی ہوا خوب چل رہی تھی۔ میدان پر کالے بادل بھی چھائے ہوئے تھے۔ اتنے میں دور فاصلہ پر ایک آدمی پھٹی پرانی کوٹ پہنے نظر آیا جو شاید پہاڑوں میں پودوں کی تلاش میں چکر لگا رہا تھا۔ جب میں اُس کے پاس گیا تو وہ پھر کر مجھے دیکھنے لگا۔ وہ کافی قبول صورت تھا اور اُس کے چہرہ پر مستقلاً فکر کے مگر ساتھ ہی لطف و تفریح کے بھی آثار پائے جاتے تھے۔ اس کے لمبے سیاہ بال دونوں شانوں پر پڑے ہوئے تھے اور اُس کے کپڑوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی معمولی درجہ کا

آدمی ہے۔میرے دل میں آیا کہ میں اس سے پوچھوں کہ آپ یہاں کس کام میں مصروف ہیں مگر پھر خیال آیا کہ کہیں وہ برا نہ مان جائے۔آخر کار میں نے پوچھ ہی دیا کہ آپ کو کس چیز کی تلاش ہے ایک سرد آہ بھر کر اُس نے کہا کہ میں پھولوں کی تلاش میں ہوں مگر اب تک ایک بھی نہیں ملا ہے

میں (مسکرا کر) اب پھولوں کا موسم کہاں ؟

اس پر وہ مجھ سے ذرا اور نزدیک ہو گیا اور کہنے لگا کہ پھول تو بہت ہیں اور خود میرے باغ میں دو قسم کے گلاب اور لالہ صحرائی ہیں۔ان میں سے ایک تو میرے ابا جان نے کہیں سے لاکر دیا تھا۔دونوں بالکل گھاس کی طرح جمتے ہیں۔اس طرف دو دن سے میں ان کی تلاش میں ہوں مگر نہیں مل رہے ہیں۔وہاں پر زرد، نیلے اور سرخ پھول کھلتے ہیں اور اس پودا کا (اشارہ کر کے) پھول تو بہت خوشنما ہوتا ہے لیکن اس وقت تو مجھے ایک بھی نہیں ملتا۔

میں نے اس کا انہماک دیکھ کر معمولی طور پر پوچھا کہ آخر آپ ان پھولوں کو جمع کر کے کیا کریں گے ؟

میرا یہ فقرہ سُن کر اُس کے چہرہ پر ایک عجیب قسم کی مسکراہٹ دوڑ گئی اور اپنی انگلی منہ کے سامنے کر کے اُس نے مجھ سے خواہش ظاہر کی کہ میں اسکا راز کسی پر ظاہر نہ کروں۔اس کے بعد وہ کہنے لگا کہ میں نے اپنی معشوقہ کو پھولوں کا ایک گلدستہ نذر کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

"ہاں۔تو پھر"

"نہیں، نہیں، اُس کے پاس بہت کچھ مال وزر ہے اور وہ بڑی مالدار ہے"

"کیا اس کے باوجود وہ آپ کے گلدستہ کو پسند کرے گی"

"اُس کے پاس جواہرات اور تاج نما لٹوپیاں بھی ہیں"

"آخر وہ ہے کون ؟"

"بس اگر اسٹیٹس جنرل مجھے رقم ادا کر دے تو میں آج سے ایک دوسرا آدمی بن جاؤں۔وہ بھی کیا زمانہ تھا جب میں بہت خوش و خرم رہتا تھا۔مگر افسوس وہ زمانہ گذر گیا اور اب ـــ"

پھر وہ اپنی بیقرار آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔

"اچھا تو آپ ایک زمانہ میں بہت خوش تھے"

"کاش میں آج بھی ویسا ہی ہوتا۔ میں اسوقت اتنا خوش اور فارغ تھا جتنا کہ ایک انسان کو ہونا چاہیئے۔"

اتنے میں ایک بڑھیا ہم لوگوں کی طرف آتی ہوئی نظر آئی اور اُس نے آواز دی کہ "ہنری، ہنری کہاں ہو۔ ہم لوگ تمہارا بڑی دیر سے انتظار کر رہے ہیں، چلو کھانا کھالو۔" میں اُس بڑھیا کے قریب گیا اور اُس سے پوچھا کہ کیا یہ تمہارا لڑکا ہے۔ اُس نے کہا "ہاں، میرا بدنصیب بیٹا یہی ہے۔ اور اس کی وجہ سے خدا نے مجھے سخت اذیت میں ڈال رکھا ہے۔" پھر میں نے پوچھا کہ اس حالت میں وہ کتنے دنوں سے ہے۔ اس پر بڑھیا بولی کہ سکون کی یہ حالت چھ مہینہ سے ہے اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ وہ اب کچھ اچھا ہے۔ سال بھر تک تو وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھا۔ بہکی بہکی باتیں کرتا اور پاگل خانہ میں پابہ زنجیر تھا۔ اب اتنا ہے کہ وہ کسی کو ایذا نہیں پہنچاتا لیکن وہ اب سوائے راجاؤں اور رانیوں کے دوسری بات نہیں کرتا۔ پہلے وہ بہت اچھا اور خاموش نوجوان تھا اور میرے خرچ میں بھی کچھ مدد کر دیتا تھا۔ خط بھی اُس کا پاکیزہ تھا لیکن یکایک وہ غمگین رہنے لگا اور کسی بخار کی طرح تیز جذبہ سے مغلوب ہو کر دیوانہ وار پھرنے لگا۔ اور اب جیسا ہے آپ کے سامنے ہے۔ اگر جناب میں آپ سے بتاتی کہ ——" میں نے اُس کی بات کاٹ کر پوچھا کہ وہ کونسا زمانہ تھا جب وہ اپنی مسرت و شادمانی پر فخر کرتا تھا۔ میرے اس سوال پر وہ بڑے دردآمیز لہجہ میں بولی کہ "جس زمانہ میں اس کا دماغ بالکل بیکار تھا اُسی زمانہ کو وہ مسرت سے تعبیر کرتا ہے اور اُسی زمانہ کی یاد سے ہمیشہ بیقرار ہو جاتا ہے حالانکہ اس زمانہ میں وہ پاگل خانہ میں تھا اور دنیا کی ہر چیز سے بالکل الگ تھا۔" یہ سنکر تو میں اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور اُس کے ہاتھ پر کچھ روپئے رکھ کر وہاں سے چلا آیا۔

قصبہ کو لوٹتے وقت میں عالم خیال میں اس کو مخاطب کر کے یہ الفاظ کہتا جاتا تھا "تو تو اتنا مسرور و شادمان تھا جتنا کہ ایک آدمی ہو سکتا ہے۔ اے دونوں جہان کے مالک! کیا انسان کی قسمت اسی کا نام ہے؟ کیا وہ عقل و شعور حاصل کرنے کے قبل یا کھونے کے بعد ہی خوش رہ سکتا ہے؟ او بدبخت ہستی! تیری قسمت پر میں تب بھی رشک کرتا ہوں اور تیری فریب خوردہ زندگی

کا مشتاق ہوں۔ تو کتنی آرزوؤں کے ساتھ اپنی شاہزادی کے لئے پھول جمع کرنے جاتا ہے، کب، جھاڑے میں اور جب تجھکو پھول نہیں ملتے تو تو ملول ہوتا ہے مگر یہ بالکل نہیں سمجھتا کہ جاڑے میں بھی کہیں کہیں پھول کھلتے ہیں لیکن مجھکو دیکھو، آوارہ اور بیکار پھرتا ہوں، میرا دل اُمید کی چمک سے محروم اور مقصد کی تڑپ سے یکسر خالی ہے۔ اسی حالت میں صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے اور میں کسی نہ کسی طرح گھر آکر پڑ رہتا ہوں لیکن ایک تو ہے کہ اگر اسٹیٹس جنرل تجھکو رقم ادا کردے تو تو سوچتا ہے کہ تو ایک دوسرا ہی آدمی بن جائیگا۔ اور خوش و خرم مگر فانی انسان! کون ہے جو تیری مصیبتوں کا سبب اس عالم آب و گل کو ٹھہرائے ہاں اسکا سبب اور ہی کچھ ہے۔ تو نہ خبر رکھتا ہے اور نہ احساس کہ خود تیرے پژمردہ دل اور پریشان دماغ میں تیرے رنج و مصیبت کا وہ پوشیدہ منبع ہے جس کو تمام دنیا کی طاقتیں تجھ سے الگ نہیں کر سکتیں۔"

اس آدمی کے مرنے پر کسی قسم کا غم نہیں کرنا چاہیئے جو کسی بیمار کے اس دور دراز اور صحت بخش سفر پر ہنستا ہے جہاں وہ بیچارہ جا کر ایک زیادہ سخت بیماری میں مبتلا ہو کر تلخی موت کا شکار ہو جاتا ہے اور اسی طرح اس شخص کی موت پر بھی کوئی افسوس نہیں ہونا چاہیئے جو ایک نا اُمید گناہگار کے سفر اماکن مقدسہ کا مضحکہ اُڑاتا ہے جسکو اس بیچارہ نے اپنی روح کی بدبختی اور شکستہ حالی کو کم کرنے اور اپنے ضمیر کو سکوں پہنچانے کی خاطر سے اختیار کیا ہے۔ اسکا ہر قدم جو ناہموار اور غیر پامال راستہ پر پڑ کر اس کے پاؤں میں چھالے پیدا کرتا ہے واقعتاً اس کے زخمی دل پر مرہم کا کام کرتا ہے اور کئی دن کے سفر کی خستگی اور واماندگی سے اُس کی بیقرار اور مضطرب روح کو منزل کا سا آرام ملتا ہے۔ او غرور اور طنطنہ سے چیخنے والے لوگو! کیا تم اس کو جوش و خروش سے تعبیر کروگے؟ ارے جوش! خدایا تو میرے آنسوؤں کو دیکھتا ہے تو نے ہماری قسمت میں غم لکھ دیا ہے۔ تو کیا ساتھ ساتھ اسکی بھی ضرورت ہے کہ ہمارے بھائی بند بھی ہمارے درد رسیدہ دلوں پر چرکے لگائیں؟ ہم کو تسلی اور دلجمعی سے باز رکھیں اور تیرے اوپر اعتماد سے اور تیری محبت اور رحمت سے بالکل بیگانہ کر دیں۔ جڑی بوٹیوں میں شفا کی قوت کا اعتقاد دیا تاک طربناک میں شورش کا اعتبار اگر تیری ذات کا جس نے

ہمارے گرد وپیش کی تمام چیزوں میں شفا کی قوت بخشی ہے اقرار نہیں تو اور کیا ہے؟ اے میرے باپ میں تجھے بھول گیا ہوں لیکن ایک زمانہ تھا جب تو میری روح میں بسا ہوا تھا اور اب مجھ سے کنارہ کشی کر رہا ہے۔ مجھے اپنے پاس پھر بلالے اور اب زیادہ سکوت و خاموشی اچھی نہیں۔ دیکھ تیری خاموشی سے تیرے تشنگان دید کبھی باز نہیں آئیں گے اور ایک نہ ایک دن سرفراز ہونگے کون باپ ایسا قسی القلب ہے جو اپنے بچہ کے معافی مانگنے پر بھی قساوت کا اظہار کرے درآنحالیکہ اُس کا بچہ آکر کہے کہ اے میرے باپ! میں پھر تیرے پاس آگیا ہوں اور مجھے معاف کر اگر میں اپنے مقررہ وقت سے پہلے آگیا ہوں۔ دنیا ہر جگہ ایک ہی سی ہے۔ وہی آسمان و زمین۔ وہی تکلیف و آرام، وہی محنت و انعام، مگر آخر دنیا ان سے کیا فائدہ اُٹھاتی ہے؟ میں اسی میں خوش ہوں جس میں تیری خوشی ہے اور تیرے ساتھ رہ کر میں ہر آرام و تکلیف میں راضی ہوں۔ اے میرے آسمانی باپ! تو کیا تو ایسے بچہ کو اپنی بارگاہ سے نکال دیگا؟

یکم دسمبر

ولہلم میں نے جس آدمی کے متعلق نہیں لکھا تھا وہ وہی آدمی ہے جو اپنی مصیبت میں قابل رشک ہے اور جو شارلٹ کے باپ کا سکریٹری تھا۔ اُس کے دل کو بھی شارلٹ کے عشق نے اندر ہی اندر جلا ڈالا اور جب اس کی لو پھیلی تو وہ بیچارہ اپنی ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ اس کا اتنا اثر ہوا کہ وہ پاگل ہوگیا۔ جب اس سیدھے سادے قصہ کو پڑھنا تو خیال کر لینا کہ اس واقعہ نے میرے دل پر کیسا اثر ڈالا ہے! اس واقعہ کو مجھ سے البرٹ نے نہایت ٹھنڈے دل سے بیان کیا کیسے ٹھنڈے دل سے؟ جس ٹھنڈے دل سے کہ تم بھی اسکو پڑھو گے۔

---

۴ دسمبر

ذرا میری طرف بھی توجہ کرو۔ میرا کام بالکل تمام ہوگیا۔ اب میں اس حالت کو بالکل برداشت نہیں کر سکتا۔ آج میں جب شارلٹ کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو وہ بڑے جوش کے ساتھ پیانو پر مختلف دلفریب سروں کو چھیڑ رہی تھی۔ اُس کی چھوٹی بہن میری گود میں اپنی گڑیا کو کپڑے پہنا رہی تھی اور میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ میں جھک کر بار بار اُسکی شادی کی انگوٹھی کو دیکھتا رہا مگر میرے آنسو

بدستور بہتے رہے۔ یہ دیکھ کر اُس نے اپنا خاص لا ہوتی نغمہ چھیڑا جس نے بارہا مجھکو مسحور کیا ہے عہد ماضی کی یاد سے جب میں اس نغمہ سے آشنا تھا البتہ کچھ تسکین سی ہوئی مگر ساتھ ہی مجھے اپنی بخت کی ساری نارسائیاں اور ناکامیاں بھی یاد آگئیں جن سے مجھے اُس زمانہ سے آج تک برابر سابقہ پڑ رہا ہے۔ میں اُٹھا اور اُٹھکر کمرہ کے اندر جلدی جلدی ٹہلنے لگا۔ میرا دل اس وقت درد آمیز جذبات سے معمور تھا۔ آخر کار میں بڑے شوق کی حالت میں اُس کے پاس گیا اور التجا کی کہ خدا کے واسطے وہ نغمہ اب مت چھیڑو۔ یہ سُن کر اُس نے پیانو بجانا تو بند کر دیا مگر میری طرف غور سے دیکھنے لگی اور ایک ایسی مسکراہٹ سے جو میرے دل کے پار چلی گئی، کہنے لگی کہ "ورتھر! تم بیمار معلوم ہوتے ہو کیونکہ تمہاری عزیز ترین غذا آج تم کو ناپسند معلوم ہوتی ہے۔ اچھا جاؤ اور اپنی طبیعت کو بحال کرو" اس پر تو میں نے اپنے کو نوچ لیا اور کہنے لگا "خدایا! تو میری مصیبتوں سے خوب واقف ہے ان کا خاتمہ بس تیرے ہی ہاتھ ہے"

۶ر دسمبر

اُس کی شکل ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے پھرتی ہے۔ سوتے جاگتے غرض ہر حال میں میری روح اُسی کے تصور میں گم رہتی ہے۔ جیسے ہی کہ میں اپنی آنکھیں بند کرتا ہوں میرے دماغ میں جو بینائی کے تمام اعصاب کا مرکز ہے اُس کی سیاہ چتونوں کا عکس نظر آتا ہے۔ اس جگہ میں اس کیفیت کو خاطر خواہ بیان نہیں کر سکتا لیکن آنکھیں بند کرتے ہی اُس کی آنکھیں میرے سامنے آجاتی ہیں۔ اُف، وہ آنکھیں جو گہرائی کی طرح سیاہ ہیں، جب مجھ پر پڑتی ہیں تو میرا سارا ہوش و حواس اور صبر و قرار لیجاتی ہیں۔

انسان، وہ فخر کرنے والی مغرور ہستی آخر کیا چیز ہے؟ کیا اُس کی قوتیں ٹھیک اُس وقت ناکام نہیں ہو جاتیں جب کہ اُن کی اس کو اشد ضرورت ہوتی ہے؟ کیا انسان کی زندگی کی رفتار خواہ وہ عیش و نشاط کے عالم میں ہو یا قعر غم کے تھپیڑے کھاتا ہو، محدود نہیں ہے۔ اور جب وہ اپنے زعم میں حقیقت لامتناہیہ کی طرف بڑھتا ہے تو کیا اُس وقت وہ اپنی روزمرہ اور بے سوز زندگی کے احساس پر مجبور نہیں ہوتا؟ -

مؤلف کا خطاب ناظرین سے

بڑے افسوس کا مقام ہے کہ ہم کو اپنے دوست کی عجیب و غریب زندگی کے آخری ایام کے صحیح واقعات خاطر خواہ نہ مل سکے اس لئے مجبوراً ہم کو اس کے خطوں کا سلسلہ توڑ کر اس کمی کو پورا کرنے کے لئے سلسلہ وار تفصیل سے کام لینا پڑا۔ ہم نے اُس کو اپنا فرض سمجھا کہ جو لوگ وہ تھرسے خوب واقف رہے ہوں اُن سے ملکر صحیح صحیح واقعات معلوم کریں۔ قصہ سیدھا سادہ ہے اور تمام بیانات سوائے چند غیر ضروری تفصیلوں کے مل جاتے ہیں لیکن اس سے چشم پوشی نہیں کیجاسکتی کہ جن لوگوں سے یہ واقعات ملے ہیں اُن کی سیرت کے متعلق آرار کا اختلاف ہے۔ اب ہم کو صرف ان واقعات کو من وعن بیان کر دینا ہے جن کو ہم نے محنت اور جانفشانی سے جمع کیا ہے اور ساتھ ساتھ مرحوم کے ان خطوں کو بھی شایع کرنا اور ان کی معمولی سے معمولی تحریروں پر بھی خاص توجہ کرنا ہے اس لئے کہ ایسے لوگوں کے صحیح اور اصلی منشار کو معلوم کرنا جو طبقہ عوام سے تعلق نہیں رکھتے بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔

ورتھر کی روح میں رنج اور اضطراب نے اپنا نشیمن بنا کر رفتہ رفتہ اُس کی خصلت کو بالکل اپنے رنگ میں رنگ دیا تھا۔ اُس کے دماغ کا توازن بالکل بگڑ گیا تھا اور ایک دائمی مضطربانہ کیفیت اور دماغی ہیجان نے اس کی طبعی قوتوں کو کمزور کر کے اس پر اتنا اندوہگیں اثر ڈالا تھا اور اس کو اتنا ضعیف و ناتوان کر دیا تھا کہ وہ بیچارہ اپنے ضعف کا بہ نسبت پہلے کے نہایت تکلیف دہ ارادہ کے ساتھ مقابلہ کرتا جیسا کہ اُس نے شاید اپنی بدبختیوں کا مقابلہ بھی نہ کیا ہو۔ اسکے دماغی تفکرات نے اُس کی بہت سی نیک خصلتوں کو اتنا کمزور کر دیا تھا کہ وہ بہت جلد ہی غمگین اور اداس رہنے لگا۔ اس کی مصیبتوں میں جیسے جیسے اضافہ ہوتا گیا ویسے ویسے وہ بھی اپنے خیالات میں ملول اور اپنی طرف سے بے انصاف ہوتا گیا۔ کم سے کم البرٹ کے دوستوں کی یہی رائے تھی۔ ان کا خیال ہے کہ اس عرصہ میں البرٹ کی سیرت میں کوئی نمایاں فرق نہیں آیا تھا اور اب بھی وہ ویسا ہی تھا جس کو ورتھر شروع شروع میں پیار کرتا تھا اور جس کی ابتدا سے عزت کرتا تھا۔ شارلٹ پر اسکی فداکاری

کا وہی حال تھا اور اس پر وہ نازاں تھا اور اس بات کا متمنی تھا کہ ہر شخص شارلٹ کو احسن المخلوقات میں شمار کرے۔ اس صورت میں کیا البرٹ اپنی طرف سے ہر شبہ کو دور کرنے کی خواہش کے یا اپنے مال غنیمت میں دوسرے کو دم بھر کے لئے اور وہ بھی نہایت معصومانہ طور پر شریک نہ کرنے کے الزام کا ملزم قرار دیا جا سکتا ہے؟ کہا جاتا ہے کہ البرٹ ورتھر کی موجودگی کے وقت اپنی بیوی کے کمرہ سے اکثر اٹھ جاتا تھا لیکن یہ فعل کسی قسم کے بغض یا نفرت پر مبنی نہ تھا بلکہ اس خیال سے تھا کہ کہیں اس کی موجودگی ورتھر پر گراں نہ گذرے۔

شارلٹ کا باپ جو علالت کی وجہ سے مکان کے اندر ہی رہتا قرب وجوار میں تفریح کے لئے شارلٹ کے واسطے گاڑی بھیجتا۔ اس روز موسم غیر معمولی طور پر سخت خراب تھا اور تمام طرف برف ہی برف نظر آتی تھی۔ دوسرے روز صبح کو ورتھر شارلٹ کے یہاں گیا تاکہ اگر البرٹ موجود نہ ہو تو وہ شارلٹ کو گھر پہنچا دے۔ موسم کی عمدگی نے اُس کے درد بھرے دل پر بہت کم اثر ڈالا۔ اُس کی روح گویا کسی بارگراں کے نیچے دبی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ غم واندوہ نے اُس کی ہستی کو اس طرح گھیر رکھا تھا کہ اُس کے دماغ میں سوائے الم آمیز خیال کے اور کوئی تغیر ہی نہیں ہوتا تھا۔ چونکہ اندرونی سکون اُس سے عنقا ہوگیا تھا اس لئے تمام ذی روح اشیاء اس کے لئے ایک دائمی اضطراب اور تکلیف کا منبع بن گئیں تھیں۔ وہ اپنی بابت خیال کرنے لگا کہ میں نے البرٹ اور اس کی بیوی کی مسرور اور شادکام زندگی میں رخنہ ڈالا ہے اور یہ سمجھ کر گو اُس نے خود اپنی ملامت کی مگر ساتھ ہی اُس کے دل میں البرٹ کی طرف سے نفرت بھی پیدا ہوگئی۔

ورتھر اکثر اسی قسم کے خیالات میں گم ہو جاتا اور وہ اپنی ناخوشی کو چھپائے بغیر اس بات کا زبانی اس طرح اعادہ بھی کرتا کہ "ہاں یہ میری نازک و والہانہ محبت اور میری پر متانت شیفتگی کا بدلہ ہے! میری آنکھیں آخر کیا دیکھتی ہیں؟ کچھ نہیں مگر میری ولا پروائی۔ حقیقت یہ ہے کہ معمولی سے معمولی واقعہ بھی اُس کو اس کی حسین و دلربا بیوی سے زیادہ مسحور کرتا ہے۔ کیا وہ اپنی مسرتوں اور شادمانیوں کی قدر کرتا ہے؟ کیا وہ شارلٹ کی اتنی ہی قدر کرتا ہے جتنے کی وہ مستحق ہے ہاں یہ بیشک صحیح ہے کہ شارلٹ اس کی ہے میں اسکو جانتا ہوں اور میں اس سے بھی زیادہ جانتا ہوں

اور میں تو اب اس خیال کا عادی ہوگیا ہوں کہ وہ یا تو مجھے پاگل بنا دے گا یا مجھے مار ڈالے گا۔
کیا اس کی دوستی میرے ساتھ اب بھی بے داغ ہے؟ کیا شارلٹ سے میری محبت کو وہ اپنے حقوق
کی پامالی سے تعبیر نہیں کرتا اور شارلٹ سے میرے مراسم کو اپنے حق میں ایک خاموش سرزنش تصور
نہیں کرتا؟ میں جانتا ہوں اور واقعی محسوس کرتا ہوں کہ وہ مجھے پسند نہیں کرتا اور میری عدم
موجودگی کا خواہشمند رہتا ہے اس لئے کہ میری موجودگی اُس کے لئے بہت نفرت انگیز ہے"
شارلٹ کے پاس جاتے ہوئے وہ اکثر راستہ میں کھڑا ہو جاتا، کھڑا ہو کر کچھ سوچتا اور
واپسی پر کمربستہ نظر آتا مگر ان سب باتوں کے باوجود وہ چلا جاتا۔ اس قسم کے خیالات اور
خود کلامیوں میں غرق ہو کر جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں وہ کسی نہ کسی طرح بے اختیار اس شکارگاہ
والے مکان تک پہنچ جاتا۔ ایک دفعہ جب مکان میں داخل ہو کر اُس نے شارلٹ کو دریافت
کیا تو کیا دیکھتا ہے کہ سارے مکین نہایت بدحواسی اور پریشانی کی حالت میں ہیں۔ سب سے
بڑے لڑکے نے آ کر اطلاع دی کہ والہائم میں ایک سخت حادثہ پیش آگیا ہے۔ یعنی ایک کسان
کو کسی نے مار ڈالا ہے لیکن ورتھر پر اس خبر کا کچھ بھی اثر نہیں ہوا۔ کمرہ میں جب وہ داخل ہوا تو
اُس نے شارلٹ کو اپنے باپ کے ساتھ بحث کرتے ہوئے پایا جو باوجود اپنی ناتوانی اور ضعف
کے موقع واردات پر تفتیش کے لئے جانے پر مصر تھا۔ ملزم لاپتہ تھا اور مقتول اپنے دروازہ
اُسی روز صبح کو مردہ پایا گیا۔ شبہ بہرحال ہر طرف جاتا تھا۔ مقتول ایک بیوہ کا ملازم تھا
اور اس سے قبل جو شخص اس جگہ پر کام کرتا تھا وہ برخاست کر دیا گیا تھا۔
ورتھر اس واقعہ کو سنتے ہی کہنے لگا کہ "آیا یہ ممکن بھی ہے؟ میں خود موقع پر جاؤں گا
اور ایک منٹ کی بھی دیر نہ کروں گا" یہ کہہ کر وہ فوراً والہائم کی طرف روانہ ہوگیا۔ واقعہ
کی ذرا ذرا سی تفصیل معلوم کرنے کے بعد اُس کو ذرا بھی شبہ نہیں رہا کہ قاتل وہی شخص ہے جس
سے اُس نے اکثر باتیں کی ہیں، اور جس کا اُس کے دل میں بڑا احترام تھا۔ وہ نیبو کے مشہور درخت
کے پاس والے راستہ سے اُس مکان پر گیا جہاں مقتول کی لاش لیجائی گئی تھی اور اُس جگہ
کی یاد سے اُس کے دل میں جذبات کا سخت طوفان برپا ہوگیا۔ وہ چوکھٹ جہاں ہمسایوں

کے بچے اکثر آ کر کھیلا کرتے تھے اب خون سے رنگین ہے۔ محبت اور وابستگی جو فطرت انسانی کے اعلیٰ اور شریفانہ جذبات ہیں، افسوس ان کو قتل و جفا کاری کا جامہ پہنا دیا گیا! سامنے کے بڑے بڑے عالیشان درخت ٹھنڈ ہو کر رہ گئے تھے۔ پتیاں جھڑ گئی تھیں اور پرانے گرجا گھر کے چاروں طرف جو جھاڑیاں تھیں افسوس وہ بھی مرجھا کر خشک ہو گئیں۔ قبروں کی سنگیں لوحیں کھڑکی سے صرف آدھی نظر آتی تھیں اور آدھی برف سے ڈھکی تھیں۔

جب ورتھر سرایا مہمان خانہ کے پاس گیا جس کے قریب سارا قصبہ جمع تھا تو یک بیک بڑے زور کی چیخ بلند ہوئی اور مسلح کسانوں کا ایک جتھا بڑھتا ہوا نظر آیا۔ اس وقت ایک عام غوغا بلند ہوا کہ ملزم گرفتار ہو گیا۔ ورتھر دیکھنے لگا اور اُس کو دیر تک شبہ کی گنجائش نہیں رہی۔ دیکھتا کیا ہے کہ ملزم وہی نوکر ہے جو پہلے اس بیوہ پر عاشق تھا اور جس کو اُس نے بارہا پھرتے ہوئے دیکھا تھا اور جس سے وہ مل بھی چکا تھا۔ اُس کے چہرہ پر دبے ہوئے غصہ اور نامرادی اور مایوسی کی علامت جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں صاف نمایاں تھی۔ ورتھر نے اس قیدی کی طرف بڑھ کر پوچھا کہ اے بدنصیب آدمی اتم نے آخر کون سا جرم کیا ہے جو اس قید و بند میں گرفتار ہو؟ قیدی نے اپنی نظر خاموشی سے اسکی طرف پھیر کر نہایت سکون خاطر سے جواب دیا کہ اب اس کے ساتھ کوئی بھی شادی نہیں کرے گا اور نہ وہ کسی سے شادی کرے گی۔ قیدی اُس سرا میں محفوظ طریقہ سے بند کر دیا گیا اور بعد ازاں ورتھر بھی وہاں سے چلا آیا۔

اس دل ریش واقعہ کی وجہ سے ورتھر کے ہوش و حواس بجا نہ رہے اور اب تک اپنی تمام گرد و پیش کی چیزوں سے اُس کا جو غم انگیز، ترشرویانہ اور کچھ بے پروائی کا انداز تھا وہ جاتا رہا۔ اس قیدی کے لئے اُس کے دل میں رحم کا جذبہ پیدا ہو گیا اور اُس کو بہر صورت بچانے کی ایک ناقابل اظہار فکر دامنگیر ہوئی۔ آخر اس قیدی کی حالت زار پر اُس کو اتنا ترس آیا کہ وہ اُس کے جرم کو قابل عفو سمجھنے لگا اور اپنی حالت کو اُس کی حالت سے اتنا مشابہ پایا کہ اس کو اس بات کا مکمل یقین ہو گیا کہ وہ ہر شخص کو اُس کی رہائی کے معاملہ میں اپنا ہم خیال بنا سکتا ہے اب اُس کے دل میں عدالت میں جوابدہی کا خیال آنے لگا اور اس موقع کے لئے اُس نے

ایک پرزور تقریر بھی تیار کرنا شروع کردی اور جب وہ شکار گاہ والے مکان کی طرف جاتا تو زور زور سے اس تقریر کو دہراتا جو وہ جج کے سامنے کرنے والا تھا۔

اپنی آمد پر اُس نے البرٹ کو اپنے سامنے پایا اور اس پر وہ کچھ سراسیمہ سا ہوا مگر اُس نے فوراً اپنی خاطر جمع کرکے جج کے سامنے اپنی رائے کا اظہار بڑے جوش و سرگرمی کے ساتھ کیا۔ دوران تقریر میں جج شک و شبہ کے انداز میں سر ہلاتا جاتا تھا۔ گو کہ ورتھر نے ملزم کی طرف سے جوابدہی کی بحث نہایت جوش اور استقلال سے کی لیکن جج پر زیادہ اثر نہیں ہوا اس کے برخلاف وہ برابر ورتھر کو بیچ بیچ میں ٹوکتا جاتا تھا کہیں حجت کرتا اور ایک قاتل کا وکیل بننے پر کہیں کہیں اُس کو ڈانٹ بھی دیتا اور بعد کو تو اُس نے کہا کہ اگر اس واقعہ کی مثال لی جائے تو گویا ہر قانون توڑا جا سکتا اور حفظ عامہ کو بالکل نیست و نابود کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ بریں ایسے معاملہ میں خود میں بغیر اپنے اوپر بڑی بھاری ذمہ داری لئے ہوئے کچھ نہیں کر سکتا۔ بہرحال ہر کارروائی اپنی اپنی جگہ ہوگی اور جو ضابطہ ہے پورا کیا جائیگا۔ ورتھر نے اس کے باوجود ہمت نہیں ہاری اور جج سے اپیل کرنے میں یہانتک التجا کی کہ وہ مجرم کے فرار ہونے میں چشم پوشی کرے۔ لیکن یہ درخواست فوراً رد کردی گئی۔ البرٹ نے اس بحث میں حصہ لے کر جج کی رائے سے اتفاق کیا جس پر ورتھر کو سخت غصہ آیا اور اس حالت میں جبکہ جج نے متعدد بار کہہ دیا تھا کہ ملزم کا بچنا محال ہے، باہر نکل آیا۔ جج کے اس حکم پر اُس کو جو انتہائی صدمہ ہوا اُس کا اندازہ اس تحریر سے ہو سکتا ہے جو اُس کے کاغذات میں ہم کو دستیاب ہوئی ہے اور جو واقعی اس موقع پر لکھی گئی۔

"او بدبخت ہستی! تیری جان نہیں بچ سکتی۔ مجھے صاف طور پر نظر آرہا ہے کہ ہم لوگوں کی گلو خلاصی نہیں ہو سکتی"۔

مجرم کے بارے میں البرٹ نے جج سے جو بات کہی تھی اُس سے ورتھر آگ بگولہ ہوگیا اور اس پر بار بار اُس کے دل میں خیال آتا کہ اس میں کہیں خود میری شخصیت پر چھپا ہوا حملہ نہ ہو حالانکہ غور و خوض کے بعد یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی کہ البرٹ اور جج کی رائے بالکل صحیح

تھی۔ مگر ورتھر اس کو تسلیم کرنے میں انتہا درجہ پس و پیش کرتا تھا۔ البرٹ کے رویہ پر ورتھر کی رائے ایک تحریر کی صورت میں اُس کے کاغذوں میں ملی ہے ۔

"میرے بار بار کہنے سے کہ وہ بہت اچھا اور نیک آدمی ہے آخر کیا فائدہ ہے ؟ وہ میرے لئے اب بلائے جان ہو گیا ہے ۔۔۔ اور اب میں اُس کے حق میں منصف مزاجی سے کام لے ہی نہیں سکتا۔"

موسم سرما میں ایک دن شام کو جب برف پگھل رہی تھی تو شارلٹ اور البرٹ مکان واپس آرہے تھے۔ شارلٹ برابر اپنے اِدھر اُدھر دیکھتی جاتی تھی۔ گویا ورتھر کی عدم موجودگی اس پر گراں گذر رہی تھی۔ اتنے میں البرٹ نے ورتھر کا ذکر چھیڑ کر اُس کی طبیعت کی بیجا اُفتاد کو بُرا بھلا کہنا شروع کیا اسی سلسلہ میں شارلٹ سے اُس کی نامبارک رغبت کا بھی ذکر کیا اور کہنے لگا کہ اگر ورتھر کی تم سے صاحب سلامت ترک ہو جائے تو ہم لوگوں کے لئے بہت بہتر ہے۔ اور شارلٹ! میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ تم اُس کو مجبور کرو کہ وہ اپنا رویہ تمہاری طرف سے بدل دے اور تمہارے پاس کم آیا جایا کرے۔ تم جانتی ہو کہ یہ دنیا ہے جس کے منہ میں جو آتا ہے بکتا ہے اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ لوگ ہم لوگوں کے متعلق مختلف قسم کی چہ میگوئیاں کرتے ہیں۔ شارلٹ یہ سن کر خاموش ہو رہی مگر یہ خاموشی البرٹ پر سخت گراں گذری۔ اس کے بعد کم سے کم اتنا تو ضرور ہوا کہ اُس نے پھر ورتھر کا کوئی ذکر نہیں کیا اور جب خود شارلٹ نے اُس کا ذکر چھیڑا تو البرٹ نے ٹال دیا یا دوسری دوسری باتیں کہہ کر موضوع گفتگو بدل دیا۔

ورتھر نے اس بدبخت مجرم کے بچانے کی جو ناکام کوشش کی تھی وہ گویا چراغ کی آخری بھڑک تھی جو بجھنے سے پہلے ہوا کرتی ہے۔ بعد ازاں ورتھر پھر اسی طرح مایوسی اور بیکاری کا شکار ہو گیا تا آنکہ یہ معلوم کرکے اُس کو پریشانی لاحق ہوئی کہ اس کو مجرم کے خلاف شہادت کے لئے طلب کیا جانے والا ہے کیونکہ مجرم نے اپنی مکمل بیگناہی کا دعویٰ کیا ہے۔ اب اپنی گذشتہ زندگی کی ہر تکلیف کے خیال سے اُس کا دماغ پریشان رہتا۔ سفیر کے ہاتھوں اُس نے جو مصائب برداشت کئے اور اس کے بعد جتنے صدمے اُٹھائے وہ سب اُس کے دماغ میں تازہ ہو گئے اور اُنکے خیال سے اُس میں قوت عمل بالکل زائل ہو گئی۔ اس طرح عمل کی قوت کھو کر اور زندگی کے معمولی

کاروبار سے بھی یکسر علیحدہ ہوکر وہ اپنے احساس اور اپنی پیاری اور زندہ دل محبوبہ (جس کا سکون خاطر اُس نے خود خراب کیا تھا) کے غم عشق کا شکار ہو گیا۔ زندگی کے اس غیر متبدل دور میں اُس کا پیمانۂ عمر بھرنے لگا اور اُس کی ساری قوتیں بغیر کسی مصرف اور مقصد کے مضمحل ہونے لگیں یہاں تک کہ موت نے اندوہ ناک طور پر اسکا خاتمہ کر دیا۔

چند خطوط سے جو اُس نے چھوڑے ہیں اور جو یہاں مندرج ہیں اُس کے دماغ کی پریشانی اور اُس کے عشق کی گہرائی کا کافی ثبوت ملتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اُس کے شکوک، اُس کی کشمکش اور زندگی سے اُس کی بیزاری کا پتہ بھی چلتا ہے۔

۱۲ر دسمبر

پیارے ولہلم۔ میری ہستی اب مثل اُن بدبخت لوگوں کے ہو گئی ہے جو سمجھتے ہیں کہ کوئی خبیث روح اُن پر سوار ہے۔ بعض وقت مجھے سخت اذیت ہوتی ہے لیکن کسی خوف یا ڈر کی وجہ سے نہیں بلکہ کسی ناقابل اظہار اندرونی احساس کی بدولت جو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے دل کو دبائے ہوئے ہے اور میری سانس کو روکے ہوئے ہے۔ اس حالت میں میں راتوں کو اس طوفانی موسم کے باوجود باہر نکلکر ٹہلتا ہوں اور اپنے چاروں طرف ڈراؤنے اور خوفناک مناظر دیکھ کر خوش ہوتا ہوں کل رات کو میں باہر گیا تھا۔ برف بھی اتفاقاً پگھلنے لگی تھی۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ دریا بھی بڑھ رہا ہے اور تمام ندی نالے یہاں تک چڑھے ہیں کہ والہائم کی ساری وادی تہ آب ہے۔ ٹھیک بارہ بجے میں گھر سے نکلا اور نکلتے ہی ایک ہیبتناک نظارہ دیکھا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ چاندنی رات میں پہاڑ کی چوٹی سے پھین بھرا پانی بڑے زور شور کے ساتھ نیچے گر رہا ہے اور تمام میدان جھاڑیاں درخت اور جنگل اتنے جل تھل ہیں کہ تمیز مشکل ہے اور وادی کا تو یہ حال ہے کہ وہ ایک اچھی خاصی جھیل ہو گئی ہے اور ہوا کے تیز جھونکوں سے اس میں موجیں اُٹھتی ہیں۔ جب چاند کاٹ بادلوں کو اپنی روشنی سے منور کرتا اور ساتھ ہی ساتھ جب پانی کا سیلاب میرے پاؤں کے پاس سے ٹکرا کر پھین میں بدل جاتا اور شور پیدا کرتا تو میرے دل میں خوف اور خوشی سے ملا جلا احساس پیدا ہوتا۔ اُس وقت میں ہاتھ اُٹھا کر بڑھتے ہوئے سیلاب کی طرف دیکھتا تو دل میں یہی خیال

آتا کہ بس کود پڑو۔ اس بحرِ ذخار میں اپنے کو ڈبو کر اپنے آلام سے نجات پانے کے خیال کی خوشی میں تھوڑی دیر کے لئے تو میرا سارا ہوش و حواس رخصت ہو جاتا مگر نہ جانے کیوں اُسوقت ایسا معلوم ہونے لگتا کہ میں زمین میں گڑ گیا ہوں اور اپنے رنج و محن کی تلافی کرنے سے مجبور ہوں۔ شاید میرا وقت ابھی پورا نہیں ہوا اور مجھے بھی اس کا احساس ہے۔ ولہلم! اگر میں اپنی زندگی کو کھو کر ان طوفانی موجوں پر ایک ہی دفعہ سوار ہوتا یا ان پرشور موجوں کو گلے لگاتا تو کیا میری آزاد شدہ روح کے حصہ میں مسرت اور خوشی نہ آتی؟ بعدازاں میں نے بصد حسرت و یاس اس دلاویز خطہ کو بھی دیکھا جہاں شارلٹ اور ہم کافی طور پر ٹہلنے کے بعد ایک بید کے درخت کے نیچے جا کر بیٹھا کرتے تھے۔ افسوس وہ بالکل پانی سے بھرا ہوا تھا اور میدان کا پتہ بھی میں بمشکل لگا سکا۔ پھر مجھے شکار گاہ کے مکان کے چاروں طرف والے کھیتوں کا خیال آیا اور خیال آتے ہی اس کا خدشہ بھی ہوا کہ کہیں اس بیرحم طوفان نے اس کنج کو تو نہیں تہ آب کر دیا ہے۔ جس طرح کسی قیدی کے دماغ میں گلہ اور گھر کی گذشتہ مسرتوں کی یاد سے ایک فرحت معلوم ہوتی ہے اسی طرح مجھے بھی ان خیالات سے اپنی پچھلی خوشیوں کی ایک ہلکی سی جھلک معلوم ہوئی لیکن میں برخلاف کسی قیدی کے الزام وغیرہ سے بری ہوں۔ ہاں مجھ میں مرنے کی ہمت ضرور ہے۔ شاید مجھ میں — لیکن میں اب تک یہاں ایک گدائے بےنوا کی طرح بیٹھا ہوں، جو جنگل کی لکڑیاں چن کر اپنا پیٹ پالتا ہے اور اپنی بدبخت زندگی کی رسی کو جس کو وہ ہر وقت کاٹنے کے لئے تیار ہے، دراز کرتا جاتا ہے۔

۱۵ر دسمبر

پیارے ولہلم! معلوم نہیں میرا کیا حال ہوتا جاتا ہے۔ میں اب خود بھی اپنی ذات سے متفکر ہوں کیا اس سے میرا عشق خالص، پاک اور برادرانہ نہیں ہے؟ کیا میری روح کبھی شہوانی جذبات سے ملوث ہوئی؟ لیکن میں ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں دوں گا۔ ہاں اے تصورات شب! ان خاک نژادیوں نے تم کو کتنا سچ سمجھا ہے جو تمہاری مختلف حرکات کو کسی ناقابل تسخیر قوت کا کرشمہ بتاتے ہیں! آج کی رات! اُف۔ میں تو اس کے خیال سے کانپ اُٹھتا

ہوں ـــــ میرا ہاتھ اُس کی گردن میں معانقہ کی حالت میں خم تھا۔ میں نے اُسے خوب گلے لگایا اور اُن گلابی لبوں کے بے شمار بوسے لئے جن سے بس بس کی آہستہ صدا نکلکر رابطہ محبت کو استوار کرتی تھی اُس کی چشم مست نے تو میرے ہوش و حواس کا پیمانہ لبریز کر دیا۔ خدایا! کیا اس قسم کی خوشیاں منانا یا انتہائے شوق میں ان مسرت آمیز لمحات کی یاد تازہ کرنا گناہ ہے؟ شارلٹ! شارلٹ! میں تو اب کہیں کا نہیں رہا۔ میرے تمام حواس جواب دے چکے، میری قوت حافظہ بیکار ہوگئی اور میری آنکھیں آنسوؤں سے تر ہیں۔ میں بیمار بھی ہوں اور اچھا بھی۔ میرے دل میں اب کوئی تمنا نہیں میرے لئے اب بھلائی اسی میں ہے کہ اس عالم آب و گل کو خیر باد کہوں۔

مندرجہ بالا حالات کے بموجب ورتھر نے اس عالم فانی کو چھوڑنے کا مستحکم ارادہ کر لیا تھا۔ شارلٹ کی واپسی کے بعد تو اُس کی تمام آرزوؤں اور تمناؤں کا مرکز بس یہی خیال تھا۔ لیکن وہ سوچتا تھا کہ اس قسم کا کوئی کام کرنے میں جلدی نہیں کرنا چاہئے بلکہ کافی طور پر ٹھنڈے دل سے غور کر کے تب قدم اٹھانا چاہئے۔ اس کے شکوک اور اندرونی کشمکش کا اندازہ ان چند بغیر تاریخ کے رقعات سے ہو سکتا ہے جو اُس کے کاغذات میں ملے ہیں اور اُن سے ولہلم کے ایک خط کی یوں ابتدا ہوتی ہے۔

"اُس کی موجودگی اور مجھ سے اُس کی ہمدردی میں اب بھی اتنی طاقت ہے کہ میرے خشک دماغ سے آنسوؤں کے چند قطرے نکال لیں۔ ایک شخص پردہ اُٹھا کر دوسری طرف چلا جاتا ہے اور بس ـــــ تو پھر اب کس بات کی دیر یا شبہ ہے؟ شبہ یا دیر شاید اس واسطے ہے کہ ہم کو خبر نہیں کہ بعد کو کیا ہوتا ہے اور وہ بھی اسلئے کہ جا کر واپسی نہیں ہوتی اور جہاں یقین کے بجائے شبہ ہوتا ہے وہاں دماغ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ تمام طرف تاریکی اور برہمی ہے"

غم آلود خیالات کے اثر سے ورتھر کی صورت بھی بالکل بدل گئی تھی اور اب اُسکا ارادہ زیادہ مستحکم ہو گیا تھا۔ اس کا کچھ ثبوت اس مبہم خط سے ملتا ہے جس کو اُس نے اپنے دوست کے نام لکھا تھا۔

---

۲۰ دسمبر
ولہلم! تم نے جس محبت سے اپنی نصیحت ایسے ٹھیک وقت پر دہرائی ہے اُسکا میں

دل سے شکر گذار ہوں۔ بیشک تم صحیح کہتے ہو۔ یقیناً مجھکو یہاں سے چلا جانا چاہیئے لیکن میں تمہاری اس تجویز سے کامل طور پر اتفاق نہیں کرتا کہ میں فوراً تمہارے پاس چلا آؤں کم سے کم اتنا تو میں ضرور چاہتا ہوں کہ راستہ میں کچھ سیر و تفریح کرتا ہوا آؤں اس واسطے کہ برابر اولے پڑنے سے سڑک کچھ اچھی ہوگئی ہوگی۔ میں تمہارے آکر مجھ کو لیجانے کے ارادہ سے بہت خوش ہوا لیکن تم اپنا سفر ذرا دو ہفتہ کے لئے ملتوی کردو اور میرے دوسرے خط کا انتظار کرو۔ جب تک ایک چیز تیار نہ ہو جائے اُس کو پختہ سمجھنا اچھا نہیں اور دو ہفتہ کے وقفہ سے تو بڑا فرق ہو جاتا ہے۔ میری والدہ سے جاکر کہو کہ اپنے لڑکے کے لئے دعا کریں اور ان سے میری اُن تمام بدعنوانیوں کی معافی مانگو جس سے انکو تکلیف پہنچی ہے۔ خدا جانے کیوں میری قسمت کی گردش کچھ ایسی رہی ہے کہ جن کو مجھے سب سے زیادہ آرام پہنچانا چاہیئے تھا اُنھیں کو مجھ سے تکلیف پہنچی ہے۔ اچھا میرے پیارے دوست الوداع۔ خدا تم کو ہمیشہ اپنے سایۂ عاطفت میں رکھے۔ الوداع۔

اُس زمانہ میں شارلٹ کی روح جن بیقراریوں میں مبتلا تھی اُن کو الفاظ کا جامہ پہنانا بہت مشکل ہے اُس کی سیرت کے تمام پہلوؤں پر علم ہونے کے باوجود ان بیقراریوں کی قرار واقعی حقیقت معلوم کرنا جو اس کے شوہر یا اُس کے دوست کے سلسلہ میں ہی ہوں مشکل ہے۔ اتنا تو بہرحال یقینی ہے کہ اُس نے اپنے حسب استطاعت مستحکم ارادہ کرلیا تھا کہ ورتھر کو دور ہی دور رکھے اور اگر اس ارادہ میں کچھ کوتاہی ہو بھی جائے تو اُسکو اس کے دوستانہ رحم کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے جو ورتھر کی تکلیف کے احساس کے بعد کیا گیا ہو یعنی ورتھر کے لئے شارلٹ کی رائے کی پابندی کرنا سخت مشکل ہوگا لیکن ساتھ ہی ساتھ مختلف اسباب نے شارلٹ کو اپنے ارادہ میں ثابت قدم رہنے پر مجبور کیا۔ اُس کا شوہر ان معاملات میں بالکل دست اندازی نہ کرتا اور نہ وہ اس کو معرض گفتگو میں لاتی تاکہ اُسکے شوہر پر یہ واضح ہو جائے کہ وہ اپنے شوہر کی بالکل ہم خیال ہے۔

اُسی روز شام کو کرسمس سے ایک روز قبل اتوار کو ورتھر اپنے دوست کو مندرجہ بالا خط لکھ کر شارلٹ کے مکان پر آیا۔ شارلٹ اُس کو تنہا ملی۔ وہ اپنے بھائیوں اور بہنوں کے لئے چند تحفے تحائف

تیار کرنے میں مشغول تھی جو کرسمس کے دن اُن لوگوں کو تقسیم ہونے والے تھے ورتھر نے بچوں کی خوشیوں کا اور نیز کم سنی کے اُس دور کا ذکر کرنا شروع کیا جب کرسمس کے درخت کی تیاری پر جو پھلوں اور مٹھائیوں سے لدے ہوتے اور جن میں موم بتیاں روشن ہوتیں لوگ خوشیاں مناتے۔ اپنی پریشانی کو چھپانے کے لئے شارلٹ مسکرائی اور بولی کہ اگر تم بھی ٹھیک سے رہو گے تو تم کو بھی تحفہ ملے گا۔ اس پر ورتھر نے پوچھا کہ پیاری شارلٹ! ٹھیک سے رہنے کے کیا معنی ہیں؟ اور میں کیسے ٹھیک سے رہوں اور کیا کروں؟ شارلٹ نے جواب دیا کہ "جمعرات کی شام کرسمس سے پہلے والی شام ہوگی تمام بچے یہاں موجود ہوں گے اور ہر شخص کو کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور دیا جائے گا تم بھی اُس دن آجاؤ مگر پہلے مت آنا۔" ورتھر کے اس پر کچھ کان کھڑے ہوئے شارلٹ نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ "دیکھو! پہلے مت آنا اور ایسا ہی کرنا میں تم سے بس یہ عنایت اپنے آرام و سکون کی خاطر چاہتی ہوں۔ ہم لوگ اب اس رویہ سے ایک قدم بھی آگے نہیں چل سکتے۔" شارلٹ نے یہ دیکھ کر کہ ان الفاظ نے ورتھر کے احساس کو متحرک کر دیا ہے اس کے خیالات کو مختلف سوالات سے دوسری طرف پھیرنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر یہ سب چیزیں بیکار ثابت ہوئیں۔ پھر ورتھر بولا کہ اچھا شارلٹ اب میں تمہاری صورت دوبارہ نہ دیکھوں گا۔ "کیوں؟ کیوں؟ آخر کیوں! ہم لوگ ضرور ایک دوسرے سے ملیں گے۔ البتہ ہم لوگوں کی ملاقات اب ذرا زیادہ احتیاط سے ہوگی۔ آخر تم دنیا میں ہر اس چیز کے لئے جو تمہیں عزیز ہے اتنی شیفتگی اور والہانہ انداز لاتے ہی کیوں؟" پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہنے لگی کہ "میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ ذرا اپنی طبیعت میں سکون پیدا کرو۔ تمہاری اہلیت، تمہاری فہم اور تمہاری خدا داد قابلیت تمہارے لئے سیکڑوں ذرائع بہم پہنچائیگی۔ آدمی بنجاؤ اور اس نامسعود محبت کو چھوڑ دو جو تم کو ایک ایسی ہستی سے ہے جو تمہارے اوپر سوائے افسوس کے اور کچھ نہیں کر سکتی۔"

اس پر ورتھر اپنے ہونٹ چبا کر شارلٹ کی طرف نہایت اندوہگیں انداز سے دیکھنے لگا مگر شارلٹ برابر اُس کا ہاتھ پکڑے رہی اور پھر کہنے لگی کہ "ورتھر! مجھ کو بس ایک لمحہ کے لئے چین سے رہنے دو۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ تم خود اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہو اور آپ اپنی قبر کھود رہے ہو۔ تم آخر مجھ سے

کیوں محبت کرتے ہو؟ مجھ ہی سے آخر کیوں؟ اور میں تو دوسرے کی بیوی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تمہارا مجھ پر غلبہ نہ پا سکنے کی وجہ سے تمہاری رغبت میری طرف اور زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ ورتھر نے اس پر اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا اور اُس کو نہایت خشونت اور غصّہ کے انداز سے دیکھتا رہا اور بولا اچھا ہے! یہ بہت اچھا ہے!! معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب البرٹ نے تم کو پڑھایا ہے۔ یہ واقعی ایک بہت گہری بات ہے۔" شارلٹ بولی کہ "یہ خیال تو ایسا ہے کہ ہر شخص کے دل میں آسکتا ہے۔ اور کیا دنیا میں ایک بھی عورت ایسی نہیں جو آزادی کے ساتھ تم کو خوش رکھ سکے۔ اپنے نفس کو مغلوب کرو اور ایک ایسی عورت کی تلاش کرو جو تمہیں خوش رکھ سکتی ہو اور یقین مانو کہ تم کو ضرور ایک نہ ایک عورت ایسی مل جائے گی۔ مدتوں مجھے تمہارا بلکہ سب کا خیال رہا ہے مگر تم نے اپنے کو بہت محدود دائرہ کے اندر برسوں سے قید کر رکھا ہے۔ اپنے نفس پر قابو حاصل کرو۔ اور ذرا کوشش تو کرو۔ اچھا کوئی سفر کرو ممکن ہے سفر سے تمہاری مراد پوری ہو۔ سفر میں اپنی محبت کے قابل کوئی ہستی ڈھونڈھو اور تب واپس آؤ اور اس وقت ہم لوگ کامل دوستی اور اتحاد کے ساتھ آپس میں ہنسی خوشی کی زندگی بسر کرنے کے لائق ہوں گے۔" ورتھر نے ایک زہرخند کے ساتھ کہا کہ "تمہاری تقریر تو اس قابل ہے کہ اُستادوں کے فائدہ کے لئے چھاپ دی جائے۔ پیاری شارلٹ! مجھے بس تھوڑا وقت اور دو اور پھر تمام چیزیں ٹھیک ہو جائیں گی۔" شارلٹ بولی "چاہے کچھ بھی ہو مگر دیکھو! کرسمس کے پہلے مت آنا۔"

اس کے بعد ورتھر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اتنے میں البرٹ آگیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو سرد مہری سے سلام کیا اور دونوں اضطراب کی حالت میں کمرہ میں ادھر اُدھر ٹہلنے لگے۔ ورتھر نے معمولی طور پر کچھ بات بھی کی جس کا البرٹ نے جواب دیا اور پھر دونوں خاموش ہو گئے۔ بعد ازاں البرٹ نے شارلٹ سے کچھ خانگی معاملات کے متعلق دریافت کیا اور جب اس کو معلوم ہوا کہ اس کی ہدایتوں پر عملدرآمد نہیں ہوا ہے تو اُس نے چند الفاظ استعمال کئے جو ورتھر پر بہت شاق گذرے۔ ورتھر چلنے پر تیار ہو گیا مگر اس میں ہلنے کی طاقت نہیں رہی۔ ہر آن اس کی تکلیف اور بیزاری بڑھتی گئی اور اسی حالت میں وہ آٹھ بجے رات تک رہا۔ آخر جب کھانے کیلئے

دسترخوان بچھایا گیا تو اُس نے اپنی چھتری اور ٹوپی اُٹھائی لیکن البرٹ نے اُس سے رک جانے کو کہا مگر ورتھر یہ سمجھ کر کہ البرٹ محض رسمی طور پر روک رہا ہے اُس کا معمولی شکریہ ادا کر کے چلا آیا۔

ورتھر لوٹ کر مکان آیا اور نوکر سے شمع لے کر تنہا اپنے کمرہ میں گیا۔ کچھ دیر تک بڑی رقت قلب کے ساتھ اپنے آپ سے باتیں کرتے کرتے زور سے رونے لگا اور بعدازاں اُسی ہیجانی کیفیت میں اُٹھ کر ٹہلنے لگا اور ٹہلتے ٹہلتے وہ بغیر کپڑے اتارے چارپائی پر لیٹ گیا اور پڑا رہا یہانتک کہ جب نوکر اُس کے کمرہ میں ۱۱ بجے رات کو داخل ہوا تو اُس نے اُسکا جوتا اُتارا۔ ورتھر نے جوتا تو اوترو الیا مگر نوکر سے تاکید کر دی کہ جب تک صبح کو میں نہ بلاؤں تم میرے پاس مت آنا۔

۲۱ر دسمبر

دوشنبہ کی صبح کو اُس نے حسب ذیل خط شارلٹ کو لکھا جو اس کی میز کی دراز میں سربمہر اُسکی موت کے بعد پایا گیا اور شارلٹ کو دیا گیا۔ میں اسکے ٹکڑے ٹکڑے کہیں کہیں سے نقل کرونگا کیونکہ چند وجوہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط بھی اسی انداز میں لکھا گیا ہے۔

"شارلٹ۔ لو اب سارا قصہ ختم ہوا جاتا ہے۔ میں نے اب مرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ میں آج صبح سویرے جبکہ میں تم سے آخری بار ملنے والا ہوں یہ اعلان سمجھ بوجھ کر اور ٹھنڈے دل سے کر رہا ہوں اور اس میں کوئی رومانی خیال پرستی کا جزو نہیں ہے۔ اے تمام عورتوں کی سردار! جب تم ان سطروں کو پڑھو گی تو اُس وقت قبر کا ٹھنڈا کونا اِس بیقرار اور دردمند ہستی کو اپنی آغوش میں لئے ہوگا جو اپنے آخری لمحات میں صرف تم سے ہمکلام ہونے کو دنیا کی بڑی سے بڑی خوشی سمجھتا ہے۔ میں نے رات بڑی مشکل سے کاٹی یا یوں کہو کہ اچھی طرح گذاری اس لئے کہ اس رات نے مجھ میں عزم پیدا کیا اور وہ عزم پختہ ہوا۔ میں اب مرنے کیلئے بالکل تیار ہوں۔ کل جب میں اپنے کو تم سے چھڑا کر آیا تھا تو میرے ہوش وحواس میں ایک تلاطم برپا تھا۔ میرا دل سخت درد وکرب میں مبتلا تھا۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُمید اور مسرت نے ہمیشہ کے لئے میرا ساتھ چھوڑ دیا اور اس وقت میرے جسم زار کو موت کی سردی محسوس ہو رہی تھی۔ میں بڑی دقت سے اپنے کمرہ تک آیا اور آتے ہی دوزانو ہو گیا اور خدا نے آخری بار مجھے اپنے آنسوؤں کو بہا کر دل کی جلن کم کرنے کی طاقت بخشی۔ اس وقت میرے

دل میں ہزاروں خیالات اور لاکھوں منصوبوں کی دنیا آباد تھی لیکن آخر کار صرف ایک خیال نے دل پر قبضہ جمایا اور وہ بس مر جانے کا خیال تھا۔ میں سونے کے لئے لیٹا اور صبح کی خاموش فضا میں جب اُٹھا تو وہی ارادہ بدستور میرے دل میں تھا یعنی موت! موت! یہ ارادہ کسی مایوسی یا ناامیدی کی بنا پر نہیں ہے بلکہ نتیجہ ہے میرے اُس عقیدہ کا کہ اب میرے آلام کا ساغر لبریز ہو چکا اور میرا وقت آگیا اور اب میرا آخری کام یہ ہے کہ میں اپنے کو تم پر قربان کردوں۔ ہاں شارلٹ! تو میں اسکا اعلان کیوں نہ کروں کہ ہم تینوں میں سے جب ایک نہ ایک کو مرنا ضروری ہے تو پھر ورتھر ہی کیوں نہ اپنی جان سے گذر جائے۔ پیاری شارلٹ! اِس دل نے جس میں غیظ و غضب نے ہیجان برپا کر رکھا ہے اکثر تمہارے شوہر کو، تم کو اور خود اپنے کو قتل کرنے کے مہیب خیال کو راہ دی ہے مگر قرعہ آخر کار نکل ہی آیا۔ گرمی کی خاموش اور پرفضا شاموں کو جب تم سیر و تفریح کے لئے نکل کر پہاڑوں کی طرف جانا تو تھوڑی دیر کے لئے ذرا مجھ نامراد کی یاد بھی کر لینا اور ساتھ ہی یہ بھی یاد کرنا کہ میں بار بار تم سے ملنے کی خاطر اسی وادی کی طرف سے آتا تھا۔ اس یاد کے بعد پھر ذرا قبرستان کی طرف بھی ایک نظر اُٹھا کر دیکھنا جہاں میری قبر ہوگی۔ پھر تمہیں غروب آفتاب کے وقت شفق کی چمک میں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ وہ سبزہ بھی نظر آئیگا جو میری قبر پر لہکتا ہوگا۔ جس وقت میں نے یہ خط شروع کیا تھا میری طبیعت میں بالکل سکون تھا لیکن ان تمام مناظر کے خیال سے میری روح کانپ اُٹھتی ہے اور میں بچوں کی طرح بے اختیار روتا ہوں۔"

قریب دس بجے دن کو ورتھر نے اپنے نوکر کو بلایا اور کپڑا پہنتے وقت اُس سے کہا کہ چند دنوں میں میں ایک سفر پر جانے والا ہوں اس لئے تم میرے تمام کپڑوں کو تہ کرکے درست کر دو۔ سب حساب پیش کرو اور میں نے جتنی کتابیں لوگوں کو دی ہیں مانگ لاؤ اور ان غریب لواحقین کو دو دو مہینہ کی رقم دیدو جنکو میں ہفتہ وار رقمیں دیا کرتا تھا۔

اُس نے اپنے کمرہ میں کھانا کھایا اور پھر گھوڑے پر چڑھ کر اپنے کارندہ سے ملنے گیا مگر وہ مکان پر موجود نہ تھا۔ پھر وہ باغ میں نہایت متفکر ہو کر ٹہلنے لگا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان تمام خیالات پر از سرِ نو غور کر رہا ہے جو اس کو نہایت تلخ اور الم انگیز معلوم ہوتے تھے مگر بچوں نے

اسے دیر تک اس حالت میں نہیں رہنے دیا۔ وہ اوچھلتے کودتے آگئے اور کہنے لگے کہ پرسوں کے ایک دن بعد ہم لوگوں کو شارلٹ کرسمس کا تحفہ دے گی اور پھر اپنے اپنے خیال کے مطابق ان تحفہ جات کا ذکر کرنے لگے۔ اس پر ورتھر بولا کہ "کل ـــ اور کل کے بعد اور پھر ایک دن اور" یہ کہکر اُس نے بچوں کو پیار کیا۔ ورتھر جانے کے لئے تیار تھا مگر چھوٹے بچے نے اُس کے کان میں کچھ کہنے کے لئے اُسے روک لیا اور کہا کہ میرے بڑے بڑے بھائیوں نے نئے سال کی آمد میں عمدہ عمدہ تہنیت نامے لکھے ہیں۔ اتنے بڑے!! ایک ابا کے لئے۔ ایک البرٹ اور شارلٹ کے لئے اور ایک آپ کے لئے اور یہ سب نئے سال کی صبح کو پیش کئے جائیں گے اس بات سے ورتھر بالکل بیخود سا ہوگیا اور ہر لڑکے کو ایک تحفہ دیا۔ اور ماں اور باپ کے لئے ایک تہنیت نامہ چھوڑ کر گھوڑے پر سوار ہوا اور آبدیدہ ہوکر وہاں سے چلا آیا۔

پانچ بجے کے قریب مکان واپس آیا اور نوکر کو آگ جلانے کا حکم دیا۔ پھر اُس سے کہا کہ کپڑے اور کتابیں درست کرکے بکس میں نیچے رکھ دو اور اوپر سے کوٹ رکھ دو۔ بعد ازاں اُس نے اپنے شارلٹ والے خط میں حسب ذیل اضافہ کیا۔

"تم اسوقت بھلا میرا انتظار کاہے کو کرتی ہوگی۔ تم شاید اس خیال میں ہو کہ میں تمہاری رائے پر عمل کرونگا اور کرسمس سے پہلے والی شام تک تم سے نہ ملونگا۔ اے شارلٹ! تم سے یا تو آج ملونگا ورنہ پھر کبھی نہیں! اور اس دن شام کو یہ کاغذ تمہارے ہاتھ میں ہوگا اور اُسوقت تم اسے پڑھ کر کانپ اٹھوگی اور اُسے اپنے آنسوؤں سے تر کروگی۔ میں بیشک ـــ میں اپنا ارادہ مستحکم کرکے کتنا خوش ہوں!"

اس دوران میں شارلٹ کے دماغ کی حالت بھی ناگفتہ بہ ہوگئی تھی۔ ورتھر سے آخری گفتگو کے بعد اُسے محسوس ہوا کہ اُسنے ورتھر کی آمد روک کرکے نہ صرف اپنے دل کو تکلیف میں مبتلا کر رکھا ہے بلکہ ورتھر کو بھی اپنے ہجر میں سخت بیقرار کیا ہے۔ البرٹ سے باتوں باتوں میں اُس نے کہدیا تھا کہ ورتھر کرسمس سے پہلے والی شام سے قبل نہیں آئیگا۔ اس کے بعد فوراً البرٹ گھوڑے پر سوار ہوکر نواح میں ایک شخص سے ملنے گیا جس سے اُس کو کچھ ایسا کام تھا جسکی وجہ سے رات کو وہ گھر واپس نہ آسکا۔

شارلٹ تنہا بیٹھی تھی اور اُس کے گھر کے لوگوں میں سے کوئی اس کے پاس نہ تھا۔ تنہائی کی وجہ سے اُس نے اپنے کو بالکل اپنے خیالات کی رو میں ڈالدیا۔ اُسکی شادی ایک ایسے شخص سے ہوئی

تھی جسکی محبت اور وفاداری کا وہ دم بھرتی تھی اور دل سے اس کی گرویدہ تھی اور اُس کے شوہر میں بھی اسکی شادمانی اور مسرت کو پورا کرنے کا خاص ملکہ قدرت نے عطا کیا تھا۔ علاوہ بریں ورتھر بھی اُسے عزیز تھا۔ پہلے ہی دن کی ملاقات سے ان دونوں میں جذبات کی یکرنگی پیدا ہوگئی تھی جو پیہم ملاقات اور اتحاد سے شارلٹ کے دل پر نقش کالحجر بن گئی۔ اُس کی کچھ ایسی عادت پڑ گئی تھی کہ وہ اپنے ہر خیال اور جذبہ کا اظہار ضرور ورتھر سے کرتی اور ورتھر کی عدم موجودگی سے اسکی زندگی میں ایسا خلا نظر آتا جس کو بھرنا واقعی محال معلوم ہوتا تھا۔ وہ بڑے شوق سے اس بات کی خواہش کرتی کہ وہ ورتھر کو اپنا بھائی بنالے یا اُسکو اپنے کسی دوست سے شادی کرنے پر راضی کرلے یا پھر ورتھر اور البرٹ کے باہمی خلوص کو دوبارہ قائم کردے۔ ورتھر کی شادی کے خیال سے وہ اپنے تمام دوستوں کا ایک ایک کرکے جائزہ لیتی لیکن کچھ نہ کچھ قابل اعتراض بات سب میں پاتی جس سے وہ یہ طے نہ کرسکی کہ کس کی شادی ورتھر سے کردی جائے۔

ان خیالات کے ہجوم میں وہ اس بات کا گہرا مگر مبہم اثر ضرور قبول کرتی کہ اس کی حقیقی مگر ناقابل اظہار مرضی یہی تھی کہ وہ ورتھر کی ہوکر رہتی اور اس خیال سے اُس کے نازک دل پر ایک قسم کی ایسی چوٹ لگتی جو مسرت کی تمام اُمیدوں کا خون کرتی۔ اسی حیص بیص میں اسکی حالت ناگفتہ بہ ہوتی گئی یہانتک کہ اسکا احساس دماغی بھی معطل ہوگیا۔

شام کے وقت ساڑھے چھ بجے تھے کہ اُس نے سیڑھی پر ورتھر کے قدموں کی چاپ سنی اور فوراً ورتھر کی آواز پہچان گئی جو پوچھ رہا تھا کہ کیا شارلٹ موجود ہے۔ اسکی آمد پر شارلٹ کے دل میں خاصی دھڑکن شروع ہوگئی اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ دھڑکن پہلی بار ہوئی تھی۔ شارلٹ کے لئے اُس وقت اپنے جذبات کی پردہ پوشی کرنا سخت مشکل ہوگیا۔ جیسے ہی کہ ورتھر داخل ہوا شارلٹ گھبراہٹ میں بول اُٹھی کہ آخر تم نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا!"

ورتھر "میں نے زبان ہی کب دی تھی جو نہ آتا"

شارلٹ "کم سے کم میری خاطر سے تو میری بات مان لیتے۔ میں تم سے اپنے لئے اور تمھارے لئے دونوں کے لئے کہتی ہوں"

جو الفاظ اُس کے منہ سے نکلے یا جو کچھ اُس نے کہا اس کے مطالب سے وہ یکسر بے خبر تھی۔ اُس نے اپنے چند زنانہ دوستوں کو بلایا تاکہ ورتھر اور وہ تنہا نہ رہیں۔ ورتھر اپنے ساتھ کچھ کتابیں لایا جن کو اُس نے پیچے ڈالدیں اور چند دوسری کتابوں کے متعلق دریافت کرنے لگا۔ اتنے میں شارلٹ نے کہا کہ میری چند خواتین دوست آتی ہوں گی۔ مگر ورتھر کی یہی خواہش رہی کہ وہ لوگ نہ آئیں تو اچھا ہے کبھی شارلٹ کو یہ فکر ہوتی کہ ورتھر کی موجودگی میں نوکر بھی کسی پاس والے کمرہ میں ضرور موجود رہیں مگر پھر اُس کی رائے بدل جاتی۔ ورتھر اس دوران میں بڑی بے صبری کے ساتھ ٹہلتا رہا۔ اتنے میں شارلٹ پیانو کے پاس گئی اور ارادہ کرلیا کہ وہ پیانو کے پاس سے نہیں اُٹھے گی۔ مگر پھر کچھ سوچکر وہ آہستہ سے ورتھر کے پاس جاکر بیٹھ گئی جو سوفا پر اپنے معمولی انداز سے بیٹھا ہوا تھا۔

آہستہ سے بیٹھ کر شارلٹ نے ورتھر سے پوچھا کہ کیا تم پڑھنے کے لئے کچھ نہیں لائے ہو؟۔ ورتھر کے پاس کوئی چیز نہیں تھی۔ پھر بولی کہ میری میز کی دراز میں اوسیاں کے چند گیتوں کا خود تمہارا کیا ہوا ترجمہ موجود ہے۔ میں نے ابتک اس خیال سے اُسے نہیں دیکھا کہ خود تم پڑھکر اُسے سناؤ گے لیکن میرا یہ خیال پورا نہ ہوسکا۔ ورتھر یہ سنکر مسکرا دیا اور اپنا ترجمہ لینے کے لئے بڑھا۔ مگر اُسکو اُٹھاتے وقت اس کے بدن میں رعشہ طاری ہوگیا۔ پھر وہ بیٹھ گیا اور آبدیدہ ہوکر اسکو پڑھنے لگا۔

"او آنے والی رات کے چمکنے والے تارو! تمہاری روشنی مغرب کیطرف کتنی صاف ہے! تم اپنا سر بادلوں سے کتنی اچھی طرح نکالتے ہو اور پہاڑوں پر تمہارے قدم کتنے شاندار طریقہ سے پڑتے ہیں لیکن تم میدان میں آخر کیا چیز دیکھتے ہو؟ طوفانی ہوائیں ساکت ہیں مگر سیلاب کی دھیمی دھیمی آواز دور سے آرہی ہے۔ ممکن ہے پر شور موجیں پہاڑوں اور چٹانوں سے دور ٹکرا رہی ہوں۔ کیڑے مکوڑے شام کے وقت اپنے کمزور پروں سے پرواز میں مصروف ہیں اور ان کی بھنبھناہٹ میدان میں سنائی دیتی ہے۔ اے صاف شفاف تارو! تمہیں آخر کس چیز کی تلاش ہے؟ تم صرف مسکراتے ہو اور مسکرا کر کوچ کرجاتے ہو۔ تمہارے گرد سمندر کی لہریں خوش ہوکر آتی ہیں اور تمہارے بالوں کو دھوتی ہیں۔ اچھا او بے زبان کرنو! الوداع! اوسیاں کی روح کی روشنی کو بلند ہونے دو۔

"ہاں یہ روشنی بڑی تیزی کے ساتھ بلند ہو رہی ہے۔ میں اپنے کوچ کرنے والے دوستوں کو

دیکھ رہا ہوں۔ پچھلے سالوں کی طرح لورا پر انکا اچھا خاصا مجمع ہے۔ فنگل ایک کہر کی دیوار کی طرح آ رہا ہے اور اُس کے بہادر ساتھی اُس کے ہمراہ ہیں اور بڈھے شاعر یولن کو تو دیکھو۔ اور رائنو بھی کتنا شاندار معلوم ہوتا ہے اور آلپن کی آواز بھی کتنی پیاری ہے۔ منونا کی آواز میں کتنا درد ہے سیلما کی دعوت کے زمانہ سے ہم لوگ موسم بہار کے ان جھونکوں کی طرح جو پہاڑ پر چلتے ہیں اور سبزہ کی اوٹھی ہوئی گردنوں کو جھکا دیتے ہیں آپس میں لڑتے چلے آتے ہیں مگر میرے دوستو اب تم میں کتنا تغیر پیدا ہوگیا ہے۔

"منونا[1] اپنے حسن دل افروز کے ساتھ آئی تو ضرور مگر اسکا چہرہ غم سے نڈھال تھا اور آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ ہوا کے جھونکوں سے جو پہاڑ کی طرف سے اکثر آتے تھے اُسکے بال پریشان ہو جاتے جب اُس نے درد بھرے لہجہ میں اپنا نغمہ شروع کیا تو بہادروں کے دل بھی درد سے بھر آئے۔ اس نے سالگر[2] کی تاریک قبر بھی دیکھی تھی جو سفید چھاتی والی کولما[3] کا مسکن تھی۔ بیچاری کولما باوجود اپنی اچھی آواز کے پہاڑ پر تنہا رہ گئی۔ سالگر نے آنے کا وعدہ کیا تھا مگر رات ہوگئی۔ اچھا کولما جب تنہا پہاڑی پر بیٹھی تھی تو اُسوقت کی اُسکی گیت سنو۔

"رات ہوگئی ہے اور میں بے یار و مددگار اس طوفان زدہ پہاڑ پر تنہا ہوں۔ اُف پہاڑوں پر ہوا کے کتنے تیز جھونکے چل رہے ہیں۔ اور پانی چٹان سے ٹکرا کر کس زور شور سے گر رہا ہے۔ مگر افسوس مجھے ان آفتوں سے پناہ دینے کے لئے کوئی جھونپڑا تک نہیں۔ ہائے یہ آندھی اور طوفان اور میری یہ بیکسی! اے چاند پھر تو ہی بادلوں میں سے نکل! اور او رات کے تارو ذرا تم بھی اپنی صورت دکھاؤ اور مجھے اس اندھیری جگہ سے نکال کر اُس جگہ پہنچا دو جہاں میرا محبوب شکار کے بعد آرام کر رہا ہے وہاں اُسکی بغیر چلہ کی ہوئی کمان پڑی ہوگی اور اُس کے کتے اُس کے پاس دوڑ دھوپ کے بعد ہانپ رہے ہوں گے۔ لیکن ہائے میری گردش تقدیر نے مجھے اس چشمہ کے کنارے والے سبزہ پوش

---

[1] اوسیان منونا کا ذکر سیلما کی سالانہ دعوت کے سلسلہ میں کرتا ہے۔ اس تقریب کے موقع پر مشہور مشہور شعراء جمع ہوتے اور فنگل کے سامنے اپنے اشعار پڑھتے۔
[2] شمالی اسکاٹ لینڈ کی زبان میں سالگر شکاری کو کہتے ہیں۔
[3] اسی طرح کولما ایک خوبصورت اور نرم بالوں والی عورت کو کہتے ہیں۔

چٹان کے پاس بیٹھنے پر مجبور کر رکھا ہے۔ یا دو باراں کا چاروں طرف سے طوفان بپا ہے اور بادل کی گرج اور بجلی کی چمک سے میرا دل ہلا جاتا ہے۔ لیکن افسوس۔ میرے کان میرے محبوب کی آواز سے ناآشنا ہیں۔ میرے پیارے سالگرا آخر اتنی دیر کیوں کی؟ اور تم نے پہاڑی کے سردار سے ملنے کا وعدہ ہی کیوں کیا۔ یہاں چٹان بھی ہے، درخت بھی اور دریا کی پرشور موجیں بھی مگر ایک تم نہیں ہو حالانکہ تم نے آج کی رات آنے کا وعدہ کیا تھا۔ ہائے! میرے سالگر تم کہاں چلے گئے۔ تمہارے لئے تو میں ایسے شفیق باپ اور ایسے پروقار بھائی سے جدا ہو کر بھاگ جانے کے لئے تیار ہوں۔ ہماری نسل ہمیشہ ایک دوسرے کی دشمن رہی ہے مگر سالگر ہم لوگ دشمن نہیں ہیں۔"

"اے ہوا ذرا تھوڑی دیر کے لئے رک جا! اور اے چشمے اپنی روانی بند کر دے تاکہ میری آواز دور تک سنائی دے اور شاید میرا آوارہ و سرگرداں محبوب میری آواز سن لے۔ ارے سالگر! تو نہیں سنتا۔ تیری پیاری کولما تجھکو پکار رہی ہے۔ یہ درخت ہے اور یہ چٹان ہے اور میرے پیارے سالگر میں بھی یہاں موجود ہوں۔ پھر آنے میں اتنی دیر کیوں کر رہے ہو۔ دیکھو چاند بھی آہستہ آہستہ نکلنا شروع ہوا ہے جس سے وادی کا سیلاب چمک اٹھا۔ مگر پہاڑیاں تاریک معلوم ہوتی ہیں۔ اُف مجھے تو وہ کہیں نظر نہیں آتا۔ افسوس آج اُس کے کتے بھی اُس کے آنے کی خبر نہیں دیتے۔ تو کیا میں یہیں اکیلی بیٹھی رہوں ہائے.......

"ساحل پر میرے قریب یہ کون لوگ لیٹے ہیں؟ کیا وہ میرا محبوب اور میرا بھائی ہے؟ میرے دوستو آخر کچھ تو منہ سے بولو۔ کولما کو تم کچھ جواب کیوں نہیں دیتے۔ تمہاری کولما بالکل اکیلی ہے اور اُس کی روح میں اسوقت خوف نے اپنا مسکن بنا لیا ہے۔ افسوس وہ مردہ معلوم ہوتے ہیں۔ اور اُن کی تلواریں خون سے لال ہیں۔ ارے بھائی! بھائی! تو نے آخر میرے سالگر کو کیوں قتل کر ڈالا۔ اور اے سالگر تو نے میرے بھائی کو کیوں اجل کا راستہ دکھایا۔ تم دونوں مجھے عزیز تھے۔ اور آج میں تم دونوں کی کس طرح تعریف کروں؟ اور تم دونوں تو پہاڑی پر اچھی طرح رہتے تھے اور ہزاروں جوانمردوں کی صفوں کو چیر کر لڑنے کے لئے گھس جاتے تھے۔ ذرا کچھ تو بولو میرے عشق و محبت کے پروردہ کیا میری آواز تمہیں نہیں سنائی دیتی۔ مگر وہ دونوں اب شاید ہمیشہ کے لئے

خاموش ہیں اور اُن کے مٹی کے سینے بالکل سرد ہیں۔ اچھا اگر یہاں نہیں بولتے تو اے اُن کی روحو پہاڑی ہی پر سے جہاں ہوا چل رہی ہے کچھ آواز دو، کچھ جواب تو دو۔ میں تمہارے جواب سے بالکل نہ ڈروں گی۔ آخر تم کس دنیا میں جا کر مصروف آرام ہو گئے۔ ہائے اس پہاڑ کے کس غار میں میں ان مردوں کو پاؤں گی۔ فضا میں اسوقت کوئی ہلکی سی آواز بھی تو نہیں سنائی دیتی اور نہ اس طوفان میں کوئی جواب سنائی دیتا ہے۔

"میں اپنے رنج میں بیٹھی ہوں اور رو رو کر صبح کی منتظر ہوں۔ اے موت کے دوستو! اپنی قبر تو تیار کرو مگر دیکھو اسے اسوقت تک بند نہ کرنا جب تک کولما نہ پہنچ جائے۔ میری زندگی خواب کی طرح گذر رہی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تم لوگوں سے پیچھے کیوں رہوں۔ اس پر شور چشمہ کے پاس میں بھی اپنے دوستوں کے ساتھ آرام کروں گی۔ جب پہاڑیوں پر رات کا عمل ہوگا اور جب ہوا کے تیز جھونکے چلیں گے تو میری روح نکلکر اس طوفان میں کھڑی ہوگی اور اپنے دوستوں کی موت پر ماتم کرے گی۔ اس ماتم کو شکاری اپنی آرامگاہ سے سنے گا اور پھر میری آواز پر عاشق ہو جائیگا۔ اسواسطے کہ میرے دوستوں کے لئے میری آواز ہمیشہ شیریں ہوگی۔ کولما کے دوست کولما کو کتنے محبوب تھے؟"

"اے تورمان کی شرمیلی لڑکی مینونا! کولما کی یہی گیت تھی۔ کولما کے غم میں ہماری آنکھوں سے آنسو بہ نکلے اور ہماری روحیں بیچین ہو گئیں۔ یولن بھی اپنا بربط لئے ہوئے آیا اور آلپن کا گانا گانے لگا۔ آلپن کی آواز پیاری تھی مگر رائنو تو بالکل آتش نفس تھا۔ دونوں کی آواز بہر حال دور رس نہیں تھیں۔ اسواسطے سیلما کی آواز کے مقابلہ میں ان کی آواز مدھم معلوم ہوتی تھی یولن ایک روز بہادروں کی موت سے قبل شکار سے واپس آیا۔ اُس نے پہاڑی پر اُن لوگوں کی لڑائیوں کی خوفناک آوازیں سنی تھیں ان کے نعرے درد بھرے تھے جن میں مورار کے قتل کا نوحہ تھا جو پہلا فانی انسان تھا۔ مورار کی روح خنگل کی روح کی مانند اور اسکی تلوار اوسکر کی تلوار کی طرح تھی لیکن افسوس وہ لڑائی میں موت کے پنجہ ظلم سے نہ بچ سکا۔ اسکے باپ نے اُس پر بہت ماتم کیا اور اُسکی بہن کی آنکھیں بھی اُس کے غم میں اشکبار تھیں اور مینونا کا دل بھی غم سے دو نیم تھا۔

اور آنکھیں پرآب ہوکر ماتم کرتی تھیں۔ مگر مینونا یولن کا پردرد ماتم سنکر اُسی طرح خاموش ہوگئی جس طرح مغرب میں ڈوبنے والا چاند باراں کی آمد پہ بادلوں میں اپنا حسین چہرہ چھپا لیتا ہے۔

رائنو کا گیت طوفان باد و باراں گذر چکا اور دوپہر کے وقت فضا میں خاموشی ہے۔ آسمان پر بادل بھی تتر بتر ہیں۔ سبز مخملی پہاڑیوں پہ سورج چمک رہا ہے۔ پہاڑ سے جو پانی گر رہا ہے وہ پہاڑ کی مٹی کی وجہ سے لال ہوگیا ہے۔ اے اوپر سے گذرنے والے نالے! تیری آواز میں کتنی شیرینی ہے لیکن میں جو آواز سن رہا ہوں وہ اس سے شیریں تر ہے۔ یہ آلپن کی آواز ہے جو خود نغمہ کا پیکر درد ہے اور جو مرے ہوؤں کے ماتم میں مصروف ہے۔ زیادتی عمر کی وجہ سے اُسکی گردن جھک گئی ہے مگر اسکی ماتم کناں آنکھ سرخ ہے۔ او نغموں کے پالے ہوئے آلپن! آخر تو اس خاموش پہاڑی پر اکیلا کیوں گھوم رہا ہے اور جنگل میں ہوا کے جھونکوں کی طرح یا تنہا ساحل پر موجوں کی طرح کیوں مصروف ماتم ہے؟"

آلپن کے جوابی گیت "میرے آنسو صرف مُردوں کے غم میں بہتے ہیں اور میری آواز صرف اُن لوگوں کے لئے وقف الم ہے جو اس عالم فانی سے کوچ کر چکے ہیں۔ تم اس پہاڑی پہ اچھے خاصے بھلے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ اور اس وادی کے لوگوں میں خوبصورت بھی۔ لیکن افسوس! تم بھی مورار[1] کی طرح فنا ہو جاؤ گے اور اسوقت نوحہ گر تمہاری قبر کے سرھانے بیٹھکر ماتم کریگا۔ پھر نہ تو یہ پہاڑیاں تمہیں جانیں گی اور نہ تمہاری کمان تمہارے کمرہ میں کھلی ہوئی پڑی ہوگی۔

"او مورار! جس طرح جنگل میں ہرنی پھرتی ہے اسیطرح تو چست و چالاک تھا۔ تیری آتش فشانی الامان! لڑائی کے وقت تیرا غصہ تو بس طوفان تھا اور تیری تلوار صاعقہ بے پناہ تھی۔ تیری آواز پہاڑوں پہ پرشور نالوں کی طرح گرجتی تھی۔ تیرے توانا دست و بازو کے کتنے شکار ہوگئے اور کتنے تیرے غم و غصہ سے جل کر نذر اجل ہو گئے۔ لیکن لڑائی کے بعد تیری ابرؤوں پر کہیں بل نہیں ہوتا تھا اور تیرا چہرہ باراں کے بعد آفتاب کی طرح چمکتا تھا یا جس طرح رات کے سناٹے میں چاند چمکتا ہے۔ اور تیرا سینہ اُسوقت اتنا خاموش ہوتا تھا۔ جیسے کسی جھیل کی سطح ہوا کی غیر موجودگی میں خاموش رہتی ہے۔ مگر او مورار! آج

---

[1] شمالی اسکاٹ لینڈ کی زبان میں مورار ایک بڑے اور بہادر آدمی کو کہتے ہیں۔

تیرا مسکن بہت تنگ ہے اور تیری جائے سکونت بہت تاریک۔ اے وہ شخص جس کا کبھی ڈنکا بجتا تھا آج تیری قبر میرے تین قدموں کے نیچے ہے۔ چار کائی لگے ہوئے پتھر آج تیری تنہا یادگار ہیں۔ شکاری جب ادھر سے گذرتے ہیں تو ایک سوکھے درخت اور لانبی لانبی گھاسوں کو دیکھ کر جو ہوا سے ہلتی ہیں مورا ایسی عظیم الشان ہستی کی قبر کا پتہ چلاتے ہیں۔ مورا آج تو زیر خاک ہے اور تیرا سر نگوں ہے۔ آج نہ تو تیری ماں ہے اور نہ کوئی تیری معشوقہ جو تجھ پر اشک غم بہائے جس نے تجھکو پیدا کیا افسوس آج وہ بھی زیر خاک ہے۔ اُف یہ کیسا دن ہے کہ مور گلان کی لڑکی بھی آج زندہ نہیں۔"

"چھڑی ٹیکتا ہوا یہ کون آرہا ہے؟ یہ کون ہے جسکا سر عمر کی وجہ سے برف کی طرح سفید اور جسکی آنکھیں روتے روتے لال ہیں اور جو ہر قدم پر تھر تھراتا ہے۔ او مورا! یہ تیرا بڈھا باپ[۵۱] ہے جس کے سوائے تیرے اور کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اُس نے بار بار لڑائیوں میں تیری بہادری کے افسانے اور دشمنوں کو بھگانے کی اکثر داستانیں سنی ہیں۔ اس نے تیری شہرت اور اوج کا زمانہ بھی دیکھا ہے مگر اس کو تیرے اس آخری زخم کا حال کیوں معلوم نہیں؟ اے مورا کے باپ! رو اور ماتم کر مگر کہاں ہے مورا جو تیرا نوحہ اور ماتم سن سکے۔ سچ ہے مردوں کی نیند بہت گہری ہوتی ہے اور اُنکا تکیہ خاک کا تکیہ ہوتا ہے۔ اب وہ نہ تو تیری آواز سن سکتا ہے اور نہ تیرے جگانے سے جگ سکتا ہے۔ بھلا قبر کی رات میں کہاں صبح ہوتی ہے جو کوئی سونے والوں کو جگائے! اے سب سے جوانمرد اور بہادر آدمی اور اے لڑائیوں کے سورما! الوداع۔ تو نے کتنے میدان مارے مگر اب میدان تجھکو کہاں دیکھ سکے گا اور نہ اب جنگل کے تنگ و تاریک راستے تیری تلوار کی چمک سے منور ہونگے۔ افسوس تو نے کوئی لڑکا بھی نہیں چھوڑا۔ تیرا نام روشن کرنے والا بس یہی گیت ہے۔ آئندہ زمانہ کے لوگ تیرا نام سنیں گے اور اے مورا یہ بھی نہیں کہ تو مر گیا۔

در ماتم سب نے کیا مگر آرمین[۵۲] کا ماتم سب سے زیادہ پر درد تھا۔ وہ ابتک اپنے لڑکے کی موت یاد کر کے اشکبار ہو جاتا ہے جو اپنے عنفوان شباب میں مارا گیا۔ کارمور[۵۳] اس وقت منادی تکمل کے پاس تھا۔ اس

---

[۵۱] یہاں مراد تور ران سے ہے جو کا نڈھوین کا لڑکا اور جزیرہ ایوڈہ کا فرمانروا تھا۔ جزیرہ اسکاٹلینڈ کے جنوب پچھوٹے مغربی جزیروں میں کا ایک جزیرہ ہے

[۵۲] گورریا نیت جزیرہ کا حکمران تھا۔

[۵۳] شمالی اسکاٹلینڈ کی زبان میں ایک لانبے اور سیہ فام آدمی کو کہتے ہیں۔

نے پوچھا کہ آخر آرمین کو اتنا غم کیوں ہے اور اس ماتم کی کیا وجہ ہے؟ گیت کا تو یہ اثر ہوتا ہے کہ اسکی موسیقی سے دل نرم ہوجاتا ہے اور روح کو تسکین ہوتی ہے۔ گیت مثل اس کہر کے ہے جو جھیل سے اٹھ کر وادی پر چھا جاتا ہے اور تمام ہرے بھرے پھولوں پر شبنم چھڑک جاتا ہے لیکن جب سورج نکلتا ہے تو شبنم غائب ہوجاتی ہے۔ اے جزیرہ گورما کے سردار آرمین! آخر تم اتنے غمگیں کیوں ہو؟۔

"میں بیشک رنجیدہ ہوں مگر میرے رنج کا سبب معمولی نہیں ہے۔ کارمور تم کیا جانو۔ ہاں اگر تمہارا بھی کوئی لخت جگر جان سے ہاتھ دھوتا تو تم کو معلوم ہوتا اور تمہاری کوئی حسین لڑکی نے بھی داغ مفارقت نہیں دیا۔ تمہارا کولگر زندہ اور سلامت موجود ہے اور تمہاری حسین دوشیزہ انیرا بھی صحیح و سالم ہے تمہارے خاندان کی بیلیں برابر چڑھتی جاتی ہیں مگر آرمین اپنے خاندان کی آخری سانس ہے۔ اے ڈورا! تیرا بستر تاریک ہے اور تیری قبر کی نیند بہت گہری ہے اور تو کب اپنے گیتوں کو خوش لہجہ میں گاتی ہوئی اٹھے گی۔

"اے موسم خزاں کی ہوا تو چل اور تمام میدان اور جنگل میں چل۔ اے پہاڑ کے چشمو تم اپنی روانی دکھاؤ اور اے طوفان کے جھونکو میرے شاہ بلوط کے درختوں کو ہلا ڈالو۔ اے چاند تو بھی بادلوں میں آہستہ خرامی کر اور تھوڑی دیر کے بعد اپنا زرد چہرہ دکھایا کر اور مجھے اس رات کی یاد دلا جب میرے تمام بچے لڑائی میں کام آئے تھے اور جب حسین ڈورا ناکام رہی اور طاقتور ارنڈل مارا گیا۔ میری پیاری لڑکی ڈورا! تو اسی چاند کی طرح جو فورا[5] پر چمکتا ہے حسین تھی اور برف کی طرح گوری اور نسیم صبح کی طرح شیریں تھی۔ اور ارنڈل تیری کمان مضبوط تھی اور میدان جنگ میں تیرا بھالا تیز تھا اور دریا کی لہروں پر تیری نظر مثل کہر کے پڑتی تھی اور تیری ڈھال طوفانی بادلوں کی طرح سرخ تھی۔ ارمار جو لڑائی میں کافی شہرت حاصل کرچکا تھا آیا اور ڈورا کی محبت کا متمنی ہوا لیکن ڈورا کو انکار کئے ہوئے ابھی زیادہ زمانہ نہیں گذرا تھا اسلئے دوستوں کو ابھی امید تھی۔

"اوڈگل کا لڑکا ایراتھ بھی غم و غصہ سے ملول تھا۔ اس کا بھائی ارمار کے ہاتھ سے قتل ہوچکا تھا۔ وہ ایک ملاح کے بھیس میں آیا۔ لہروں پر اس کی چھوٹی ناؤ کیسی خوبصورت تھی۔ امتداد زمانہ نے اس کے بالوں میں سفیدی اور اس کی ابروؤں میں سکون پیدا کر دیا تھا۔ ڈورا کو مخاطب کر کے اس نے

---

[5] سرد جزیرہ

کہاکہ" اے دنیا کی حسین ترین عورت اور اے آرمین کی خوبصورت لڑکی! فلاں جزیرہ میں ایک چٹان پر جو یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے ایک درخت ہے جس کے سرخ پھل دور ہی سے معلوم ہوتے ہیں۔ اور اے ڈورا! وہاں امار تیرا منتظر ہے اور میں اُس کی معشوقہ کو یعنی تجھکو لیجانے کے لئے آیا ہوں۔ وہ امار کے پاس گئی لیکن وہاں پہنچکر ڈورا کے آواز دینے پر کسی نے جواب تک نہیں دیا۔ ہاں اُس کی صدائے بازگشت البتہ لوٹ کر آتی تھی۔ مکار ایریتھ ہنستا ہوا خشکی کی طرف بھاگا۔ اتنے میں ڈورا نے اپنی آواز بلند کرکے اپنے بھائی اور باپ کو پکارا۔ ارنڈل! آرمین! مگر ڈورا کی مدد کے لئے وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

"اُس کی آواز تمام سمندر میں گونجی۔ میرا لڑکا ارنڈل پہاڑی سے نیچے اُترا اور شکار کے پیچھے بدحواس دوڑا۔ اُس کے تیر اُس کے بغل میں لٹکے ہوئے تھے اور کمان ہاتھ میں تھی اور پیچھے پیچھے پانچ بھورے کتے تھے۔ اُس نے ایریتھ کو ساحل پر دیکھا اور اسکو پکڑ کر ایک شاہ بلوط کے درخت سے لگا کر ایک مضبوط چمڑے کے تسمہ سے باندھ دیا۔ وہ وہاں بندھا ہوا کراہ رہا ہے۔ میرا لڑکا ارنڈل کشتی پر سوار ہو کر ڈورا کو لانے کے لئے جاتا ہے۔ ارمار بھی غصہ میں بھرا ہوا آتا ہے اور تیر چلاتا ہے۔ اور وہ بدبخت تیرا میرے بچے ارنڈل! تیرے سینے میں گڑ جاتا ہے اور تو ایریتھ کے بدلے میں جان دیتا ہے۔ کشتی کا پتوار فوراً رک جاتا ہے اور وہ بیچارہ ارنڈل چٹان پر ایک آخری آہ سرد کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ پیاری ڈورا! جب تیرے پانوں کے پاس تیرے بھائی کا خون پڑا ہے تو پھر تیرے غم کا کون حال بیان کرے؟ افسوس تیری کشتی کے دو ٹکڑے ہو گئے اور ارمار سمندر میں تجھ کو نکالنے کے لئے یا خود جاں دینے کے لئے کودپڑتا ہے۔ اتنے میں پہاڑی پر سے ایک ایسی ہوا چلتی ہے جس سے موجوں کا زور شور اور بڑھ جاتا ہے اور جس سے وہ بیچارہ ایسا ڈوبا کہ پھر نہ اُبھرا۔

"اس طوفان زدہ چٹان پر تنہا میری لڑکی کی درد بھری آواز سنی گئی اور اس کی چیخ اور پکار کی صدا اکثر بلند ہوتی مگر اس کا بیچارہ باپ کیا کر سکتا تھا؟ تمام رات میں ساحل پر کھڑا رہا اور اُس کو چاند کی ہلکی روشنی میں دیکھتا رہا اور اس کی درد بھری آواز سنتا رہا۔ ہوا بہت تیزی سے چل رہی تھی اور پہاڑی پر بارش بھی بڑے زوروں سے ہو رہی تھی۔ صبح کے قبل اُس کی آواز میں کچھ کمزوری معلوم ہونے لگی اور جس طرح شام کی ہوا ہلکی ہو کر گھاس میں غائب ہو جاتی ہے اسی طرح اسکی آواز بھی غائب ہو گئی۔

رنج وغم کے ہاتھوں تباہ ہو کر اُس نے جان دیدی اور مجھ بدبخت کو تنہا چھوڑ گئی۔ اب میری تمام جنگی قوت ختم ہو گئی اور عورتوں میں میرا وقار چلا گیا۔ جب طوفان اُٹھتا ہے اور باد شمال موجوں کو سطح سے بلند کرتی ہے تو میں پرشور ساحل پر اس مہلک چٹان کو دیکھ کر اُس گھڑی کو یاد کرتا ہوں۔ اکثر پچھلے پہر کی چاندنی میں میں اپنے بچوں کی روحوں کو دیکھتا ہوں۔ کبھی صرف انکا آدھا دھڑ نظر آتا ہے اور وہ ماتمیانہ انداز میں چلتے ہیں "کیا تم مجھ سے نہیں بولو گی؟" مگر وہ روحیں اپنے باپ کا کچھ خیال نہیں کرتیں "

یہ سب داستان سنکر اپنے قلب حزیں کو تسکین دینے کے لئے جب شارلٹ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہ نکلے تو ورتھر نے بھی اپنا پڑھنا بند کر دیا اور کتاب پھینک دی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر خود بھی خوب رویا۔ شارلٹ کے ہاتھ میں رومال تھا اور وہ اپنا چہرہ اسی رومال پر رکھے ہوئے تھی۔ دونوں کے دلوں میں اُسوقت درد و کرب کی ٹیس بیحد تھی۔ دونوں نے ایسا محسوس کیا کہ اوسیاں کے بہادروں کا حال گویا اُن دونوں کی کتاب زندگی کا ایک ورق ہے۔ اس چیز سے دونوں بہت متاثر ہوئے اور انکا سیلاب اشک کسی طرح تھمتا ہی نہ تھا۔ روتے روتے ورتھر نے اپنا ماتھا شارلٹ کے بازو پر رکھ دیا۔ اس پر وہ کچھ کانپ سی گئی اور جانے کے لئے تیار ہو گئی مگر رنج اور ہمدردی دونوں کی سل اُسکی چھاتی پر اتنی گراں تھی کہ وہ ہل نہ سکی۔ بہرحال تھوڑی دیر میں اُس کی طبیعت سنبھلی اور سسکیاں لیتے ہوئے ورتھر سے نہایت درد بھرے لہجہ میں التجا کی کہ خدارا یہاں سے چلے جاؤ۔ ورتھر یہ سنکر کانپ اُٹھا اور قریب تھا کہ اُس پر یاس کی کیفیت طاری ہو اُس نے پھر کتاب اٹھا لی اور سسکیوں کے ساتھ پڑھنا شروع کیا:۔

"اے موسم بہار کے جھونکو! تم مجھ کو کیوں جگاتے ہو۔ تمہاری سنسناہٹ کتنی دلفریب ہے جو مجھ سے زبان حال سے کہتی ہے کہ دیکھ میں تجھکو آسمانی شبنم سے تروتازہ کرتی ہوں مگر میری نیستی کا وقت جلدی قریب آرہا ہے اس لئے کہ وہ طوفان جو میری پتیوں کو خشک کر دے گا نزدیک ہے۔ کل مسافر آئیگا اور ضرور آئیگا جس نے میرا حسن دیکھا ہے اور اُس کی آنکھیں میدان میں میری تلاش کرینگی مگر مجھ کو نہ پائیں گی "

ان تمام الفاظ کا اثر ورتھر پر کافی طور سے ہوا۔ نااُمیدی کے عالم میں اُس نے اپنے آپ کو شارلٹ کے قدموں پر ڈالدیا اور اس کا ہاتھ اپنی آنکھوں اور پیشانی پر ملتا رہا۔ ورتھر کے اس فعل سے شارلٹ کو

ورتھر کے مہلک منصوبہ کا کچھ کچھ گمان گذرا اور گمان گذرتے ہی اُسکے ہوش وحواس بجا نہیں رہے۔ اُسنے بھی اُسکا ہاتھ تھاما اور اپنے سینہ سے خوب دبا کر لگایا اور نہایت رحیمانہ انداز میں اسکی طرف اس طرح جھکی کہ اسکا گال ورتھر کے گال سے چھو گیا۔ اس وقت کچھ اور ہی کیفیت تھی۔ دونوں کی نظر دنیائے ہست وبود سے بالکل غافل ہوگئی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گردو پیش کی ساری چیزیں یک بیک غائب ہوگئیں۔ ورتھر نے اسکو اپنے بازؤوں سے خوب بھینچا اور جی بھر کر گلے لگایا اور اُس کے لبہائے نازک پر صدہا بوسہ شوق دیئے۔ آخر کار اپنے کو پھیر کر اُس نے دھیمی آواز سے "ورتھر۔ ورتھر" پکار کر اپنے کمزور ہاتھوں سے اُسکو علٰحدہ کردیا۔ پھر اُس نے پاکدامانی اور عفت کی مضبوط آواز میں "ورتھر" کو پکارا۔ ورتھر نے اسکے چھڑانے میں کوئی عذر بھی نہیں کیا بلکہ اپنے کو اسکے بازؤوں سے علٰحدہ کر کے اس کے قدموں پر گر پڑا۔ شارلٹ رنج کی حالت میں اٹھی اور غصہ اور محبت کے مشترکہ لہجہ میں بولی "ورتھر! یہ بس آخری بار ہے۔ اب ہماری تمہاری ملاقات پھر نہ ہوگی" پھر اپنے بدبخت عاشق پر ایک آخری دلربایانہ نظر ڈالکر وہ پاس والے کمرہ میں چلی گئی اور اندر سے تالا بند کرلیا۔ ورتھر نے اپنے ہاتھوں کو لپکایا مگر اسکو روکنے کی جرات نہیں ہوئی۔ وہ قریب آدھ گھنٹہ تک سوفا پر اپنا سر رکھے ہوئے فرش پر بیٹھا رہا یہانتک کہ جب اُس نے کسی کی آہٹ سنی تو اپنے ہوش وحواس میں آیا۔ اتنے میں نوکر کمرہ میں داخل ہوا اور ورتھر اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ نوکر کے جانے کے بعد پھر وہ شارلٹ کے دروازہ پر گیا اور آہستہ سے کہا۔ "شارلٹ۔ شارلٹ! بس ایک لفظ۔ اچھا ہمارا آخری سلام لے لو" شارلٹ نے کچھ جواب نہیں دیا۔ وہ رکا رہا اور جواب سننے کی کوشش کرتا اور التجائیں اور منتیں کرتا رہا۔ مگر وہاں سب کے جواب میں خاموشی تھی۔[1]

آخر کار اپنے کو نوچتا ہوا وہ باہر نکلا اور پکار کر کہا "شارلٹ سلام لو، یہ میرا آخری سلام ہے"۔ وہاں سے نکلکر ورتھر شہر پناہ کے دروازہ پر گیا اور محافظوں نے اُسے پہچان کر خاموشی سے جانے دیا۔ رات بہت تاریک اور طوفانی تھی۔ بارش سخت ہو رہی تھی اور برف بھی گر رہی تھی۔ ورتھر گیارہ بجے اپنے مکان پر پہونچا اور جیسے ہی وہ مکان کے اندر داخل ہوا نوکر نے یہ دیکھکر کہ ورتھر

---

[1] یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں + واں ایک خامشی مرے سب کے جواب میں۔

ننگے سر ہے اور ٹوپی غائب ہے کچھ کہا نہیں۔ پھر اُس نے اپنے آقا کے کپڑے اُتارے جو بھیگے ہوئے تھے۔ بعد کو اس کی ٹوپی ایک چٹان کے سرے پر پائی گئی جو وادی کے اوپر ہے۔ یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آئی کہ ورتھر اتنی اندھیری اور طوفانی رات میں بغیر اپنی جان کھوئے ہوئے کس طرح اتنی اونچی چوٹی پر پہنچ گیا۔ ورتھر سونے چلا گیا اور صبح کو دیر تک سوتا رہا جب دوسرے روز صبح کو اس نے نوکر سے قہوہ طلب کیا تو وہ کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ وہ شارلٹ کے خط میں کچھ اضافہ کر رہا تھا جس کو ہم یہاں درج کرتے ہیں۔

"آج آخری بار میں نے اپنی آنکھیں کھولی ہیں۔ شاید آخری بار! افسوس یہ آنکھیں اب آفتاب کی روشنی کبھی نہیں دیکھیں گی مگر اسوقت تو خود آفتاب ایک کالی گھٹا میں چھپا ہوا ہے۔ ہاں اے بزم قدرت کے بیٹھنے والو! ماتمی لباس پہن لو اس لئے کہ تمہارا پروردہ، تمہارا دوست، تمہارا عاشق اب اس دنیا سے کوچ کرنیوالا ہے، اسکا خاتمہ قریب ہے۔ جب میں اس فقرہ کو دہراتا ہوں کہ آج میرا آخری دن ہے تو شارلٹ! میرے اس خیال کی نظیر نہ ہونے کے باوجود مجھے اس وقت گویا ہر چیز خواب کی طرح معلوم ہوتی ہے۔ آخری دن! شارلٹ کوئی لفظ اس خیال کو خاطر خواہ ادا نہیں کرسکتا۔ آخری دن! —— آج میں اپنی پوری طاقت کے ساتھ کھڑا ہوں اور کل سرد اور بے جان ہو کر قبر کا کونا آباد کرونگا۔ موت! آخر موت کیا چیز ہے؟ ہم لوگ بات چیت میں اس حالت کا دھندلا سا عکس دیکھتے ہیں۔ میں نے بہتوں کو مرتے دیکھا ہے لیکن ہماری ہستی کا ظرف اتنا تنگ ہے کہ ہمکو اپنی ابتدا اور انتہا کی مطلق خبر نہیں ہوتی۔ اس وقت میں آپ اپنا ہوں۔ میری پیاری یا یوں کہو کہ میں تمہارا ہوں تمہارا! اور اس کے بعد ہم لوگ جدا ہو جائیں گے اور شاید ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائیں گے۔ نہیں، شارلٹ نہیں، ہم اور تم بھلا کس طرح فنا ہو سکتے ہیں؟ ہم لوگ تو زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ پھر فنا آخر کیا چیز ہے؟ میرے خیال میں یہ محض ایک بے معنی لفظ اور بیکار صدا ہے جسکا دماغ پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ مرنا اور قبر کے تنگ و تاریک گوشہ میں لٹایا جاتا! شارلٹ! تم سے ایک واقعہ بیان کروں۔ زمانہ عنفوان شباب کی میری ایک دوست تھی جو میرے لئے سب کچھ تھی۔ اُس نے انتقال کیا میں اُس کے جنازہ کے ساتھ ساتھ قبرستان تک گیا اور جنازہ قبر میں اتارتے

وقت میں قبر کے کنارے کھڑا تھا۔ جب جنازہ کی رسی اوپر کھینچ لی گئی اور مٹی گرائی جانے لگی یہانتک کہ ساری قبر بھر گئی تو میں بے اختیار ہوکر زمین پر گر پڑا۔ میرا دل اسوقت رنج و غم سے بہت بیقرار تھا اور صد پارہ ہوکر آنکھوں کی راہ بہہ رہا تھا لیکن مجھے اسکا مطلق پتہ نہ تھا کہ کیا ہوگیا اور مجھ پر کیا گذرنے والی ہے۔ موت! ــــ قبر! ــــ مجھے معاف کرو میں ان الفاظ کا مطلب سمجھنے سے بالکل قاصر ہوں۔ اُف کل کا دن تو میری زندگی کا آخری دن ہونا چاہئے تھا کیونکہ اے فرشتہ حسن! کل ہی میں نے زندگی میں پہلی بار اپنی روح میں ایک طرح کی خوشی محسوس کی۔ وہ مجھے پیار کرتی ہے، ارے وہ مجھے پیار کرتی ہے! اور اب تک وہ آگ جو تم نے اپنے لبوں کے ذریعہ سے میرے دل میں جلائی ہے بھڑک رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شادمانی اور مسرت کا کوئی نیا چشمہ اُبل پڑا ہے اور میری روح کو بہالے گیا ہے۔ اچھا معافی کا خواستگار۔

مجھے معلوم تھا کہ میں تمہیں عزیز ہوں اور میں نے تمہاری پہلی ہی ساحرانہ نظر میں اسکو محسوس کرلیا اور جب تم نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر دبایا تو اُس پر گویا مہر بھی ہوگئی لیکن جب میں موجود نہ ہوتا تھا یا جب میں البرٹ کو تمہارے پاس دیکھتا تھا تو میرے دل میں شکوک و شبہات کا کافی گذر ہوتا۔

کیا تم کو وہ پھول یاد ہیں جو تم نے مجھے بھیجے تھے؟ اور کیا وہ وقت بھی یاد ہے جب بھرے مجمع میں نہ تو تم بول سکتی تھیں اور نہ اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا سکتی تھیں؟ لو تم سے ایک بات کہتا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ میں ان پھولوں کے سامنے آدھی رات تک دو زانو بیٹھا رہا اور اُن کو تمہاری محبت کا ثبوت سمجھتا رہا لیکن وہ اثرات کم ہوتے گئے اور آخر کار بالکل مٹ گئے۔ دنیا کی ہر چیز فنا ہو جائے تو ہو جائے لیکن قیامت بھی میری محبت کے اس زندہ شعلہ کو نہیں بجھا سکتی جس کو تم نے اپنے لبوں سے کل بھڑکایا ہے اور جس سے اب میری ساری ہستی جل رہی ہے۔ وہ مجھے پیار کرتی ہے! اور یہ وہ ہاتھ ہے جو اس کی کمر کا حلقہ کر چکے ہیں اور یہ وہ ہونٹ ہیں جو اس کے لبوں سے ہم کنار ہو چکے ہیں۔ ارے وہ میری ہے ہاں شارلٹ۔ لوگ البرٹ کو تمہارا شوہر کہتے ہیں آخر اس کے کیا معنی ہیں؟ ممکن ہے وہ اس دنیا کے لئے تمہارا شوہر ہو اور اس لئے اس دنیا میں تم کو پیار کرنا اور تم کو اس کے بوس و کنار سے علیحدہ کرنا گناہ ہے۔ ہاں بیشک یہ جرم ہے اور میں اس کا خمیازہ بھگت رہا ہوں مگر میں نے اپنے جرم کی پوری لذت اٹھالی ہے۔ میں نے ایک ایسی خوشبو سونگھی ہے جس نے میری مشام جان کو معطر کرکے میری

روح کو از سرِ نو زندہ کر دیا۔ اُس گھڑی سے شارلٹ تم میری ہو ہاں شارلٹ تم میری ہو۔ میں تمہارے پاس آؤنگا۔ جب میں اپنے اور تمہارے دونوں کے خالق کے سامنے جاؤنگا تو اپنے تمام آلام و مصائب کی داستان دراز بیان کرونگا اور جب تک تم وہاں نہ پہونچوگی اسوقت تک اسکی بارگاہ سے مجھے تسکین عطا ہوتی رہے گی اور جب تم آؤگی تو تم سے دوڑ کر لپٹ جاؤنگا اور تم پر اپنا دعویٰ کرونگا اور پھر تمہارے آغوش میں ابدی طور پر زندگی گذارونگا۔ میں کوئی خواب نہیں دیکھ رہا ہوں اور نہ بڑبڑاتا ہوں بلکہ جیسے جیسے قبر کی خاک مجھ سے نزدیک ہوتی جاتی ہے میرے احساسات صاف اور واضح ہوتے جاتے ہیں۔ ہم لوگ یقیناً زندہ رہیں گے اور ضرور ایک دوسرے سے ملیں گے۔ ہم لوگ تمہاری والدہ مرحومہ سے بھی ملیں گے اور میں تو اُن کو اپنا سارا قصہ سناؤں گا تم اپنی ماں کی بالکل ہمشکل ہو۔"

۱۱ بجے کے قریب ورتھر نے اپنے نوکر سے پوچھا کہ کیا البرٹ واپس آگیا ہے؟ نوکر نے جواب دیا کہ ہاں آگیا ہے میں نے ابھی اُس کو گھوڑے پر جاتے دیکھا ہے۔ یہ سنکر ورتھر نے البرٹ کو ایک کھلی تحریر بھیجی:۔

"براہ مہربانی ایک سفر کے لئے اپنا پستول عنایت فرمائیے۔ والسلام"

گذشتہ رات کو شارلٹ بہت کم سوئی تھی۔ اس کے تمام احتمالات اس طرح اسکی آنکھوں کے سامنے آئے کہ وہ نہ تو پیش بینی کر کے ان کو روک سکتی تھی اور نہ اُن سے بچ سکتی تھی۔ اس کا خون اُس کی رگوں میں بڑی سوزش کے ساتھ گردش کر رہا تھا اور سیکڑوں ہزاروں درد بھرے احساسات نے اُس کے عفت مآب دل کو پارہ پارہ کر دیا تھا۔ معلوم نہیں کہ آیا یہ حالت نتیجہ تھی ورتھر کے جوش و خروش کے ساتھ ہم آغوش ہونے کا جس کو وہ برابر اپنے دل میں محسوس کرتی رہی یا ورتھر کی بیباکی اور خیرہ چشمی پر اس کو غصہ تھا یا ممکن ہے وہ اپنی موجودہ افسوسناک حالت کا موازنہ اپنی گذشتہ حالت سے کر رہی ہو جب وہ بالکل معصوم، متین اور خود اعتماد تھی۔ اس حالت میں بھلا کس طرح اپنے شوہر سے وہ اس روز کے واقعہ کی کیفیت بیان کرتی جس کو چھپانے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی مگر اس کے باوجود وہ اپنی مرضی سے ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ ان دونوں میں مدتوں سے اس قسم کے معاملہ پر کوئی بات چیت بھی نہیں ہوئی تھی اس وجہ سے وہ سوچتی تھی کہ اس خاموش فضا کو اس قسم کی گفتگو سے کیوں توڑا جائے کیونکہ وہ ڈرتی تھی کہ ورتھر کی آمد کے صرف ذکر سے کہیں البرٹ کو تکلیف نہ ہو اور میری صاف گوئی

سے اس تکلیف میں زیادتی نہ ہو جائے۔ بار بار اُس کو خیال ہوتا کہ کاش البرٹ میری اصلی سیرت سے آگاہ ہو جاتا اور میرا فیصلہ بغیر کسی تعصب و اکراہ کے کرتا مگر ان سب باتوں کے باوجود کیا اُس کو واقعی اس بات کی فکر تھی کہ البرٹ اُس کے رازہائے نہانی سے باخبر ہو جائے؟ پھر یہ خیال ہو سکتا ہے کہ کیا وہ ایسے شخص کو دھوکا دے سکتی ہے جو اسکے خیالات کا آئینہ رہا ہو اور جس سے اب تک کوئی بات چھپائی نہیں گئی۔ ان خیالات نے اس کے دماغ کو پریشان اور متفکر بنا دیا تھا مگر ساتھ ساتھ ورتھر کا بھی اُسکو خیال تھا جو ابد ہمیشہ کے لئے اُس سے جدا ہو گیا اور جس کو وہ کسی طرح اپنے عشق سے دست بردار نہ کر سکی حالانکہ اُس کو پورا علم تھا کہ ورتھر اگر مجھ سے جدا ہو گیا تو نامرادی اور مایوسی کے عالم میں اس کا دل ٹوٹ جائیگا۔

حال میں البرٹ اور شارلٹ کے درمیان ایک باطنی مغائرت پیدا ہو گئی تھی مگر شارلٹ کی سمجھ میں اس مغائرت کی وجہ اچھی طرح نہیں آتی تھی۔ اس سے اُس کو اور بھی سخت سوہان روح ہو گیا۔ پاس پڑوس کے اچھے اور نیک لوگوں نے بھی اس باہمی اختلاف کو بتانے میں پس و پیش کیا ہے اور اُن لوگوں کی شکایات پر پردہ ڈالا ہے بہرحال یہ معاملہ کچھ ایسا پیچیدہ ہوتے ہوتے نزاکت کی اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ سمجھوتہ ہونا ناممکن ہو گیا حالانکہ ابتدا میں محض معمولی گفتگو فریقین میں صفائی کر دینے کیلئے کافی تھی۔ اس کی ایک وجہ بھی ہے یعنی اگر دونوں کی خانگی زندگی میں اوّل روز سے اعتماد پیدا ہو جاتا اور محبت و دلجوئی نے یکساں طور پر دونوں کے دلوں میں گھر کر لیا ہوتا تو آج اس گئی گذری حالت میں بھی معاملہ ہاتھ سے نہ نکل جاتا۔ اس سلسلہ میں ایک نہایت عجیب و غریب واقعہ یاد رکھنے کے قابل ہے یعنی ورتھر کے خطوط سے اس بات کا اندازہ ضرور لگتا ہے کہ اس نے اس عالم آب و گل کو خیرباد کہنے کے خیال کو کبھی چھپایا نہیں اور اس کو اُس نے اکثر البرٹ کے سامنے پیش کر کے اس پر بحث بھی کی۔ البرٹ اور شارلٹ کے درمیان بھی اس مسئلہ پر بارہا گفتگو ہوئی۔ البرٹ اس قسم کے خیال کا اتنا مخالف تھا کہ وہ اکثر نہایت تیزی سے جو اسکی طبیعت میں بہت کم تھی ورتھر سے کہتا کہ مجھ کو تمہاری خودکشی کی دھمکی میں شک ہے۔ البرٹ نہ صرف ان باتوں پر قہقہہ لگاتا بلکہ شارلٹ کو بھی اس بے سروپا بات کے یقین کرنے سے روکتا۔ شارلٹ پر اسکا یہ اثر ہوا کہ جب اس پرالم مسئلہ کا کبھی اُس کو خیال ہوتا تو اُس کے دل میں اضطراب کے بجائے سکون ہوتا مگر اُس نے اپنے شوہر سے کبھی اسکا ذکر تک نہیں کیا کہ میرے دماغ میں ورتھر کیطرف سے البتہ شبہات اکثر پیدا ہوتے ہیں۔

البرٹ جب واپس آیا تو شارلٹ اُسے اسی پریشانی کی حالت میں ملی اور خود البرٹ کا مزاج بھی اس وقت درست نہیں تھا کیونکہ جس کام کے لئے وہ گیا تھا وہ پورا نہیں ہوا اور ابھی ابھی اس کو معلوم ہوا تھا کہ جس افسر سے اُس کا معاملہ ہے وہ نہایت تنک مزاج اور تنگ خیال ہے۔ غرض اس قسم کی بہت سی چیزیں ایسی ہوتی گئیں جس سے اُسکا مزاج برہم ہوتا گیا۔اس حالت میں اُس نے پوچھا کہ کیا میری عدم موجودگی میں کوئی بات ہوئی ہے۔شارلٹ کے منہ سے جلدی میں نکل گیا کہ ہاں، کل شام کو ورتھر آیا تھا۔ پھر البرٹ نے اپنے خطوط طلب کئے۔ اس پر شارلٹ بولی کہ کچھ پارسل بھی آئے ہیں جو تمہارے کمرہ میں رکھے ہوئے ہیں۔ البرٹ اپنے کمرہ میں چلا گیا اور شارلٹ تنہا رہ گئی۔

اس شخص کی موجودگی نے جس سے وہ محبت کرتی اور جس کی وہ عزت کرتی چلی آئی ہے آج اُس کے دل میں کچھ عجیب اثر پیدا کیا مگر اسکی فیاضی اُسکی مہربانی اور اُسکی محبت کی یاد سے اسکے برانگیختہ جذبات میں کچھ سکون پیدا ہوا اور ایک مخفی قوت نے اُسکو البرٹ کے پاس جانے کا رستہ بتایا۔ وہ جو کام کر رہی تھی اُس کو اٹھا البرٹ کے کمرہ میں اپنے پرانے طریقہ کے مطابق گئی۔ البرٹ وہاں اپنے خطوط کے کھولنے اور دیکھنے میں مشغول تھا معلوم ہوتا تھا کہ بعض خطوط کے مضامین تکلیف دہ ہیں چنانچہ شارلٹ نے اسکی صورت دیکھ کر کچھ سوالات بھی کئے جس کا البرٹ نے مختصر سا جواب دیا اور لکھنے بیٹھ گیا۔ اس طرح کئی گھنٹے گذر گئے۔ شارلٹ کی طبیعت میں افسردگی برابر بڑھتی گئی کیونکہ وہ اپنے شوہر سے کسی حال میں بھی اپنے دل کے اندوہ و غم کو ظاہر نہیں کر سکتی تھی۔ جتنا ہی وہ اپنے درد کی داستان کو چھپانے اور اپنے آنسوؤں کی روانی کو روکنے کی کوشش کرتی اتنا ہی اسکی طبیعت کا اضمحلال بڑھتا جاتا۔ اتنے میں ورتھر کے نوکر کی آمد سے تو اسکا اور بھی برا حال ہو گیا۔ نوکر نے البرٹ کو ایک تحریر دی جس کو اُس نے نہایت سرد مہری کے ساتھ اپنی بیوی کو دیدی اور کہا کہ نوکر کو پستول دیدو۔ پھر نوکر سے مخاطب ہو کر کہا کہ خدا کرے انکا سفر خوب کٹے۔ یہ الفاظ شارلٹ کے دل پر بجلی کی طرح گرے۔ وہ اپنی جگہ سے بدحواسی کی حالت میں اس طرح اٹھی کہ اسکو اسکا مطلق علم نہیں ہوا کہ وہ کیا کرنے والی ہے۔ وہ بے اختیار دیوار کی طرف گئی اور کانپتے ہوئے ہاتھ سے پستول اٹھایا اور آہستہ سے گرد پونچھی۔ اس کام میں شاید وہ کچھ دیر لگاتی لیکن البرٹ کی ایک تیز نظر نے جلدی کی درخواست کی۔ اُس نے وہ مہلک ہتھیار بغیر کچھ کہے ہوئے اس

کے حوالے کر دیا۔ جیسے ہی کہ نوکر روانہ ہوا اُس نے اپنا کام تہ کیا اور فوراً اپنے کمرہ میں چلی آئی۔ اس کے دل میں اس وقت نہایت مہیب خطرات کے پیش آنے کا خیال آرہا تھا۔ وہ کوئی نہ کوئی سانحہ عظیم کی منتظر تھی ایک دفعہ تو وہ اپنے شوہر کے پاس جانے اور اپنے کو اس کے قدموں پر گرا دینے کے بعد گذشتہ شام کے واقعات کو الف سے لیکر ی تک دہرانے پر تیار ہو گئی تاکہ اپنے قصور کا اعتراف اور اپنے خطرات کا اظہار کرے پھر اُس کے دل میں خیال آیا کہ نہیں، نہیں، ایسا فعل بالکل بیکار ہو گا کیونکہ میں البرٹ کو ورتھر سے جا کر ملنے پر راضی نہیں کر سکتی۔ کھانے کے بعد ایک دوست سے جو محض گفتگو کی خاطر روک لئے گئے تھے رسماً گفتگو ہوتی رہی۔ تمام گفتگو مجبوراً صرف اس لئے جاری رکھی گئی کہ صبح کے واقعات دماغ سے محو ہو جائیں۔

جب نوکر ورتھر کے پاس پستول لایا تو ورتھر اس کو دیکھ کر اور یہ سنکر کہ خود شارلٹ نے اس کو اپنے ہاتھ سے دیا ہے، باغ باغ ہو گیا۔ اُس نے روٹی کھائی اور تھوڑی سی شراب پی اور اپنے نوکر کو کھانا کھانے کے لئے بھیجنے کے بعد حسب ذیل تحریر لکھنے بیٹھ گیا۔

"پستول تمہارے ہاتھ میں رہ چکا ہے۔ تم نے اسکی گرد جھاڑی ہے میں اس پر سیکڑوں بلکہ ہزاروں بار بوسۂ شوق دیتا ہوں کیونکہ تم نے اُس کو اپنے ہاتھوں سے چھویا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قسمت میری رہبری کر رہی ہے اس لئے کہ تم نے مجھے یہ مہلک ہتھیار دیا ہے۔ میری تمنا تھی کہ تمہارے ہاتھ سے قتل ہوتا اور لو آج میری یہ تمنا پوری ہوتی نظر آتی ہے۔ میں نے نوکر سے پوچھا وہ کہتا ہے کہ تم جس وقت پستول دے رہی تھیں اُس وقت تم کانپ رہی تھیں مگر تم نے مجھے کوئی آخری سلام نہیں کہلوایا۔ اُف میں کتنا بد قسمت اور بدبخت ہوں کہ تم نے سلام تک نہیں کہلوایا۔ معلوم نہیں تم نے ایسے وقت ایسے شخص کے لئے جس نے تم کو ہمیشہ کے لئے اپنا کر لیا ہے، کیوں ایک لفظ نہیں گوارا کیا؟ ارے شارلٹ! صدیاں گذر جائیں گی مگر یہ نقش مٹائے نہ مٹے گا۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ تم ہرگز اُس شخص سے نفرت نہیں کر سکتیں جو تمہیں اپنی جان و دل سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔"

کھانے کے بعد اُس نے نوکر کو بلایا اور اُس سے سامان باندھنے کو کہا۔ چند کاغذات جلا ڈالے اور پھر کچھ قرض وغیرہ ادا کرنے باہر گیا اور پھر جلد ہی واپس آکر دوبارہ باوجود بارش کے چلا گیا اور کاؤنٹ کے باغیچہ میں کچھ دیر تک ٹہلتا رہا اور پھر کچھ دور تک دیہات کی سیر کو بھی گیا۔ شام کو گھر لوٹ کر آیا تو پھر یہ تحریر لکھنی شروع کر دی۔

"ولہلم میں نے آج آخری بار ان پہاڑوں، جنگلوں اور آسمانوں پر نظر ڈالی ہے۔ الوداع! اور اے میری پیاری ماں! مجھے معاف کر۔ ولہلم ذرا اسکو تسلی دیا کرنا۔ خدا تمہیں برکت دے میں نے اپنے تمام معاملات طے کرلئے ہیں۔ اچھا الوداع۔ ہم لوگ پھر کبھی ملیں گے اور تب مسرور و شادماں ہونگے۔

"البرٹ صاحب میں نے آپ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں۔ میں نے آپ کے خاندان کے سکون و راحت میں خلل ڈالا ہے اور آپ دونوں میں نااتفاقی کا بیج بویا ہے۔ الوداع۔ گھبرائیے نہیں میں خود اس بدبختی کو ختم کررہا ہوں۔ خدا کرے میری موت سے آپ کو راحت ملے۔ اگر آپ اس فرشتہ خصلت عورت کو خوش رکھیں گے تو میں خدا سے دعا کرونگا کہ وہ آپ کو اپنے سایہ عاطفت میں رکھے۔"

شام کے بقیہ اوقات میں وہ اپنے کاغذات درست کرتا رہا۔ بہتوں کو تو اُس نے پھاڑا اور جلایا اور بہتوں پر اُس نے مہر کی اور ولہلم کا پتہ لکھا۔ ان میں اُس کے چند پریشان خیالات اور مقولے درج تھے۔ بعضوں کو میں نے پڑھا بھی ہے۔ دس بجے اُس نے آگ جلانے اور ایک بوتل شراب لانے کا حکم دیا۔ پھر اُس نے نوکر کو رخصت کردیا۔ نوکر کا کمرہ اور خاندان کے دوسرے لوگوں کا کمرہ مکان کے دوسری طرف والے حصہ میں تھا۔ نوکر بغیر کپڑا اتارے جا کر لیٹ گیا تاکہ صبح کو سفر کے لئے چلنے میں جلدی ہو کیونکہ اُس کے مالک نے کہہ دیا تھا کہ ڈاک کے گھوڑے صبح کو چھ بجے سے پہلے آجائیں گے۔

" ۱۱ بج چکے ہیں۔ ہر طرف سناٹا اور میری روح میں سکون ہے۔ خدایا تیرا ہزار ہزار شکر ہے کہ آج تو نے میرے آخری لمحات زندگی میں مجھے ہمت و استقلال عطا کیا۔ میرے عزیز دوست! میں کھڑکی کے پاس جا کر اُن بادلوں کے درمیان جنکو ہوا کے تیز جھونکے اُڑائے لئے جارہے ہیں، اُن ستاروں کو دیکھ رہا ہوں جو اُس نیلی چھت پر چمک رہے ہیں۔ نہیں اے آسمانی ستارو! تم اس چھت سے نہیں گرو گے کیونکہ خدائے کارساز کا ہاتھ تم کو اور مجھکو دونوں کو اپنی جگہ پر سنبھالے ہوئے ہے میں نے آخری بار ساتوں ستاروں کے جھرمٹ کو بھی دیکھا جو میرے بہت محبوب ستارے ہیں کیونکہ اے شارلٹ! جب میں رات کے وقت تم سے رخصت ہو کر تمہارے دروازہ کے باہر قدم نکالتا تھا تو یہ ستارے

برابر میرے سر پر چمکتے تھے۔ میں نے اس وقت کتنی بار عالم شوق میں ان ستاروں کو دیکھا ہے اور ہاتھ پھیلا کر ان سے اپنی مسرتوں کو دیکھنے کی التجا کی ہے اور اب بھی۔ لیکن شارلٹ بتاؤ آخر وہ کونسی چیز ہے کہ جو تمہاری صورت میری آنکھوں کے سامنے آنے سے باز رکھتی ہے؟ کیا تم میرے دل میں نہیں سمائی ہو؟ اور کیا میں نے بچوں کی طرح ہر اس معمولی چیز کو عزیز ترین سمجھ کر جمع نہیں کیا جس کو تم نے اپنے دست نازنین سے چھو یا ہے۔ تمہارے رخ کی یکطرفہ تصویر جو مجھے بہت عزیز تھی آج تمہیں واپس کرتا ہوں اور تم سے التجا کرتا ہوں کہ اس کو محفوظ رکھنا۔ میں نے عالم شوق میں اس پر ہزاروں بوسے دیئے ہیں اور گھر سے جاتے اور گھر میں آتے وقت اُس نے ہزاروں بار میری روح کو خوش و خرم کیا ہے

"میں نے تمہارے والد صاحب سے درخواست کی ہے کہ وہ میری لاش کو محفوظ طریقہ پر میدان کیطرف قبرستان کے کونے میں دو نیبو کے درختوں کے نیچے دفن کروا دیں مجھے اُمید ہے کہ تمہارے والد میرے لئے اتنا کام ضرور کر دیں گے۔ تم بھی میری طرف سے درخواست کرنا۔ لیکن عابد و زاہد عیسائی شاید اس کو پسند نہ کریں کہ انکا جسم مجھ جیسے بدنصیب کے قریب دفن ہو۔ اگر ایسا نہ ہو سکے تو پھر مجھے دور کسی وادی میں یا کسی شاہراہ کے نزدیک دفن کرا دینا تاکہ جو پادری اور ان کے ہمنوا میری قبر کے پاس سے گذریں وہ اپنی جان کو دعا دیں اور جو اچھے اور نیک لوگ گذریں وہ میرے اوپر دو آنسو بہاتے جائیں۔

"شارلٹ ذرا دیکھو کہ میں اس زہر کا پیالہ پینے سے جو مجھے موت کے گھاٹ کے پار اُتار دیگا بالکل نہیں گھبراتا۔ یہ تمہارا ہی ہاتھ ہے جو مجھے وہ پیالہ دے رہا ہے مگر دیکھو میں مطلق نہیں جھجکتا۔ لو اب سارا قصہ ختم ہوا جاتا ہے اور میری زندگی کی ساری منتیں اور آرزوئیں آج پوری ہوئی جاتی ہیں یعنی میں اپنے استقلال کے ہاتھ سے موت کے بے پناہ دروازے کی کنڈی کھٹکھٹانے جاتا ہوں۔

"کیا اچھا ہوتا کہ میں صرف تم پر جان دینے کی مسرت کا لطف اُٹھاتا اور اگر یہ چیز مجھے ملتی تو میں خوشی سے اپنے کو تم پر تصدق کر دیتا۔ پھر اگر میں تمہارے بے قرار سینہ میں سکون اور مسرت پیدا کر سکتا تو میں بڑے استقلال اور خوشی کے ساتھ اپنی موت سے دو چار ہوتا لیکن یہ قسمت صرف چند مخصوص لوگوں کی ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کے لئے اپنا خون بہاتے ہیں اور اپنی موت سے اپنے دوستوں کی زندگی میں شادمانی و مسرت کا ہزار گونہ اضافہ کرتے ہیں۔ شارلٹ! میری تمنا ہے کہ میں جو کپڑا پہنے ہوئے ہوں اسی میں دفن کیا جاؤں۔

کیونکہ تم نے اس کو چھو کر میرے لئے کتنا متبرک بنا دیا ہے میں نے یہی خواہش تمہارے والدصاحب سے بھی کی ہے۔ میری روح میرے مزار پر گشت لگا رہی ہے۔ ہاں دیکھنا میرے جیبوں کی تلاشی نہ لیجائے۔ وہ لال فیتہ جو تم اُس روز اپنے سینہ پر لگائے ہوئے تھیں جب میں تم سے پہلے پہل ملا تھا اور تم بچوں کے ساتھ کھڑی ہوئی تھیں اب بچوں کو میری طرف سے بہت بہت پیار کرنا اور اُن سے میرا حال زار بیان کرنا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسوقت میں ان بچوں کو اپنے چاروں طرف کھیلتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ کتنے پیارے بچے ہیں! شارلٹ میں تمہارا کتنا گرویدہ تھا۔ اوّل ہی ملاقات کے بعد سے میرا تم سے علٰحدہ ہونا میری روح کیلئے گویا ایک عذاب ہو گیا تھا وہ فیتہ جسکو تم نے میری سالگرہ کی تقریب پر مجھے تحفتاً بھیجا تھا، میرے ساتھ دفن ہونا چاہئے۔ آج اِسوقت یہ تمام چیزیں کتنی آشفتہ و پریشان معلوم ہوتی ہیں لیکن اُسوقت مجھے اسکا ذرا سا بھی خیال نہ تھا کہ مجھے اس میدان میں بھی قدم رکھنا ہوگا لیکن میں اپنے اور تمہارے دونوں کے لئے سکون کی دعا کرتا ہوں۔

" پستول بھرا ہوا ہے۔ گھڑی میں ٹھیک ۱۲ بجے ہیں۔ آمین۔ شارلٹ! شارلٹ!! الوداع! الوداع!!"

ایک پڑوسی نے کچھ چمک دیکھی اور پستول چھوٹنے کی آواز بھی سنی لیکن چونکہ ہر طرف سناٹا تھا اس لئے اسکو کچھ خیال نہیں ہوا۔

صبح کو چھ بجے جب نوکر ورتھر کے کمرہ میں شمع لیکر گیا تو اُس نے اپنے آقا کو فرش زمین پر خون میں آلودہ پایا۔ پستول اس کے پاس پڑا تھا۔ نوکر نے ورتھر کو پکارا اور اس کو اپنے بازو کے سہارے سے اٹھایا بھی مگر کوئی جواب نہ ملا۔ گرمی حیات ابھی باقی تھی اور وہ دم توڑ رہا تھا نوکر فوراً ڈاکٹر کیلئے دوڑا ہوا گیا اور پھر البرٹ کو بھی بلانے گیا۔ شارلٹ نے گرجا میں گھنٹے کی آواز سنی[۱] اور سنتے ہی ایسا معلوم ہوا جیسے سانپ ڈس گیا ہے۔ اُسنے اپنے شوہر کو جگایا اور پھر دونوں اُٹھ بیٹھے۔ اتنے میں نوکر روتا ہوا آیا اور بھرائی ہوئی آواز میں اُس نے اس دلریش واقعہ کی اطلاع دی۔ شارلٹ بیہوش ہوکر البرٹ کے قدموں پر گر پڑی۔

جب ڈاکٹر ورتھر کے پاس آیا تو وہ فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اس کی نبض چل رہی تھی لیکن اسکے اعضا سرد ہو چکے تھے۔ گولی داہنی آنکھ کے اوپر سے پیشانی کو توڑ کر کھوپڑی میں گھس گئی تھی۔ داہنے بازو میں فوراً ایک فصد کھولی گئی اور کچھ خون بھی نکلا۔ ورتھر ابتک سانس لے رہا تھا۔ کرسی پر سے جو خون بہا تھا اُس سے معلوم ہوتا تھا کہ

[۱] موت کی خبر پر گرجا میں گھنٹے بجائے جاتے ہیں۔

اس نے یہ نازیبا حرکت کرسی پر بیٹھ کر کی ہے اور بعد کو فرش پر لڑکھڑا کر گر پڑا ہے۔ اسکو لوگوں نے کھڑکی کے پاس چت لیٹا ہوا پایا۔ وہ پوری پوشاک پہنے تھا۔

یہ خبر فوراً مکان میں پڑوس میں اور سارے قصبہ میں تیزی سے پھیل گئی اور پھیلتے ہی تمام کہرام مچ گیا۔ البرٹ بھی آگیا۔ ورتھر کو فرش سے اُٹھا کر چارپائی پر لٹا چکے تھے۔ اسکا سر بندھا تھا اور موت کی زردی اُسکے چہرہ پر آگئی تھی۔ اس کے اعضاء بے حس و حرکت ہوگئے تھے لیکن سانس کبھی تیز اور کبھی سست آتی جاتی تھی ہر لمحہ موت کا انتظار تھا۔ رات کو اس نے صرف شراب کا ایک گلاس پیا تھا۔ ایمیلا گیلوٹی اُس کی میز پر کھلی پڑی تھی۔

میں اب البرٹ کی پریشانی اور شارلٹ کے غم کا کچھ بھی ذکر نہ کرونگا۔

یہ خبر سنتے ہی بڈھا کارندہ فوراً مکان پر آیا اور نہایت رنج والم کی حالت میں روکر اپنے مرنے والے عزیز دوست سے ہم آغوش ہوا۔ اسکا بڑا لڑکا اسکے بعد فوراً آگیا۔ دونوں نہایت غم والم کی حالت میں اُسکی چارپائی کے پاس بیٹھ گئے اور اسکے ہاتھوں کو اور چہرہ کو بوسہ دینے لگے سب سے بڑا لڑکا جو ورتھر کا بڑا دوست تھا برابر اس وقت تک اُس کے منہ کے پاس اپنا منہ کئے ہوئے بیٹھا رہا جب تک کہ اسکی روح نے جسم کو نہیں چھوڑا۔ ورتھر کے مرنے کے بعد بھی اسکو بڑی مشکل سے وہاں سے ہٹایا گیا۔ ۱۲ بجے ورتھر کی روح نے اس قفس عنصری کو چھوڑ دیا۔ بڈھے کارندہ کی موجودگی اور دیگر احتیاط کی وجہ سے کوئی ہنگامہ وغیرہ نہیں ہوا۔

۱۱ بجے رات کو اُس نے ورتھر کی لاش اُسی جگہ دفن کرادی جہاں اُس نے خواہش ظاہر کی تھی۔

وہ بڈھا کارندہ اور اس کے لڑکے جنازہ کے ساتھ قبرستان تک گئے۔ البرٹ ساتھ نہ جاسکا شارلٹ کی زندگی بھی اب تب ہو رہی تھی۔ جنازہ مزدوروں نے قبرستان تک پہنچا دیا۔ کوئی پادری ساتھ نہیں تھا۔

باہتمام (حافظ) محمد سلیم سلیمی پریس نمبر ۳۹ سیحیی پور الہ آباد میں چھپی